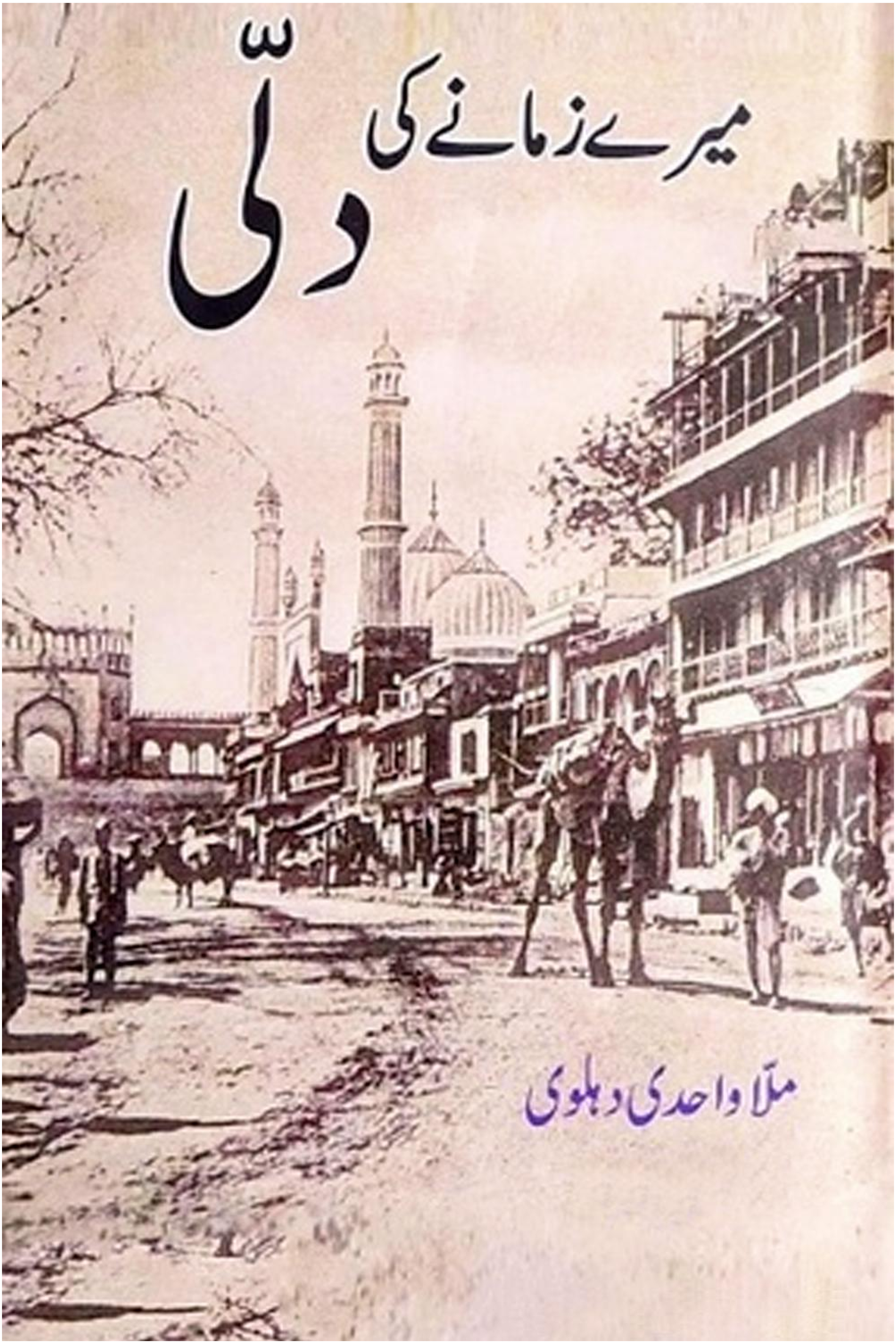

میرے زمانے کی دلّی

ملّا واحدی دہلوی

www.taemeernews.com

مُناجات

اے بہ درماندگی پناہ ہمہ کرم تُست عذرخواہ ہمہ
قطرہ ز آبِ رحمتِ تو بس است شُستن نامہ سیاہ ہمہ
بہ طفیل ہمہ قبولم کُن اے الٰہ من و الٰہ ہمہ
خسرو از تو پناہ می جوید
اے پناہ من و پناہ ہمہ

نعت

بلغ العلےٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلّوا علیہ و اٰلہٖ

www.taemeernews.com

مُصنّف کا تعارف

جناب الیاس احمد مجیبی مرحوم کے قلم سے

الیاس احمد مجیبی طرزِ خاص کے انشا پرداز تھے۔ بچّوں کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھتے رہتے تھے۔ بڑے وضعدار اور شریف طبیعت کے آدمی تھے۔ دلّی اور دلّی والوں سے انھیں والہانہ محبّت تھی۔ دو سال ہوئے اُنھوں نے ایک کتاب "دلّی جو ایک شہر تھا....." مُرتّب کرنی شروع کی تھی۔ یہ کتاب اگر چھپ جاتی تو ایک یادگار چیز ہوتی۔ مگر ہماری سب تمنائیں کب پوری ہوئی ہیں؟ پچھلے سال مجیبی صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ؏ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

یہ اُسی شائع ہونے والی کتاب کا ایک مضمون ہے ؏
ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے!

(ادارہ ساقی)

لہ یہ مضمون مئی [illegible] کے رسالہ ساقی، کراچی میں، یعنی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن (بقیہ نوٹ [illegible] پر

۱۹۲۶ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک گویا مسلسل اور مستقلاً دلّی شریف سے میرا واسطہ رہا۔ کتابی کاروباری بہت معمولی سے معاملے دو ایک بار جناب واحدی صاحب سے ہوا کئے، اور بس۔ معاملہ کرتے وقت محترم نے کوری کوری دو ٹوک باتیں کیں۔ جہاں تک یاد ہے وہ مجھے کھلیں نہیں۔ بس ہاتھ کے ہاتھ سودا ہوا اور مجھے پھر کچھ کہنے سننے کا موقع نہ رہا۔ ایک بار اُن کے رسالہ نظام المشائخ کے رسول نمبر پر جامعہ ملیہ دہلی کے ماہنامہ جامعہ میں ریویو لکھنے کا مجھ ناکارہ کو موقع ہاتھ لگا۔ وہ نمبر میری پسند یا میری گوں کی چیز تھی۔ قدرتاً ریویو اچھا ہی تھا جو واحدی صاحب کو پسند ہوا اور جب اُن کے علم میں ریویو نگار آیا تو کچھ نہ کچھ اُن کا التفات بڑھا بھی۔ مگر وہ اس درجہ کم آمیز بزرگ ہیں کہ زیادہ پینگ بڑھانے کا مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ بس معمولی یاد اللہ، سلام دُعا تک ہی بات رہ رہ گئی۔ اگرچہ جی بہت چاہتا رہا کہ اُن سے روابط بڑھتے اور اُن سے کچھ سیکھتا۔

میں واحدی صاحب سے غائبانہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اپنے حلقۂ احباب میں جب جب اور جو جو اُن کی باتیں سُنتا اُن سے لُطف حاصل کرتا بلکہ مستفید بھی

(صفحہ ۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) نکل جانے کے بعد شائع ہوا ہے۔ مولوی شاہد احمد صاحب بی۔اے، ایڈیٹر ساقی کی اجازت سے بطور تعارف مصنف یہاں درج کر رہا ہوں۔ اس کتاب کے لئے ایسے مضمون کی مجھے تلاش تھی۔

(موسیٰ رضا واحدی فرزند مُلّا واحدی، پبلشر کتاب ہذا۔)

www.taemeernews.com

کرتا۔ آں محترم کے بارے میں کچھ نہ کچھ ہمیشہ سُنتا ہی رہا۔ روایتوں کی صحت کا قرینہ تو ہے ہی، راویوں نے بھی یقیناً کذب نہ برتا ہوگا۔ پھر بھی امکان ہے کہ زیبِ داستاں کے طور پر کیا عجب کچھ نہ کچھ مبالغہ کیا گیا ہو، جو قرینِ قیاس ہے اور بشریت کا تقاضا۔ ہاں مگر ایک روایت اور راوی پر تو سولہ آنے بھروسا کیا ہی جا سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ کو جب علی گڑھ سے دلی میں لایا گیا، طلبہ کا مجھ سے گویا متصل لُٹے سیّا ملا اور یادش بخیر "مُرشد" (ڈاکٹر ذاکر حسین) مدظلہٗ اس کے داخلی کرتا دھرتا قرار پائے تو دلی کے بہتیرے عمائد سے اُن کے روابط بڑھے۔ ایک اُن میں سے واحدی صاحب رہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم دہلوی، اور ڈاکٹر مختار احمد مرحوم غازی پوری آگے پیچھے اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنّت کو جا سدھارے اور ذاکر صاحب تنہا رہ گئے۔ جامعہ اور جامعہ والوں پر وہ زمانہ بہت ہی کٹھن گزرا۔ ذاکر صاحب پر بوجھ زیادہ پڑ گیا۔ اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی۔ وہ تو قلندرانہ تیوروں سے یہی کہتے رہے کہ کبھی ہمیشہ جینے کا ٹھیکہ لیا ہے نگاڑی ہے، پھر بھی اُن کی صحت برقرار رکھنے کی تدابیر ہوا کیں اور اُن کے مقتدر حلقۂ احباب میں سبھی کو اُن سے کمال دلچسپی و ہمدردی تھی ہی۔ بات چھڑ جاتی تو ہر ایک دل سوزی کے ساتھ مشوروں کے پیش کرنے میں بخل نہ کرتا۔ واحدی صاحب نے بھی کچھ اپنے تجرباتِ حیات یا اپنے اسلوب و معمولاتِ زندگی کے مذکور میں ایک بات کچھ یوں فرمائی ذاکر صاحب سے۔ ڈاکٹر صاحب مجرّد معالجہ کی

اصل درحقیقت کچھ نہیں، وہ کتنا ہی اعلیٰ اور جچا تُلا کیوں نہ سہی۔ معمولات میں ضابطہ اختیار کرنا لازمی شرط ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ سن و سال میں آپ سے زیادہ ہونے کے باوجود میری صحت آپ کی صحت سے بہتر ہے، آپ کام کی دُھن میں یا مشاغل کی بہتات میں نظم رکھ نہیں پاتے اور میں نے سُنا ہے کہ شب میں سوتے بھی واجبی ہیں۔ یہ صحت کے لئے کوئی اچھی بات نہیں۔ آپ کو بتا ہی دوں کہ آج پورے چھتیس سال کے طویل عرصے میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں شب میں نو بجے لیٹ کر سو نہ گیا ہوں[1]۔ یہ ایک چھوٹی سی روایت ہے راوی اس کے خود ذاکر صاحب ہیں۔ مگر اسی ایک بات سے واحدی صاحب کی ضابطہ داری عیاں ہے، اور یہی سیرتِ واحدی کی مرکزی خصوصیت ہے جس سے سبق لینا چاہیے۔

جیسا کہ اس خریطۂ جواہر پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ ہر صاحبِ مضمون و مقالہ کے جامع تعارف کا بھی التزام کیا گیا ہے، جس سے کتاب کی تاریخی وقعت بھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ آپ جانیں واحدی صاحب کے سے "دلی کے روڑے" اب کہاں میسر آ سکتے ہیں۔ پھر وہ ادیب گر تو تھے ہی، خود بھی پرانے گھاگ ادیب ٹھہرے۔ دہلی مرحوم پر اُن کا مضمون حاصل کرنے کی سعی میں ناکام رہنا کتاب ہی کو ناقص و ناکام کرنا تھا۔ اُن کے مضامین تو ایک سے زیادہ اُن کی نوازش سے

---

[1] یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ (مجیبی)

www.taemeernews.com

مل گئے جس کے لئے آں محترم کا ممنون اور بہ دل شُکر گزار ہوں۔ مگر اُن پر لکھنے والا کوئی سمجھ میں نہ آیا۔ خود واحدی صاحب نے بھی مایوسانہ لب و لہجہ میں ایسا ہی کچھ ظاہر فرمایا۔ میں نے درخواست کی۔ پھر آپ ہی کچھ لکھ دیجئے۔ مگر اس میں انھیں تامل ہی رہا۔ بات یہ ہے واحدی صاحب کاروباری سلسلے میں اپنے منجن اور اپنی معجون اکسیر بدن کا تو برسوں سے اشتہار دیتے آرہے ہیں' لیکن حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ سے یارانے کے باوجود واحدی صاحب خود اپنا اشتہار دینے والی اسامی نہیں ہیں۔ اس خدمت کے لئے آں محترم نے مجھی کو حکم دیا کہ تم ہی لکھ لینا۔ جیسا کہ شروع میں ہی بتایا گیا ہے، میرا سابقہ اُن سے رہا نہیں۔ یوں چُپ سا ہوا۔ وہ بات پلٹ گئے اور اب مطلوبہ مضامین کے سوا انھوں نے چند دیگر نوادر میرے سامنے رکھ دیئے کہ لو ان کی مدد سے کچھ کر لینا۔ ہاں تمھاری حسب خواہش خاندانی حالات پر چند سطوریں بھی لکھ دوں گا۔ انھیں مناسب جگہ جوڑ لینا۔ مجھے چونکہ عجلت تھی اسی ترکیب سے کام چلا لینا مناسب جانا۔

یہ تو بہر حال معلوم ہے کہ آں محترم مدتوں سے لکھنے پڑھنے کا شغلہ رکھتے ہیں۔ نامی نامی اور گرامی قدر و مراتب ادیبوں سے اُن کا دوستانہ رہا۔ وقتاً فوقتاً اچھے اچھے متعدد ادیبوں نے اُن پر لکھا ہے جو خوش قسمتی سے محفوظ رہ گیا، وہی ذخیرہ ملخصاً پیش کیا جاتا ہے۔ میرا اس میں کچھ نہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ اور واحدی صاحب تو گویا ایک جان

www.taemeernews.com

دو قالب ٹھیرے۔ دونوں کا ربط اور تعلق بہت پرانا اور بہت گہرا ہے۔ اصل یہ ہے خواجہ صاحب پر لکھنا ایک واحدی صاحب کا حق رہا۔ یہ اور بات ہے کہ شاہد احمد صاحب (نبیرۂ علامہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم دہلوی) نے کاٹا تول چیز پیش کر دی۔ اسی طرح واحدی صاحب پر حضرت خواجہ صاحب کا نوشتہ سند ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آں مخدوم مدظلہٗ ہی کا ایک پارہ آپ بیتی حسن نظامی سے اخذ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

"۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۳ء تک سفر بمبئی سے واپس آ کر دہلی میں رہنے لگا۔ مضامین نویسی اور تجارت کتب کا مشغلہ جاری تھا۔ اسی زمانہ میں ایک صاحب کا خط میرے نام دہلی سے آیا، جس میں اُنھوں نے اپنی پھوپی کے خواب کی تعبیر پوچھی تھی۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ کچھ دن بعد ایک فیشن ایبل نوجوان چاندنی چوک میں محمد مرزا صاحب آئینہ فروش کی دوکان پر ملے اور معلوم ہوا کہ خط اُنھوں نے بھیجا تھا اور اُن کا نام محمد ارتضٰی ہے۔ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ عربک اسکول میں پڑھتے ہیں، ان کو اخبارات کا بہت شوق تھا۔ شعر بھی کہتے تھے اور خادم تخلص تھا۔

اس تعارف کے بعد ایک دن وہ مجھ کو بازار میں پھر ملے۔ میں نے دیکھا کچھ غمگین و افسردہ ہیں۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا انٹرنس کے امتحان میں فیل ہو گئے ہیں۔ میں نے اُن کو تسلی دی اور اپنے ہمراہ چلی قبر کی

www.taemeernews.com

قیام گاہ پرلے گیا جہاں مستقل طور سے رہتا تھا۔ مکان پر آکر میں نے ان سے زندگی کی کامیابی و ناکامی پر بہت سی باتیں کیں، اور ایسی ہمدردی کا اظہار کیا کہ وہ خوش ہو کر واپس گئے۔ اس کے بعد انھوں نے میرے پاس آنا جانا شروع کر دیا اور مجھ کو اُن کے محبتانہ برتاؤ سے ایک طرح کی وابستگی ہو گئی۔ اگر وہ نہ آتے تو میں راہ دیکھتا اور آجاتے تو خوش ہوتا۔ رفتہ رفتہ تعلقات اتنے بڑھے کہ وہ رسالہ نظام المشائخ جاری کرنے میں میرے شریک ہو گئے۔ یہ حلقۃ المشائخ قائم کرنے کا زمانہ تھا اور رسالہ اسی کے مقاصد کی اشاعت کے لئے نکالنا تجویز ہوا تھا۔

اہلیہ کے انتقال اور علالتِ شدید اور مخالفتوں کے طوفان کے بعد میں کلکتہ چلا گیا اور سید محمد ارتضیٰ صاحب نے میری عدم موجودگی میں رسالے کے کام کو سنبھالا۔ واپس آیا تو سید صاحب نے میرے ہاتھ پر بیعت کی اور واحدی لقب حاصل کیا۔ اس کے بعد سے دنیا نے ان کو محمد الواحدی کے نام سے یاد کرنا شروع کیا اور آج تک وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔

واحدی صاحب کے ساتھ مسلسل پانچ برس یکجائی رہی اور مجھ میں ان میں اتنی محبت ہو گئی جو میری ساری زندگی میں بے مثال مانی جائے گی۔ ایک جگہ رہنا، ایک جگہ کھانا، ایک سا پہننا، ایک ساتھ بازار میں نکلنا، غرض ایک جان دو قالب کی طرح میرا اُن کا یہ زمانہ بسر ہوا۔ میں ان کے بغیر

ایک ساعت بسر نہ کر سکتا تھا اور وہ مجھ بن ایک لمحہ نہ گزار سکتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب مجھ کو سفر مصر و شام و حجاز کے لئے جانا پڑا تو مجھ ہی پر یہ جدائی شاق نہ تھی بلکہ واحدی صاحب نے بھی یہ ایام ایسی افسردگی میں کاٹے کہ دیکھنے والوں کو ہم دونوں کی محبت پر تعجب ہوتا تھا۔

واحدی صاحب بہت مغلوب الغضب اور بہت ضدّی طبیعت کے تھے۔ مجھ میں ان میں باوجود پیری مُریدی کے تعلق اور سچّی بے انتہا محبت کے ناچاقی بھی ہوتی تھی اور وہ بعض اوقات اتنی بڑھ جاتی تھی کہ دوسرے کو اس رنجش کا حال معلوم ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ مانتا کہ ان دونوں میں پھر کبھی میل جول ہو سکے گا۔ مگر دوسرے ہی دن ہم دونوں پھر ویسے ہی ایک ہو جاتے تھے۔ میرے مزاج میں تلوّن اور عجوبہ پسندی اور مُلاقاتوں کا شوق حد سے زیادہ، اُن کے مزاج میں آدم بیزاری، ضد اور غصہ کی کچھ انتہا نہ تھی۔ مگر پانچ برس تک ان دو متضاد قوتوں نے یک جا مل کر کام ایسے ملاپ کی شان سے کیا کہ دوسرے حیران رہ گئے۔ یہی زمانہ میری اور اُن کی مستقل شہرت اور تجربے حاصل کرنے کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء بڑے لطف و اتحاد سے گزرے۔ ۱۹۱۱ء میں سفر مصر و شام سے واپس آیا تو پھر واحدی صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔

واحدی صاحب کی نسبت آجکل[1] میری یہ رائے ہے، جبکہ وہ رسالہ

---

[1] کتاب "آپ بیتی حسن نظامی" ۱۹۱۹ء میں چھپی تھی (مجیبی)

www.taemeernews.com

نظام المشائخ اور رسالہ خطیب و درویش پریس کے مالک اور ایک شاندار علمہ اور کرّ و فر کے دفتر کے افسر ہیں کہ اب اُن میں پہلے کی نسبت زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور قوم و ملک کے مسائل کو لیڈروں کی طرح سمجھتے ہیں اور دماغی قوّت اتنی اچھی ہے کہ ہر معاملے کے نیک و بد پر عاقلانہ دُور اندیشی کی صحیح رائے دیتے ہیں اور میری اُن کی خصوصیت پہلی جیسی تمام و کمال نہیں تو تمام دُنیا کے لوگوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ تاہم میں اُن کو کامیاب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ انھوں نے تجارت سیکھ لی ہے۔ میری انشا پردازی کی وراثت حاصل نہیں کی۔ جس کے ارمان کو میں قبر میں لے کر جاؤں گا۔[1]

میں ان کو محبت کے دوستوں میں سب سے اوّل سمجھتا ہوں اور اُن کے سوا اور کسی پر ناجائز خفا ہونے اور جلانے ستانے اور رنجیدہ کر کے خوش ہونے کی خواہش مجھ کو نہیں ہوتی۔ نہ اُن کے سوا مجھے کوئی اور نظر آتا ہے جو میرے ناز جا و بے جا اُٹھائے۔

دنیا کو ان کی زندگی ایک تاجر کی سی معلوم ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ حد سے بڑھ کر تاجر ہو گئے ہیں۔ پھر بھی جو شریف پروری اور وضعداری اور سچ بولنے کی عادت اُن میں ہے وہ بہت کم تاجروں میں پائی جائے گی۔ وہ بہت زیادہ سچے ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر مجھ سے بہت کم سچ بولتے ہیں اور میں خوش ہوں کہ جھوٹ کی تخصیص بھی انھوں نے میرے واسطے مخصوص

---

[1] اب واحدی صاحب متعدد ناول اور مقبول کتابوں کے مصنف ہیں۔　(مجتبیٰ)

www.taemeernews.com

کر دی ہے جس میں کوئی شریک نہیں ہے۔"

جناب نیاز فتحپوری نے کبھی حضرت عارف صاحب مرحوم و مغفور ہسوی پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا، مرحوم کے انتقال پر۔ قدرتاً اس میں واحدی صاحب کا ذکرِ خیر آنا ہی تھا، چنانچہ دو ایک فقرے اُس کے بھی زیر مطالعہ رہیں تو سیرت واحدی کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ نیاز صاحب یوں لکھتے ہیں:۔

" عارف ہسوی، مُلّا واحدی اور نیاز فتحپوری ان تینوں کا اجتماع و اتحاد اب سے تہائی صدی پہلے ایسا تو نہ تھا جسے ہم موجودہ سیاسی زبان میں "محوری طاقت" کہہ سکیں، لیکن اس میں ایک قسم کی عیسوی تثلیث ضرور پائی جاتی تھی جس میں روح القدس کی حیثیت واحدی صاحب کو حاصل تھی۔

۱۹۱۶ء کی بات ہے مولانا ابو الکلام آزاد جو جمیل میاں خلف حکیم اجمل خاں مرحوم کی شادی میں شرکت کے لئے دہلی تشریف لائے تھے، مجھے فتحپور سے طلب کرتے ہیں اور حکیم صاحب مرحوم سے تعارف کرا کے جمیل میاں اور خاندان شریفی کے چند اور بچوں کی تعلیم میرے سپرد کر دیتے ہیں۔ میں چیلوں کے کوچے میں واحدی صاحب کے مکان سے متصل قیام کرتا ہوں۔ ہر چند وہ اور میں ایک دوسرے سے اجنبی نہ تھے، لیکن اب قربتِ مکانی کی وجہ سے میرے اُن کے تعلقات آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوتے ہیں۔ میں اُن کے اخلاق کی بلندی و پاکیزگی سے روز بروز متاثر ہوتا جاتا ہوں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب واحدی صاحب

www.taemeernews.com

خطیب جاری کیا تھا اور میں ان کی تھوڑی بہت قلمی اعانت کرتا رہتا تھا۔

میں دلّی صرف دو سال رہا اور اس کے بعد بھوپال چلا گیا۔ لیکن اِن دو سال کے زمانہ میں عارف مرحوم میرے ہی پاس رہے۔ اور میرے ہر دُکھ درد میں سگے بھائی کی طرح شریک رہے۔ جب میں بھوپال جانے لگا تو مرحوم کو میں نے واحدی صاحب کے سُپرد کردیا۔ اس کے بعد دونوں کے تعلقات اتنے وسیع ہوگئے کہ آخر کار مرحوم کی آخری سانسیں بھی واحدی صاحب کے گھر میں نکلیں۔ واحدی صاحب ایسے مخلص و بااصول اور بے ریا انسان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

میں ان صحبتوں کو کبھی نہ بھولوں گا، جب دہلی کے کھنڈروں میں ہم سب جمع ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے تمام مکروہات زمانہ سے الگ ہوکر ملکوتی (گو ایک حد تک غیر معصوم) دُنیا میں پہنچ جاتے تھے۔

اس زمانے میں بیدل مرحوم بھی یہیں تھے اور ایک نیا سودا انھوں نے مول لے رکھا تھا۔ خلیقی بھی زندہ تھے اور اُن کی ادبی زندگی شباب پر آرہی تھی۔ ان سب کا اجتماع، آہ! اب کیا کہوں، کیا چیز تھا، اور اُس کی یاد کیسا نشتر چبھو جاتی ہے۔ اب نہ خلیقی زندہ ہیں نہ بیدل، نہ راشد الخیری موجود ہیں، نہ عارف۔ ان صحبتوں کی سوگوار یاد اب صرف واحدی کی ذات سے وابستہ ہے:

لہ شاہجہانپوری؛

www.taemeernews.com

دلی ہی کے ایک اور صاحب ہیں، امداد صابری، خاصے محنتی شخص ہیں اور مختلف بزرگوں سے اکتسابِ فیض کرتے رہے ہیں۔ ایک مدت سے لکھنے پڑھنے کا شغل رکھتے ہیں بہتیری کار آمد کتابوں، رسالوں کا ذخیرہ یا ریکارڈ جمع رکھتے ہیں اور اُن کی مدد سے انھوں نے بعض کام کی کتابیں مُرتب کر کر شائع کر دی ہیں۔ ان دنوں وہ دلی سے "نیا ہند" نام کا ایک ہفتہ وار نکالتے ہیں۔ نیا ہند میں بھی اکثر کار آمد چیزیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ کئی سال پہلے وہ کراچی آئے اور واپسی پر انھوں نے ایک چھوٹا سا پارہ مولانا راشدالخیری مرحوم پر لکھتے لکھتے شائع کیا۔ واحدی صاحب کا ماضی و حال سمجھنے میں اس سے بھی خاصی مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ اس کے بھی منتخب فقرے پیش کئے جاتے ہیں۔ صابری صاحب لکھتے ہیں؛

مسجد کالے خاں کے بالکل سامنے مُلّا واحدی صاحب کا مکان ہے۔ جس کے دروازے کی چوکھٹ کے اوپری حصے کے ایک کونے پر اب تک ارتضیٰ بلڈنگ کا چھوٹا سا بورڈ آویزاں ہے جس کو دیکھ کر واحدی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ واحدی صاحب کا اصل نام محمد ارتضیٰ ہے۔ واحدی صاحب کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ لقب شمس العلماء خواجہ حسن نظامی صاحب نے اس لئے دیا تھا کہ حضرت علیؓ کے خلیفہ اور چشتیہ خاندان کے پیشوا حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے جانشین کا نام عبدالواحد بن زید تھا۔ واحدی صاحب خواجہ

www.taemeernews.com

حسن نظامیؒ کے مرید ہوگئے تو خواجہ صاحب نے اپنا جانشین بنانے کے لئے حضرت خواجہ عبدالواحد کے نام پر واحدی لقب عطا کیا۔ اسی نام سے آپ آجتک مشہور ہیں۔ واحدی صاحب کے والد کا نام سیّد محمد مصطفٰیؒ تھا۔ آپ کے جدِ اعلیٰ کو شاہجہاں بادشاہ نے بخارا سے بلایا تھا۔ تاکہ جب بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوں تو غیر سیّد فیل بان کی پُشت بادشاہ کی طرف نہ ہو۔ آپ کے بُزرگ فیل بان کی طرف پُشت اور بادشاہ کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

آپ نے عربک اسکول میں مسٹر آصف علی کے ساتھ پڑھا تھا۔ پھر گھر پر فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نواب بدّھن کے مکان میں جو بازار چتلی قبر پر تھا اور جہاں خواجہ حسن نظامی صاحب رہتے تھے وہاں شام کو دہلی کے تعلیم یافتہ نوجوان ضیاء الدین برؔنی۔ خواجہ فضل احمد خاں شیدؔا۔ یعقوب بیگ نامی اور واحدی صاحب تقریروں کی مشق کے لئے جمع ہوتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں خواجہ صاحب کی شرکت میں واحدی صاحب نے ایک ماہانہ رسالہ نظام المشائخ جاری کیا جو صوفیوں اور درویشوں کے لئے مخصوص تھا۔ اور حلقہ نظام المشائخ کا آرگن تھا۔ یہ رسالہ دونوں حضرات نے باسٹھ باسٹھ روپے جمع کر کے ایک سو چوبیس روپے سے جاری کیا تھا۔ واحدی صاحب نے اسی زمانے میں حضرت خواجہ نظام الدین علیہ الرحمۃ کی لکھی ہوئی کتاب راحت القلوب کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ جس کو بزمِ فرید کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب بہت

www.taemeernews.com

مقبول ہوئی۔ اسی زمانے میں خواجہ صاحب نے جو نئے نئے ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرکے آئے تھے ایک کتاب شیخ سنوسی کا تذکرہ اور پیشینگوئیاں شائع کیں۔ اس کی دیکھا دیکھی واحدی صاحب نے جاماسپ نامے کی پیشینگوئیوں کا ترجمہ کرکے شائع کیا۔ یہ کتابیں بہت بکیں۔ سی، آئی، ڈی والے اس کے زیادہ خریدار بنے۔ واحدی صاحب نظام المشائخ جون ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں۔

"اسی زمانے میں لارڈ ہارڈنگ کے جلوس پر بم پھینکا گیا تھا۔ شیخ سنوسی اور جاماسپ نامے کی اشاعت کے چوتھے دن یہ واقعہ پیش آگیا۔" عبداللہ خاں سپرنٹنڈنٹ سی، آئی، ڈی نے مُلّا واحدی کو تو نہیں مگر خواجہ صاحب کو بلوایا، عبداللہ خاں خواجہ صاحب کو اپنے ہمراہ چاندنی چوک کی اس چھت پر لے گئے جہاں سے بم گرا تھا۔ عبداللہ صاحب نے خواجہ صاحب کو چند سوالات کرکے رخصت کردیا۔ عبداللہ کا آخری زمانہ واحدی صاحب کے بالکل برابر کے مکان میں گزرا وہ شریف اور خدا پرست آدمی تھے۔ خواجہ صاحب اور واحدی صاحب حقیقتاً اُن کی وجہ سے بچ گئے۔ مگر وہ ماسٹر امیر چند کو نہ بچا سکے۔ واحدی صاحب سے کئی بار اُنھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ امیر چند بے قصور تھا۔ قصور وار پانڈیچری میں ہے۔

واحدی صاحب نے اپنے ذاتی اخبار "انقلاب" "طبیب" اور "خطیب" نکالے جو بہت مقبول ہوئے۔ اس زمانے میں نظام المشائخ

www.taemeernews.com

بھی تنہا واحدی صاحب کی ملکیت ہو گیا تھا۔ آپ نے زندگی بھر کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا مگر آپ انگریزوں سے نہیں ملتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب دربار ہوا تو دہلی اور باہر کے مولوی اور مشائخ ہاتھیوں پر بیٹھ کر لال قلعہ کے نیچے ثمن برج کے سامنے بادشاہ کو سلام کرنے کے لئے گئے تھے اُس وقت نظام المشائخ میں خواجہ صاحب نے ایک مضمون "جُبّہ و عمامہ کی کورنش" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں اُن مولویوں کو اصحاب فیل سے تعبیر کیا گیا تھا۔ دہلی کے ابن الوقت قسم کے مُلّا مسٹر بیڈن ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے اور نظام المشائخ کے مضمون کی شکایت کی کہ اس سے علماء کی توہین ہوئی ہے، ان کو اصحاب فیل لکھا گیا ہے۔

بیڈن صاحب نے واحدی صاحب اور خواجہ صاحب کو بُلایا اور بہت خفا ہو کر کہا کیوں نہ آپ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ خواجہ صاحب نے کہا فیل ہاتھی کو کہتے ہیں، فیل نشین ہونا عزت کی بات ہے اس سے سرکار کے علماء کی بڑی عزت ہوئی ہے، اس میں توہین کی کوئی بات نہیں۔ بیڈن صاحب اس جواب سے مطمئن ہو گئے۔

۱۹۳۳ء میں واحدی صاحب کو مفتی کفایت اللہ صاحب اور خواجہ صاحب وغیرہ معززین شہر نے مجبور کیا کہ آپ جیسا آدمی میونسپل کمیٹی میں جا کر شہریوں کی خدمت کر سکتا ہے۔ چنانچہ واحدی صاحب کافی اصرار کے بعد تیار ہو گئے۔

آپ ۱۹۴۶ء تک مسلسل میونسپل کمشنر رہے۔ اسی دوران میں راشن کی تقسیم کا مسئلہ آیا تو چیف کمشنر دہلی سکو بمعہ نے خواجہ صاحب اور خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب او۔ بی۔ ای کے ذریعہ واحدی صاحب پر زور ڈلوایا کہ ایسے اہم کام کے لئے مُلّا واحدی جیسے ذمّہ دار آدمی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ واحدی صاحب نے اپنی طبیعت کے خلاف راشننگ افسر بننا منظور کیا۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے وقت واحدی صاحب اس عہدے پر تھے۔ یہ داستان عجیب و غریب ہے کہ واحدی صاحب پاکستان کیسے لیجائے گئے، اُن سے جب یہ سوال کیا جاتا ہے تو اُن پر ایک رقّت سی طاری ہو جاتی ہے۔ بہرحال وہ اپنے بچّوں کے ساتھ ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے، جہاں آجکل مقیم ہیں۔ آپ نے کراچی جاکر رسالہ فردوس نکالا مگر وہ اب جاری نہیں ہے۔ ہاں نظام المشائخ برابر نکال رہے ہیں۔

آجکل واحدی صاحب کی عمر ۶۰ سال[له] کی ہے۔ پنتالیس سال سے وہ اخبار نویسی کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی کسی کے خلاف دل آزار مضمون نہیں لکھا۔ وہ جس وضع کے پابند ہیں اُسی پر قایم ہیں۔ کراچی میں واحدی صاحب نے گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ میں کسی کا انتظار نہیں کر سکتا، انتظار سے مجھ کو بہت دُکھ ہوتا ہے۔

له ۱۹۵۲ء میں۔

www.taemeernews.com

اسی لئے میں پیدل چلتا ہوں کہ بس، ٹرام، موٹر، تانگے کا انتظار میرے بس کا نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ واحدی صاحب جو گورا قبرستان کے قریب رہتے ہیں اور خواجہ صاحب جب کراچی گئے تو جمشید کوارٹر میں مقیم ہوئے۔ جمشید کوارٹر گورا قبرستان سے کافی فاصلے پر ہے، مگر واحدی صاحب جب بھی خواجہ صاحب سے ملنے گئے سواری کا انتظار نہیں کیا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی کے گھر کی کُنڈی کھٹکھٹانا اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے میں کسی سے ملنے نہیں جاتا کہ کُنڈی کھٹکھٹانی پڑے گی۔ لوگ مجھے اس عادت کی وجہ سے مغرور سمجھتے ہیں۔

ہندوستان ہو یا پاکستان واحدی صاحب کی ایمانداری دیانتداری اور وضع داری کو ہر جگہ عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ حکومت اُن کی عزت کرتی ہے۔ اتوار کے روز اُن کی مجلس میں کراچی کے مہاجر اور غیر مہاجر سبھی آتے ہیں۔ اُن کی مجلس بڑی باوقار، سنجیدہ اور عالمانہ ہوتی ہے۔

واحدی صاحب کا دلی کا مکان ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ادیب، صوفی، عالم، لیڈر، سب کا یہ مرکز تھا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مفتی کفایت اللہ، گھنٹوں اس مکان میں بیٹھتے تھے۔

علامہ اقبال، گاندھی جی، مولانا محمد علی، شوکت علی مرحوم، اکبر الٰہ آبادی مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد بارہا اس مکان میں آئے۔ واحدی صاحب دہلی میں وہ شخص تھے جن پر ہر شخص اعتماد کرتا تھا۔ لیڈروں، ادیبوں،

www.taemeernews.com

ایڈیٹروں کے جھگڑے طے کرنے والے واحدی صاحب ہی تھے۔ ان کی بات کوئی ٹالے کسی کی مجال نہیں تھی۔ اس مکان میں نیاز فتحپوری، سردار دیوان سنگھ، مولانا عارف ہسوی وغیرہ نے جرنلزم کے ابتدائی ایام گزارے ہیں۔ یہی وہ گھر ہے جس کے رہنے والے واحدی نے مولانا محمد علی مرحوم اور خواجہ صاحب کے تنازعہ میں کسی کا پارٹ نہیں لیا۔ یہی وہ گھر ہے جس میں بیٹھ کر دلی میونسپل کمیٹی کے معاملات طے ہوتے تھے۔ اسی گھر میں آج پنجاب کے مظلوم، بے کس انسان بسے ہوئے ہیں۔ لیکن اس گھر کے پجاری (خواجہ حسن نظامی سمیت) اب بھی اپنی وضع کے مطابق عید کے روز اس گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر رو آتے ہیں اور عید منا لیتے ہیں۔"

دلی شریف کے علامہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا لائق و فائق پوتا شاہد احمد کسی بھی دلی والے پر جو کچھ لکھ دے وہ سند ہے۔ خدا وہ دن کم از کم مجھ سے بوڑھے دل والے کو تو نہ دکھلائے کہ شاہد صاحب، واحدی صاحب جیسے فنی کے تبرک پر اُن کے بعد قلم اُٹھائیں کہ اُس وقت واحدی صاحب جیسے سچے پاکیزہ اور مخلص بزرگ کی یاد اور انشائے شاہدی کا مطالعہ دونوں سے واسطہ پڑنا بڑا ہی غمناک موقع ہوگا۔ مطلب یہ کہ شاہد صاحب نے واحدی صاحب پر نہیں، حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہٗ پر لکھتے لکھتے ایک فقرہ واحدی صاحب پر بھی برسبیل تذکرہ لکھ دیا ہے کہ وہ بھی پڑھ رکھنے کی چیز ہے۔ لکھتے

www.taemeernews.com

ہیں:-

"دلّی کے خاص لوگوں میں سے ایک صاحب ہیں محمد ارتضیٰ جو کوچۂ چیلان میں رہتے تھے اور دلّی کے اچھے آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاصے متموّل آدمی تھے، جائداد بھی خاصی تھی۔ عربی، فارسی، اُردو سے شغف رکھتے تھے طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ ہم نے ہمیشہ اُن کے مُنہ پر چھوٹی سی ڈاڑھی دیکھی۔ ادب سے دلچسپی کی وجہ سے اُن کا تعلق گذشتہ ۴۰۔۵۰ سال پہلے کے تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا۔ اُن میں علامہ راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتحپوری جیسے جلیل القدر ادیب شامل تھے۔ ان صاحب خواجہ صاحب کا تعلق دوگونہ تھا، ایک تو ادب کا دوسرا مذہب کا۔ واحدی صاحب نے بھی کئی رسالے نکالے، جن میں "درویش" بہت مشہور ہوا۔ خواجہ صاحب نے جب حلقۂ مشائخ نواب بدھن کے کمرے پر قائم کیا تو "نظام المشائخ" کے نام سے محمد ارتضیٰ صاحب واحدی نے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اس پرچہ میں جہاں اہل سلوک کے مسائل پر مضامین ہوتے تھے وہاں اعلیٰ درجے کے ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ محمد ارتضیٰ صاحب کو خواجہ صاحب نے مُلّا واحدی کا خطاب دیا، جو اتنا مشہور ہوا کہ آج واحدی صاحب کو سب جانتے ہیں۔ اور محمد ارتضیٰ کو کوئی نہیں جانتا۔ واحدی صاحب کی دولت اور خواجہ صاحب کی عقل نے مل کر بہت بڑے بڑے ادبی کام کئے۔ واحدی صاحب سے

www.taemeernews.com

خواجہ صاحب کے تعلقات قیام پاکستان تک نہایت مخلصانہ رہے۔ پاکستان بننے کے بعد خواجہ صاحب تو دلی میں رہ گئے اور محمد ارتضیٰ صاحب کراچی چلے آئے۔ یہاں آکر جو حال اور سب مہاجروں کا ہوا وہی اُن کا بھی ہوا۔ رہنے کو گھر تک نہ ملا۔ آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو گئے۔ کاروبار کرنے کے لئے روپیہ نہیں۔ ملازمت کرنے کا دم نہیں، ستّرے بہتّرے ہو گئے۔ بڑھاپے کے عوارض نے الگ آگھیرا۔ کس بپرسی کے عالم میں دم بخود ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔"

آخر میں چند سطریں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی بھی پڑھ لیجے۔ واحدی صاحب نے جب ترک وطن کیا تو مولانا نے اپنے اخبار "صدق" میں لکھا تھا:-

"واحدی صاحب اُن چند لوگوں میں تھے کہ دلی عبارت ہی اُن کے دم سے تھی اور دلی کا تصور بغیر اُن کے نہیں کیا جا سکتا تھا۔"

مولانا دریابادی "مجموعہ مضامین واحدی" پڑھ کر تحریر فرماتے ہیں:-

"چاہا کہ سرسری اُلٹ پلٹ کر رکھ دوں، پھر کسی دن فرصت میں نکال کر ذرا اطمینان سے پڑھوں گا۔ یہ ورق گردانی جان کی مصیبت بن گئی۔ اب کتاب کو چھوڑتا ہوں تو کتاب مجھے نہیں چھوڑتی۔ ایک صفحہ، دو صفحے، تین صفحے، چار صفحے، لیجیے کہاں تک پڑھتا جاؤں گا اور صفحے گنتا جاؤں گا۔

www.taemeernews.com

لکھنے والے میں کشش آتی تو ہو، محض پڑھنے والا نہیں، ایک لکھنے والا اس کے حق میں محض پڑھنے والا بن کر رہ جائے۔ زبان صاف، سادہ، سلیس دلکش اور بڑی بات یہ کہ صحیح۔ واحدی صاحب آخر دلّی کے ہیں۔ باتیں جو کہی ہیں پُرمغز اور تکلف و تصنع سے بَری۔ اُن میں خلوص بھی ہے اور درد بھی۔ دنیا کے تجربے بھی ہیں اور آخرت کی یاد بھی۔ جیسے ایک ہلکے پھلکے پیمانے پر "گلستان" کا اُردو ایڈیشن سامنے ہے۔

واحدی صاحب خدا کو یاد رکھے ہوئے ہیں اور اپنے کو بھی نہیں بھولے ہیں۔ وہ خودی نہیں جو خدائی سے نعوذ باللہ ٹکر لیتی ہے۔ وہ خودشناسی جو خداشناسی کا زینہ اور اس کی جانب رہنما ہے۔ کاش آج حضرت اکبر الٰہ آبادی زندہ ہوتے، وہ اس سہل ممتنع کی اور اس بے ساختہ صنعت گری کی داد دیتے۔

واحدی صاحب کے خاندان کا تعلق دلّی (شاہجہاں آباد) سے اُس وقت سے ہے جب شاہجہاں نے دلّی آباد کی تھی۔ شاہ جہاں کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا بڑا پُرسکون زمانہ تھا، حکومت انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ شاہ جہاں سے پہلے کسی کو یہ نہیں سُوجھا تھا کہ میری طرف پُشت صرف سیّد کر سکتا ہے۔ اُس نے حاکم بخارا کو لکھا کہ تین صحیح النسب سید انتخاب کر کے بھیج دو۔ ایک کے پیچھے میں عیدین کی نماز پڑھوں گا۔ دوسرے

www.taemeernews.com

کے پیچھے جمعہ کی نماز۔ اور تیسرا میرے اور فیل بان کے درمیان بیٹھے گا میری طرف مُنہ اور فیل بان کی طرف پشت کر کے۔ پہلے دونوں امام کہلاتے تھے۔ تیسرے کے عُہدے کا نام پیش نشین تھا اور خطاب فوجدار خاں۔ فوجدار خاں کے سُپرد دو کام تھے، ایک فیل خانے کا اہتمام، دوسرے جب بادشاہ تخت سلطنت پر چڑھتے تھے تو فوجدار خاں تخت کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے اور بادشاہ سید کے ہاتھ کا سہارا لے کر تختِ انصاف پر قدم رکھتا تھا۔ پیش نشینی اور فوجدار خانی کا سلسلہ شاہجہاں کے وقت سے اکبر ثانی کے وقت تک چلتا رہا۔ آخری فوجدار میر نجف علی خاں تھے۔ واحدی صاحب میر نجف علی کی بڑی بیٹی کے پڑپوتے ہیں۔ اور حکیم سید شاہ محمّد ارزانیؒ کی اولاد۔ واحدی صاحب ذاتی طور پر دلّی سے اس قدر وابستہ رہے کہ وہ کہا کرتے ہیں کہ دلّی کے سوا میں نے کوئی جگہ دیکھی ہی نہیں تھی۔ اُن کے ساٹھ سال تک کی عمر کے کل سفروں کا ٹوٹل دو تین مہینے ہوگا جن میں کشمیر اور حیدرآباد دکن کے سفر بھی شامل ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ پہلا سفر حقیقتاً انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد کیا ہے۔

www.taemeernews.com

میرے زمانہ کی دِلّی

کا پہلا ایڈیشن پڑھ کر

ایڈیٹر صاحب معارف اعظم گڑھ کا خط

میرے زمانہ کی دلی پر ریویو تو خیر ہو گا ہی، لیکن یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ملتے ہی پوری پڑھ ڈالی۔ آپ نے بڑا کام کیا۔ آیندہ نسلیں اس کے ذریعہ دلی مرحوم کی تصویر دیکھ لیں گی۔

معین الدین۔ ۱۲ر جون ۱۹۵۳ء

ایڈیٹر صاحب رسالہ "نگار" لکھنو کا خط

واحدی صاحب! خوش رہیے۔ "میرے زمانہ کی دلی" نے کیا عرض کروں

www.taemeernews.com

میرا دل کتنا دُکھایا! اور اس دل دُکھانے کی داد میری اشکبار آنکھوں نے کس طرح دی۔

یہ کتاب آپ ہی لکھ سکتے تھے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اِس فریضہ کو میری زندگی ہی میں ادا کر دیا۔ اب دوسری جلد کے انتظار نے مجھے کچھ دن اور زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

دعا گو ——— نیاز (فتحپوری)

۲۸ جولائی ۱۹۵۸ء

———— ⁂ ————

اخبار ریاست دلی کی رائے:۔

اس ہفتہ مُلّا واحدی صاحب کی نئی تصنیف "میرے زمانہ کی دلی" شائع ہو گئی، جس کی سوا تین سو صفحات ضخامت ہے، اور جسے دہلی کے پچاس برس کی مستند تاریخ قرار دیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ اِس کے مصنف نے وہ تمام حالات لکھے ہیں جو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

یہ قابلِ قدر تصنیف دہلی والوں کے لئے تو دلچسپی کا ایک خزانہ ہے ہی اور اگر واحدی صاحب اسے نہ لکھتے تو دہلی کی پبلک ایک نعمت سے محروم رہتی، مگر زبان کے اعتبار سے بھی ہماری آیندہ نسلیں اس کتاب کو بطور سند پیش کریں گی۔ کیونکہ زبان کی اس پاکیزگی سے دہلی کے موجودہ لوگ محروم ہو چکے ہیں اور روز بروز ہوتے چلے جا رہے ہیں جو زبان واحدی صاحب یا آپ کے زمانے کے لوگ

www.taemeernews.com

لکھ سکتے ہیں اور جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہے۔

جو لوگ دہلی کی معاشرت۔ دہلی کے رسم و رواج۔ دہلی کی زبان۔ دہلی کے مشاہیر اور دہلی کے پچھلے پچاس برس کے حالات سے محروم رہنا نہیں چاہتے اُن کو اِس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور کی رائے:۔

مُلّا واحدی صاحب کی دو کتابیں "حیات سرورِ کائنات (صلعم)" اور "سوانح عمری خواجہ حسن نظامی" پر پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ واحدی صاحب اپنے سادہ مگر دل نشین اندازِ تحریر کے باعث اُردو کے ادیبوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ دلّی کی کہانی اور واحدی صاحب کی زبانی، بس یوں سمجھیئے کہ لیلیٰ کی داستان مجنوں بیان کر رہا ہے۔ دلّی سے واحدی صاحب کو وہی عشق ہے جو قیس عامری کو لیلےٰ سے تھا۔ بڑی شگفتہ، دل چسپ اور پُر اثر کتاب ہے۔ اسے پڑھتے وقت آپ ایسا محسوس کریں گے گویا دلّی کی گلیوں میں پھر رہے ہیں۔

رسالہ مولوی دہلی کی رائے:۔

مُلّا واحدی صاحب دہلی کے اُس قدیم خاندان کے فرد ہیں جو شاہجہان کی دلّی آباد ہونے کے وقت یہاں بادشاہ کے بلاوے پر آیا تھا اور آپ کے

www.taemeernews.com

خاندان ہیں وہ تمام آثار تہذیب مسلسل اور متواتر موجود رہے جو قدیم مسلمانوں کا امتیاز مانے جاتے ہیں۔

اب سے پچاس برس پہلے تک دہلی میں وہ قدیم تہذیبی روایات موجود تھیں جو آج تو شاید فسانۂ ماضی کا عنوان بنتے ہوئے بھی شرمائیں۔

واحدی صاحب نے اسی دہلی کے ہر نوع اور ہر طبقہ کے تین سو افراد سے روشناس کرایا ہے۔ جن میں کا ہر فرد کوئی نہ کوئی امتیاز رکھتا تھا۔ ان میں حُسنا حلال خور سے لے کر بڑے بڑے کردہتی کا حال ہے۔ جو اپنی اپنی لباط کے موافق اسی تہذیب میں بندھے ہوئے تھے جو آج کم سے کم دہلی میں تو عنقا ہے۔

یہ کتاب واحدی صاحب نے شروع اپنی جلاوطنی سے کی ہے۔ مگر جلاوطنی کے حالات بہت ہی کم ہیں اور بڑے سمو کر لکھے ہیں۔ اور لکھا ہے پھر نہ جانے وطن پہ کیا گذری: آہ! یہ کون بتلائے۔ جو دلی کے بہترین لکھنے والے تھے۔ وہ تو پہلے ہی بلا میں پار ہو لے۔ اب لے دے کے دلی والوں میں حضرت مولانا احمد سعید رہ گئے ہیں جو شیریں مقال بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد پیچھے مُڑ کر دیکھنا ہے کہ ماضی قریب میں ہم کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فرشتے تھے اب درندے ہو گئے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہندو پاک کی ہر لائبریری میں جگہ پائے اور

www.taemeernews.com

واحدی صاحب ہندوستان میں کسی صاحب کو اجازت دیدیں کہ وہ ہندی میں چھاپ کر بھارت کی ہر لائبریری کی زینت بنادے۔

رسالہ "کتابی دُنیا" کراچی کی رائے:۔

واحدی صاحب نے اس کتاب میں گزشتہ پچاس سال کے دلّی والوں کے حالات لکھے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ یہ سب لوگ وہ ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے اپنے دور میں ممتاز تھے۔ درحقیقت یہ لوگ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ان سب میں باہمی میل تھا اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ تھے۔

مصنّف نے جس درد، محبّت اور سوز سے دلّی کے حالات لکھے ہیں وہ پڑھنے والے کے دل میں گونج پیدا کئے بغیر نہ رہیں گے۔ جس دلّی کا انھوں نے ماتم کیا ہے وہ استحقاق رکھتی تھی کہ اس کا ماتم کیا جائے۔ اقبالؔ نے سسلی کا ماتم کیا ہے اس لئے کہ وہاں سے عرب تہذیب مٹ گئی۔ واحدی صاحب نے دلّی کی تہذیب مٹنے کا ماتم کیا ہے۔ جو لوگ دلّی والے نہیں ہیں وہ بھی اس کتاب کو نہایت درجہ دلچسپ اور سبق آموز پائیں گے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں اتنے اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ بعض باتیں چھوٹے بڑے آدمیوں کی ایسی آگئی ہیں کہ ضرورت ہے کہ انھیں اپنا لیا جائے۔ وہ باتیں اور کسی کتاب میں

نہ ملیں گی۔ اس زمانے کے کباب سنگوں کا جو کیریکٹر پیش کیا گیا ہے وہ اب ٹبروں میں بھی باقی نہیں رہا۔

کتاب ساری کی ساری صحیح بلکہ صحیح ترین واقعات پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستان ہے اور اس لئے ہر اس شخص کو جسے آثار قدیمہ سے کچھ دلچسپی ہے اس کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ خاص طور پر دلی والوں کا فرض ہے کہ وہ اسے پڑھیں اور اسے پڑھ کر اپنے میں وہ بلندی پیدا کریں جو ان کے آباؤ اجداد میں تھی اور جن کے ذکر سے ساری کتاب بھری پڑی ہے۔

سرسید کی "آثار الصنادید" کی طرح یہ کتاب بھی آثار الصنادید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اوّل الذکر ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلّی (عمارات) سے متعلق ہے اور مؤخر الذکر ۱۹۴۷ء سے پہلے کی دلّی (اشخاص) کے حالات پر مشتمل ہے۔

اخبار سیاست جدید کانپور کی رائے:۔

یہ کتاب مُلّا واحدی کی سلیس دلنشین انشا کا شاہکار ہے۔ ۱۹۴۷ء کے دہلی کے ہنگاموں کے حالات بڑے مؤثر انداز میں لکھے ہیں، جن کو پڑھ کر حساس دل اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل کی دلّی کے تمدن و معاشرت کی بہترین عکس کشی کی گئی ہے۔ علماء، فضلا اور اونچے سیاسی لیڈروں اور تاجروں سے لے کر عوام کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے معمولی کباب فروشوں خوانچہ والوں تک کا

www.taemeernews.com

دل آویز تذکرہ اس میں موجود ہے۔ مُلّا واحدی اور خواجہ حسن نظامی مرحوم میں بہت قریبی تعلقات رہے تھے اس لئے خواجہ صاحب کا تذکرہ کثرت سے آیا ہے۔ دہلی سے نکلنے والے رسائل واخبارات اور دہلی کے ارباب صحافت کا تذکرہ خصوصیت سے دل چسپ اور پُراز معلومات ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے مخصوص رنگ میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز دور کی دلّی کے حالات "غدر دہلی کے افسانے" کے نام سے دس گیارہ حصّوں میں شائع کئے تھے اور وہ ایک زمانہ میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ مُلّا واحدی کی یہ کتاب ۱۹۴۷ء کی دلّی کی عکاسی بہترین انداز میں کر رہی ہے اور اس موضوع پر اردو میں غالباً پہلی کتاب ہے۔ دہلی کے مشاہیر میں رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ۔ حکیم اجمل خانؒ۔ ڈاکٹر انصاری۔ مسٹر آصف علی۔ مولانا راشد الخیری، مولوی سید احمد دہلوی۔ (مؤلف فرہنگ آصفیہ) حکیم عبدالوہاب انصاری المعروف بہ حکیم نابینا۔ مولانا احمد سعید۔ مفتی کفایت اللہ۔ وغیرہ کے حالات خاص طور سے قابل مطالعہ ہیں۔

رسالہ فیض الاسلام، راولپنڈی کی رائے:۔

حکایت ہائے عہدِ دوستی را کردہ ام از بر چو ہندوئے کہ بعد از سوختن ہیزم نگہ دارد

یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے پہلے کی جیتی جاگتی، رستی بستی اور چلتی پھرتی دلّی کی

www.taemeernews.com

داستان ہے جسے مُلّا واحدی صاحب نے روزمرہ کی سادہ وسلیس زبان اور عبرت انگیز انداز میں مرتب کیا ہے۔ یہ دلی کے شرفاء، اُدباء، اور علماء و شعرا کی صحبتوں کے تذکرے، بازاروں کی چہل پہل، گلی کوچوں کی رونق، اور وضع دار معاشرت کے رسم ورواج کا ایسا بیان ہے جس میں وقایع نگاری کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کا دھیما دھیما انداز، عجیب کیفیت پیدا کئے ہوئے ہے۔ قاری کتاب پڑھتے وقت دلی کی اُن تمام شخصیتوں کو اپنے پاس محسوس کرتا ہے جن کی لفظی تصویریں محترم مصنف نے کھینچی ہیں۔ یہ شخصیتیں ادبی بھی ہیں، سیاسی بھی، اور دینی ومذہبی بھی۔ ان میں بین الاقوامی شہرت کے اکابر بھی ہیں اور غیر منقسم ہندوستان کی معروف ہستیاں بھی، اور دلی کے عوام بھی اپنی عوامی خصوصیات کے ساتھ پوری طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ واحدی صاحب نے ان یادداشتوں کو اپنے حافظے سے نکال کر کاغذ کے سپرد کرکے دلی کے اس عہد کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا حصّہ بھی اس پُرانے اور مقدس حافظے سے جلد حاصل کر لیا جائے۔

رسالہ طلوع اسلام' لاہور کی رائے:۔

یوں تو ایک بستی (شہر یا قریہ) اس کے سوا اور کیا ہے کہ چند مکانات اور راستوں کا مجموعہ ہے، لیکن بعض بستیوں کو ایسی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے

www.taemeernews.com

کہ وہ ایک قوم کی تاریخ بن جاتی ہیں۔ دلی ایک ایسی ہی بستی تھی (تھی کہتے ہوئے دل کو ایک دھکا سا لگتا ہے لیکن بحالات موجودہ ایسا کہنا ہی پڑتا ہے) یوں تو اس بستی سے ہندوستان کے ہر مسلمان کو قلبی لگاؤ تھا۔ ایسا لگاؤ کہ اقبال کو "سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی تھی" ___ لیکن دلی کے رہنے والوں کو اس سے عشق تھا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ان میں سے جو لوگ دلی چھوڑ کر پاکستان آئے ہیں، اُن کی آنکھیں آج تک دلی کی یاد میں شبنم فشاں ہیں۔ یہی وہ حسین یاد ہے جو مُلا واحدی کے قلم سے زیرِ نظر کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ دلی کی کہانی اور مُلا واحدی کی زبانی، یوں سمجھئے کہ ایک فلم ہے جو رنگینیوں اور شادکامیوں کے ادوار سے گزرتا ہوا انتہائی ٹریجڈی پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخری باب میں واحدی صاحب، دلی کے مکانوں سے گزر کر مکینوں تک پہنچ گئے ہیں اور وہاں کی بہت سی معروف اور غیر معروف ہستیوں سے اپنے خاص انداز میں تعارف کرایا ہے۔

رسالہ تذکرہ کراچی کی رائے:۔

یہ کتاب اہلِ دہلی اور دہلی کی معاشرت اور تہذیب کی مختصر اور جامع داستان ہے جو کئی حصوں میں ہے۔ یہ اس کتاب کا پہلا حصہ ہے، اس میں مصنف نے اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد یعنی ۱۸۹۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے مشاہدات کو نہایت

www.taemeernews.com

اچھوتے انداز سے سمویا ہے۔ اور ان ارباب کمال کے متعلق اپنے تاثرات کتاب میں قلم بند کئے ہیں جنھیں قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔

دہلی کی مشہور مسلمان شخصیتوں کا زیادہ اور ہندوؤں کا خال خال تذکرہ آیا ہے۔ دہلی کے حکماء، فضلاء، ادباء، فقراء، خوشنویس، ارباب دانش و بینش اور اہلِ حرفہ سب ہی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ کسی نہ کسی انداز سے کتاب میں ہو گیا ہے۔

کتاب میں جس شخصیت کا ذکر ہوا اور واحدی صاحب نے اس کے متعلق جو رائے دی ہے اس میں نہ مبالغہ ہے نہ پاسداری، مثلاً ایک موقع پر مفتی کفایت اللہؒ کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"حضرت مفتی محمد کفایت اللہؒ کے ساتھ پچاس سال پڑوس کے تعلقات رہے، اُن کی شریفانہ متانت اور مومنانہ فراست یاد آتی ہے"

اسی طرح سردار دیوان سنگھ مفتون کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ریاست کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا کبھی سردار صاحب بیمار پڑ جاتے تھے اور ایڈیٹوریل کوئی دوسرا لکھتا تو ریاست پھیکا اور پھُس پھُسا سمجھا جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزا نہ آتا تھا۔ سردار صاحب کے کسی خلافِ محاورہ فقرے کا ہلا دینا ایڈیٹوریل مضمون کی جان سلب کر لیتا تھا"

www.taemeernews.com

مولانا ابوالکلام کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اُن کی زبان اور اُن کا طرزِ بیان کوئی کہاں سے لائے گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عرش کا پایہ پکڑ کر لکھ رہے اور بول رہے ہیں"

واحدی صاحب آدمی پُرانے ہیں بزرگوں کو دیکھا ہے۔ اسی لئے انھیں آج کا مسلمان کیونکر بھا سکتا ہے۔ ایک موقعہ پر کیسے پتہ کی بات کہہ گئے ہیں۔

"ہماری تعلیم و تربیت اب اس قسم کی نہیں رہی ہے، جس سے ایمان و ایقان ترقی کرے۔ ہمارے خواص محض سیاسی مسلمان ہیں اور ہمارے عوام محض معاشرتی مسلمان"

موضوع سے متعلق جتنا مرتب اور غیر مرتب مواد جیسا کچھ بھی مصنف کے دماغ میں محفوظ تھا اُس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ اسی لئے غالباً کتاب میں ترتیب کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا گو اس کا خود مصنف کو احساس ہے فرماتے ہیں۔

"فی الحال پیشِ نظر یہ ہے کہ جتنا مواد ممکن ہے جمع کر دوں ترتیب کوئی اور دے لے گا، سولہ سترہ سو صفحے کا مواد حافظہ میں ہے، ترتیب کو سوچوں تو کتاب کا پہلا حصہ بھی شائع نہ ہو سکے گا"

www.taemeernews.com

رسالہ فاران کراچی کی رائے:-

"یہ کتاب دلی کے تمدن و معاشرت کی تاریخ بھی ہے اور دلی مرحوم کا مرثیہ بھی ہے مُلّا واحدی کا قلم اور دلی کی کہانی، اسے دلچسپ اور اثر انگیز ہونا ہی چاہیئے۔ اُن کے قلم نے گلفشانی بھی کی ہے اور اشکباری بھی۔ لکھتے ہیں:-

"بچوں سے اتنے عرصے واسطہ نہیں رہا جتنے عرصے دلی سے واسطہ رہ چکا ہے"

دلی سے مصنف کا یہی قلبی تعلق کاغذ پر پھیل کر ایک اثر انگیز داستان بن گیا ہے! اعلان آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی کیا پوزیشن ہو گئی، اس کی فاضل مصنف نے کتنی صحیح ترجمانی کی ہے۔

"۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو میں نے سچ مچ اپنے تئیں آزاد تصور کیا تھا۔ میں پھولا نہیں سماتا تھا کہ مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے مرنے سے پہلے آزادی کی صورت دکھادی۔ میں خیال کرتا تھا کہ پاکستان میں صرف مسلمان اور ہندوستان میں صرف ہندو اور سکھ آزاد نہیں ہوئے ہیں، دونوں سلطنتوں کے کل باشندے آزاد ہوئے ہیں مگر اگست کا مہینہ گزرنے نہ پایا تھا جو محسوس ہونے لگا کہ میں تو اور بندہ گیا، میری محکومی اور غلامی تو اور ابھر آئی۔ انگریز کے دور میں اس قدر احساس کمتری نہ تھا جس قدر آزادی کے زمانہ میں ہو رہا تھا۔

www.taemeernews.com

"میں سرکل راشننگ آفس جاتا، میرا ہندو دارسکہ عملہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح پیش آتا۔ اس سرکل کا میں انچارج تھا۔ لیکن چاروں سمت فضا اتنی خراب تھی کہ میں اپنے ہندو اردلی کی بابت سوچنے لگتا کہ یہ سلام کے لیے جُھک رہا ہے یا میرا مذاق اُڑا رہا ہے۔"

اس عبارت کی تاثیر دیکھیے:۔

"ہم دلّی سے چلے ہیں تو ہمیں رخصت کرنے والے صرف دو تھے۔ حسینی اور میرو۔ اُن کا رونا ہمارے دل پر نقش ہے اور ہماری جدائی اُن کے دل پر نقش ہے، ۱۹۵۳ء میں میری لڑکی اور داماد (شاکرہ اور شریف) اور میاں علی مقتدیٰ واحدی دلّی گئے تو حسینی اور میرو نے انھیں پھولوں اور گوٹے کے ہاروں سے لاد دیا اور پھلوں کا اُن کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔ میں دلّی یوں بھی نہیں جاتا کہ حسینی اور میرو کا بدلہ اُتارنے کے لائق، دلّی میں روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔"

حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی کے علم و فضل اور دانش و تبحر پر چند لفظوں میں کتنا جامع تبصرہ کیا ہے:۔

"کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہو تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں سن لے۔ اسے اپنی عقل کی بے بضاعتی نہیں، نفسِ عقل کی بے بضاعتی کا پتہ لگ جائے گا۔"

www.taemeernews.com

خواجہ حسن نظامی مرحوم محنتی اور جفاکش انسان تھے مگر کثیر الاشغال تھے، اس پر واحدی صاحب نے کس خوبصورتی کے ساتھ تبصرہ فرمایا ہے۔

"خواجہ صاحب کی محنت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اُن کا بس چلتا تو شاید رات کا سونا بھی ترک کر دیتے، اُن کے کاموں کو میں مرزا غالب کی کلّیات سے تشبیہہ دیا کرتا ہوں، اتنا کام کرنے والے کے سارے کام ایک معیار پر نہیں اُتر سکتے، جس طرح مرزا غالب کا سارا کلام ویسا نہیں تھا جیسا کہ اُن کا منتخب کلام ہے، اسی طرح خواجہ صاحب کے کاموں کے کلّیات کا انتخاب کرنا چاہیئے، انتخاب میں اس قدر کام باقی رہ جائے گا کہ عصرِ حاضر میں اُس قدر کام کرنے کی مثال دستیاب نہیں ہو گی۔ خواجہ صاحب کو کام کرنے کا ہوکا تھا ــــ چاہتے تھے یہ بھی کر لوں وہ بھی کر لوں۔ خواجہ صاحب اسے نہیں سوچتے تھے کہ کون سا کام اُن کے کرنے کا ہے اور کون سا کام اُن کے کرنے کا نہیں ہے"۔

دلّی میں پھل، فالودہ، شربت اور مٹھائی بیچنے والے آوازیں لگا کر اپنی چیزیں بیچا کرتے تھے، اُن بولیوں اور آوازوں کا مصنّف نے اپنی کتاب میں ذکر کر کے "فسانۂ عجائب" کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

دلّی کی شخصیتوں کے بارے میں مصنّف نے ہر کسی کا ذکر بھلائی ہی سے

www.taemeernews.com

کیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اُن کے عیوب اُن کے محاسن کے مقابلہ میں بہت کم تھے، جناب واحدی صاحب کو طنز و تنقید، بحث مباحثہ، عیب جینی اور خردہ گیری سے ایک طرح کی چڑ ہے۔ اُنھوں نے صلح کل اور مرنجان و مرنج طبیعت پائی ہے۔

مُلّا واحدی کا انداز بیان سلیس و سادہ شگفتہ اور رواں ہے۔

• اس کتاب کو میں ایک بار پڑھ کر ضروری نشان لگا چکا تھا۔ مگر وہ کتاب گم ہو گئی۔ واحدی صاحب سے میں نے ذکر کیا تو دوبارہ عنایت فرمائی۔ میں نے اسے دوبارہ پڑھا۔ اس کا دوبارہ پڑھنا ذرا بھی نہیں کھلا بلکہ فرحت و شگفتگی محسوس کی! "میرے زمانہ کی دلّی" یقین ہے کہ قبول عام حاصل کرے گی!"

رسالہ ساقی کراچی کی رائے

مُلّا واحدی دہلوی، دلیٔ مرحوم کے قدیم شرفا کا آخری نمونہ ہیں۔ گزشتہ چالیس پینتالیس سال سے ہم بھی انھیں دیکھ رہے ہیں، اُن کی وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کبھی دلّی کے امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کی رفاقت میں ادب اور مذہب کا چسکا لگا۔ بیسیوں اخبار اور رسالے وقتاً فوقتاً نکالے جن میں سے ایک "نظام المشایخ" اب بھی زندہ ہے اور اپنی زندگی کے پچاسویں سال میں ہے۔

www.taemeernews.com

واحدی صاحب نام و نمود سے ہمیشہ متنفر رہے۔ دُھن کے پکّے اور خاموش کارکن ہیں۔ دو چار، دس بیس نہیں، سینکڑوں کو اُنھوں نے کام سے لگایا اور بعض کی تو اتنی مدد کی کہ شہرت کے آسمان پر وہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ دوسروں کو بنانے میں خود کو مٹاتے گئے، یہاں تک کہ پچیس تیس سال کے پھیر میں کوچہ چیلاں میں صرف اُن کے رہنے کا گھر باقی رہ گیا۔ جب ادب کی دیمک نے ساری جائداد چاٹ لی اور آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تو چند مخلص احباب نے انھیں پنشنگ آفیسر بننے پر مجبور کیا، ورنہ اُن کی خودداری اور بے نیازی انھیں چُپ چپاتے شاید فاقوں مار ڈالتی۔ جب دلّی میں خون برسا اور مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹے جانے لگے تو واحدی صاحب کو بھی دیس نکالا ملا۔ آدمؑ کو باغِ خلد چھُٹنے کا اتنا صدمہ نہ ہوا ہوگا جتنا واحدی کو دلّی چھٹنے کا ہے۔ شاہ جہاں نے جب میو سوادِ شاہ جہان آباد بسایا تھا تو واحدی صاحب کے جدِ اعلیٰ بخارا سے بلوائے گئے تھے اور پیش نشین مقرر کئے گئے تھے۔ واحدی صاحب دلِ بریاں اور چشمِ گریاں لئے کراچی پہنچے تو یہ بھرا پُرا شہر ان کے لئے ایک ویرانہ تھا۔ بارے جب کراچی میں دلّی کی شباہت پیدا ہوئی اور انھیں یہاں کچھ جانی پہچانی شکلیں دکھائی دینے لگیں تو اُن کے غم نے صبر کی صورت اختیار کی۔ اُجڑے دیار کی گزری ہوئی بہاریں ماضی کے دریچے کھولنے لگیں اور دل کا گداز آنسو بن کر قلم سے ٹپکنے لگا۔ "میرے زمانہ کی دلّی" اپنی آب دار موتیوں کی ایک

www.taemeernews.com

لڑی ہے۔ واحدی صاحب دلّی کے قطب بھی ہیں اور دلّی کی دائی بھی۔ اس صدی کی دلّی دیکھنی ہو تو ان کی اس کتاب میں دیکھئے۔ ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا! واحدی صاحب نے کوزے میں دریا بند کیا ہے۔ حکایت چونکہ لذیذ ہے اِس لئے اگر دراز تر کہتے تو ہم اُن کے اور بھی منّت گزار ہوتے۔ واحدی صاحب نے اس کے پیش لفظ میں وعدہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلے کے اور حصّے بھی (بشرطِ صحت) لکھ کر شائع کریں گے۔ اللہ اُنھیں ہزاری عمر دے اور وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں۔ اُن کے بعد نہ تو دلّی کا کوئی ایسا عاشق پیدا ہوگا اور نہ اس انداز کا لکھنے والا۔"

انجمن ترقی اُردو پاکستان کے ترجمان اخبار قومی زبان کی رائے:-

مُلّا واحدی صاحب اُس دیار کے "جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا" قدیم باشندے ہی نہیں بلکہ عاشق بھی ہیں۔ اُنھوں نے وہاں اپنی زندگی کا بہترین زمانہ گزارا اور پھر تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے ۔۔۔ وہ دلّی سے بظاہر یوں تو خالی ہاتھ آئے لیکن اُن کے ذہن میں اس "دیارِ رنگ و بو" کی بے شمار یادیں تھیں، اَن گِنت تصویریں تھیں، لاتعداد رعنائیاں تھیں، جنھیں کوئی نہ چھین سکا اور جنھیں وہ خود بھی فراموش نہ کر سکے۔ "میرے زمانے کی دلّی" اُنھیں یادوں، اُنھیں تصویروں، اور اُنھیں رعنائیوں کا ایک دل کش

www.taemeernews.com

اور خوبصورت مرقع ہے۔

واحدی صاحب نے اپنے زمانے کی دلی کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے کہ اُن کی تصنیف ایک بہترین ثقافتی اور تہذیبی تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔ جس میں دلی ہے، دلی والے ہیں اور وہ سب کچھ ہے جس کی بنا پر یہ شہر کبھی "عالم میں انتخاب" تھا۔

واحدی صاحب کو دلی سے کس قدر محبت ہے؟ اس امر کا اندازہ اس کتاب کے لفظ لفظ سے ہوتا ہے، وہ پُرانی یادوں کی شمعیں کچھ اس طرح روشن کرتے ہیں کہ ماضی وحال کی تفریق ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ واقعات کو محض بیان نہیں کرتے بلکہ نئے سرے سے زندہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قاری یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ سب کچھ "پڑھ" نہیں بلکہ "دیکھ" رہا ہے۔

واحدی صاحب نے اُس اُجڑی ہوئی محفل کا تذکرہ دُور سے دیکھنے والے کی حیثیت سے نہیں کیا، بلکہ وہ "شریک محفل" بن کر سامنے آتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ یہ داستان آپ بیتی کی طرح دلچسپ بھی ہے اور دل گداز بھی۔

اب ایسے لوگ کتنے رہ گئے ہیں جو ہماری قدیم تہذیبی روایات اور معاشرتی قدروں کے علمبردار ہوں؟ ایسے لوگوں میں واحدی صاحب کا دم غنیمت ہے اور ان کی زیر نظر تصنیف نئی نسل کے لئے ایک بہترین ثقافتی تحفہ ہے۔

www.taemeernews.com

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنے اخبار صدق جدید، لکھنؤ میں تحریر فرماتے ہیں:-

میرے زمانہ کی دلّی کہنا چاہیئے کہ دہلی مرحوم کا مرثیہ ہے۔ ایک خاص الخاص دہلوی کی زبان سے۔ واحدی صاحب کی ادبیت کی جان اُن کا اخلاص ہے۔ اُن کا تصوّر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کبھی دوسروں کو بھی سُنانا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ جیسے وہ باتیں اپنے آپ سے کر رہے ہیں۔ کچھ اس طرح کہ آواز ذرا بلند ہے اور آس پاس والے اُسے اتفاق سے سُن سُنا لیتے ہیں۔ اُن کی تربیت ایسی نہیں کہ وہ کبھی چیخ کر روئیں۔ وہ صرف چپکے چپکے آنسو بہانا جانتے ہیں اور کبھی کبھی ایک آدھ ہلکی سی سسکی بھی بھر لیتے ہیں:

اکبر مرحوم نے ایسے شعر کی تعریف یہی لکھی تھی کہ وہ دوسروں کے سننے سنانے کے لئے نہیں، شاعر خود اپنے لئے کہتا ہے ؎

نہ ان کیلئے ہے نہ اُن کیلئے — نہ اشعار ہیں یہ صلے کے لئے
بہت خوب ہے قول ہادی عزیز — کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے

کچھ ایسا ہی رنگ واحدی صاحب کی نثر کا ہے۔ وہ دوسروں کی مدح و تحسین سے بے نیاز، اپنے ہی اندرونی تقاضوں سے مضطر و مجبور ہو کر قلم اٹھاتے ہیں اور جو کچھ اندر ہوتا ہے اُسے باہر لے آتے ہیں۔

دہلی والوں سے اُن کی مراد خاص دہلی کے باشندے ہی نہیں، بلکہ باہر

www.taemeernews.com

کے وہ لوگ بھی ہیں جو اُن کے زمانے میں دہلی میں مقیم رہے اور اس طرح موضوع کا دائرہ بڑا وسیع ہو گیا ہے۔ مولانا محمد علیؒ کا ذکر ذرا تفصیل سے آگیا ہے۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ کا اجمالاً — بعض ناموں کے تذکرہ میں ان کا حافظہ اُنھیں دھوکا دے گیا ہے۔ خصوصاً سید جالب مرحوم کے سلسلہ میں صفحہ ۳۱۳، صفحہ ۳۱۴ پر لیکن اس سے نفس مضمون پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔

(اس ایڈیشن میں بہت سی غلطیاں درست کر دی ہیں — پبلشر)

کتاب میں واقعات درج ہیں، رومان اور افسانے نہیں، لیکن واقعات ہی میں جا بجا افسانویت کی حیرت انگیزی آگئی ہے۔ خصوصاً حکیم نابینا صاحب اور نواب بدھن صاحب کے حالات میں۔ کتاب کو عربی ادب کی اصطلاح میں محاضرات کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ تاریخ۔ سیرت۔ ادب تینوں میں سے جس فن کے ماتحت بھی چاہے رکھ لیجئے۔

روزنامہ نئی روشنی، کراچی میں پُرانی روشنی والے چوہدری احمد بخش صاحب ایڈیٹر جنرل نیوز دہلی رقمطراز ہیں:۔

دلّی — ہائے دلّی — میرے زمانہ کی دلّی! کس کے زمانہ کی دلّی؟ کون کہہ رہا ہے؟ اور کس سے کہہ رہا ہے؟ اور دلّی سے کیا مراد ہے؟

دلّی کا روڑا سمندر کنارے پہنچا۔

www.taemeernews.com

سیّد محمد ارتضیٰ صاحب جن کو مُلّا الواحدی کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اس کتاب "میرے زمانہ کی دلّی" کے لکھنے والے ہیں۔ ان کا وطن یا جنم بھومی دلّی ہے۔ جہاں یہ اور ان کے باپ دادا پیدا ہوئے، پرورش پائی، تربیت اور تعلیم حاصل کی، جوان ہوئے، عوام کی خدمت کی۔ بہرہ ور اور بہرہ اندوز ہوئے۔ بلاغِ دہلی کے ثمردار نخل اور سایہ گستر شجر کی حیثیت سے نظر آتے تھے اور دلّی کو آبا و اجداد کا گھر اور اپنی حیاتِ معصومہ کا گہوارہ سمجھ رہے تھے۔ قسمت نے بائیس خواجہ کی چوکھٹ سے جو اٹھایا تو ساحل مکران کو چومنے والے سمندر کے کنارے دے پٹخا — گویا کہ باغ عدن میں رہتے تھے۔ پیریاں گذر چکی تھیں۔ بزرگوں کی ہڈیاں امانت تھیں۔ نالیں گڑی تھیں۔ مگر جنتِ دہلی سے نکلنا ہی مقدر تھا کہ بحکم ربّی آج جیکب لائنز کراچی میں مقیم ہیں اور دہلی کی یاد کو ایک پہلو میں دبائے تڑپ رہے ہیں:۔ مارے تڑپ کے منہ سے ہائے نکلے نہ وائے۔ بلکہ اگر کچھ نکلتا ہے تو یہ کہ "میرے زمانہ کی دلّی" لہٰذا یہ کتاب "میرے زمانہ کی دلّی" مُلّا الواحدی کے زمانہ کی دلّی ہے۔ اور کہنے والے مُلّا الواحدی۔

ہم رہنے والے ہیں اک اُجڑے دیار کے

اب رہا۔ کہ کس سے رہے ہیں؟ ظاہر ہے پڑھنے اور سننے والوں سے کہہ رہے ہیں اور دلّی سے مُراد شاہجہان آباد ہے جس میں شاہجہانی جامع مسجد کھڑی ہے اور مُلّا الواحدی کے گھر تک اس مسجد کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدائیں ٹکراتی ہیں۔ مُلّا الواحدی جب اپنے زمانہ کی دلّی کے تصورات میں گم ہوتے ہیں تو وہ جیکب لائنز والی

www.taemeernews.com

مسجد مولوی احتشام الحق کی اذانوں میں گم نہیں ہوتے۔ بلکہ دلی کے جامع شاہی کے میناروں کی تکبیروں میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوبی دروازے کی سیڑھیوں سے مسجد میں داخل ہو رہے ہیں اور خلد آشیانی شاہجہان مشرقی دروازہ سے صحن کی طرف تشریف بخش رہے ہوتے ہیں جب انھیں کوئی جھنجوڑتا ہے تو وہ گم گشتہ صحرائے ناپیداکنار نظر آتے ہیں۔ اور ان کی زبان پر وہی جملہ ہوتا۔ ہائے "میرے زمانہ کی دلی ـــــ !

کس طرح مُلّا واحدی کا دل دلی کی ہر چیز میں اٹکا ہوا ہے۔ انھیں کن حالات میں اُجڑنا پڑا۔ دوستوں کی مخصوص مہربانیوں اور ارادوں کے چرچے اور تقدیر کے استقبالیہ جنھوں نے مُلّا مذکور کو بندر روڈ پر لا بسایا۔ اس کتاب "میرے زمانہ کی دلی" میں حیطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں جن کا کچھ حصہ تو گھروں سے اجڑنے والے بچشم خود دیکھ چکے ہیں۔ اور چھوٹے بچے جو اُجڑنے والے بزرگوں کے کندھوں پر اور خانہ برباد ماؤں، بہنوں اور دادیوں نانیوں کی آغوش میں لپٹ کر بیہوشی کے عالم میں اِدھر اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوئے ہیں۔ نیز وہ بچے جن کی عمریں نئے ملکوں میں ابھی گیارہ ہی برس کی ہوں گی اور یہ سب جو ابھی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہے ہوں گے اور اپنے بزرگوں سے راتوں میں آزادی اور بربادی کی داستانیں اور کتھائیں سنتے ہوں گے یا جو آیندہ پیدا ہونے والے بچے تعلیمی شعور حاصل کریں گے۔ مُلّا واحدی کی تاریخ آبادی و بربادی کے بڑے رنگ برنگ پہلوؤں کا مطالعہ کریں گے۔

www.taemeernews.com

بہر نوع "میرے زمانہ کی دلی" فیض بازار کی ٹکسالی زبان میں ڈھالی گئی ہے۔ اور یہ ایک سوغات ہے۔ جو اُجڑنے والوں کے ذوقِ طبع کی دل سوز خوراک ہے۔ اس کتاب کا پڑھا جانا بیتا کی یاد تازہ کردے گا۔ عبرت کے دروازے کُھل جائیں گے۔ اور اگر خالق اکبر کو منظور ہوا تو پڑھنے اور سننے والے خوفِ خدا سے کانپ اٹھیں گے اور بارگاہِ خداوندی میں جُھک جائیں گے۔ اور خداوند کریم ان کو سیدھی راہ دکھا دیں گے۔ اس کتاب کا ہر دفتر، ہر کارخانہ، ہر گھر، ہر اسکول، ہر لائبریری میں رکھنا گویا کہ آثار قدیمہ کی ایک لوح کا محفوظ رکھنا ہے۔

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

فہرست

۱)	پیش لفظ	از واحدی	صفحہ ۵
۲)	دلّی چھوڑنے سے پہلے	از واحدی	۵۰ ″
۳)	دلّی چھوڑنے کے بعد	از واحدی	۶۲ ″
۴)	دلّی کی اہمیت	از واحدی	۹۲ ″
۵)	دلّی کے ٹوٹرخسم	از واحدی	۹۶ ″
۶)	میرے زمانے کی دلّی	از واحدی	۱۰۶ ″
۷)	۱۹۳۲ء سے قبل کی دلّی[1]	از پیرنس شتاق احمد زاہدی دہلوی	
۸)	دلّی مرحوم کی ایک شادی	از خواجہ فضل احمد خاں شیدا دہلوی	
۹)	دلّی کی ایک اور شادی	از سید یوسف بخاری دہلوی	
۱۰)	شادیوں کا مکمل منظر	از خواجہ محمد شفیع دہلوی	

---

[1] نمبر ۷ سے نمبر ۱۰ تک کے مضامین ان شاءاللہ کتاب کے دوسرے حصہ میں درج کئے جائیں گے۔ مضامین سب تیار ہیں۔ (پبلشر)

www.taemeernews.com

۱۱) پچاس سال پہلے کی سترھویں از واحدی
۱۲) پچاس سال پہلے کی سیر گل فروشاں از واحدی
۱۳) پچاس سال پہلے کی بسنت از واحدی
۱۴) ۱۹۱۱ء کا دربار از واحدی
۱۵) ۱۹۴۷ء کے بعد دلّی کی پہلی عید از واحدی
۱۶) ۱۹۴۷ء کے بعد دلّی کی پہلی عید از حضرت خواجہ حسن نظامیؒ
۱۷) ۱۹۴۷ء کے بعد دلّی کی پہلی برسات از واحدی
۱۸) پرانے قلعہ کی کہانی از واحدی
۱۹) چوک کی بہار از مولوی شاہد احمد دہلوی
۲۰) گزری ہوئی باتیں از واحدی
۲۱) چند اور یادیں از واحدی

www.taemeernews.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

بُہتیرا چاہتا ہوں کہ اب سیرت نبویؐ اور قرآن و حدیث کے مضامین کے سوا کچھ نہ لکھوں، مگر ریڈیو سے فرمایش آجاتی ہے تو اُس کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ ریڈیو والے معاوضہ دیتے ہیں اور عنوان اسلام اور بزرگانِ اسلام کے متعلق تجویز کرتے ہیں۔ اُنھیں کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ اور یہاں حسن ثانی حضرت خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمہ پر کچھ لکھنے کو کہیں تو کیونکر انکار کردوں۔

ایک یہ دلی صاحبہ ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتیں، اور دلی کے عشاق ہیں، جو اُکساتے رہتے ہیں کہ دلی کو تم نہ روؤگے تو اور کون روئے گا۔ کوئی مستقل رونا روتے جاؤ۔ فلاں تم سے زیادہ عمر کا ہے، مگر عمر کی زیادتی کے باعث اُس کے ہاتھ کانپنے لگے ہیں اور قلم کا زور بھی گھٹ گیا ہے۔ فلاں تم سے کم عمر ہے، گو وہ دلی کو خوب جانتا ہے، دلی کی خاک کافی چھان چکا ہے، لیکن کیا کیجیے: اُسے غمِ روزگار کھا گیا۔ تمھارا قلم

www.taemeernews.com

ابھی رواں ہے۔ دلی کا حق تھوڑا بہت ادا کر دو۔

میں آخر مجبور ہو گیا اور یہ تھوڑا بہت حق ادا کرتا ہوں۔ خود لکھوں گا اور بس چلا تو اوروں سے بھی لکھواؤں گا۔ اپنے لکھے ہوئے کی کمیاں پوری کراؤں گا۔

واحدی

۱۸ رجون ۱۹۵۶ء ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۷۵ء

مکرر آنکہ پاکستان میں اس کتاب کے سب سے بڑے محرک خواجہ شہاب الدین، وزیر داخلہ پاکستان تھے۔ لیکن سفیر بن جانے کے بعد معلوم نہیں خواجہ صاحب کی دل چسپی باقی ہے یا جاتی رہی۔ دوسرے نمایاں قدر دان مسٹر ممتاز حسن، سکریٹری وزارت مال پاکستان اور مسٹر محمد اسمٰعیل صوفی، اسسٹنٹ پرائیویٹ سکریٹری چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر، پاکستان ہیں۔

بھارت میں اسے سردار دیوان سنگھ مفتوں، ایڈیٹر ریاست دہلی نے بہت پسند کیا۔ انھیں میری ہر تحریر پسند ہے۔ حیات سرور کائناتؐ کے متعلق سردار صاحب نے لکھا تھا کہ "سری کرشن جی کی کتاب گیتا کے برابر حیات سرور کائناتؐ کو جگہ دے رہا ہوں۔"

حیات سرور کائناتؐ کا بھارتی ایڈیشن چھپوانے کا خیال سردار صاحب ہی کو پیدا ہوا۔ مجھے اور مکتبہ دینیات، نئی دلی کو حیات سرور کائناتؐ کا بھارتی ایڈیشن چھاپنے پر آمادہ کرنے والے سردار دیوان سنگھ مفتوں ہیں۔

میرے زمانے کی دلّی کا بھارت میں سردار صاحب نے خاصا ڈنکا بجا دیا۔

میں سردار صاحب کے احباب دہلی، میسرز روپ بسنت۔ میسرز پنڈت برادرز۔ میسرز موہن سنگھ اینڈ سنز۔ گیانی نہال سنگھ صاحب اور پروپرائٹر صاحب نویگ پریس کا بھی ممنون ہوں، خصوصًا میسرز روپ بسنت کا جنھوں نے سردار صاحب کے کہنے سے اس کتاب کی اشاعت میں بڑا حصّہ لیا۔

واحدی

۱۲ ذیقعد سنہ ۱۳۶۶ھ

یکم جون سنہ ۱۹۵۰ء

دِلّی چھوڑنے سے پہلے

ستمبر ۱۹۴۷ء کی بھیانک رات تھی۔ کبھی ادھر سے شور اُٹھتا تھا۔ کبھی اُدھر سے غُل مچتا تھا۔ کبھی بندوقیں چلتیں۔ کبھی اسٹین گنیں گولیاں برسانے لگتیں۔ مینہ بھی برس رہا تھا اور شام کے چھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک کا کرفیو بھی تھا۔ مگر تُلنے والوں کو نہ آسمانی رکاوٹ کی پروا تھی اور نہ ارضی قانون کی۔ قانون خود قانون سے کھیل رہا تھا۔

گاندھی جی کے آجانے سے بڑے حملے رُک گئے تھے۔ لیکن حملوں کا خطرہ نہیں رُکا تھا۔ حملوں کے ڈراوے جاری تھے اور چھوٹے چھوٹے حملے ہو رہے تھے۔

یہ مشرقی پنجاب کا ذکر نہیں ہے۔ دلی کا ذکر ہے۔ معصوم دلی کا۔ بے قصور دلی کا۔

دلی والوں کو دلی کی صحیح خبریں ملنی دشوار تھیں۔ گاندھی جی کی پرارتھنا کا ریکارڈ بجایا جاتا تو کچھ اس سے اندازہ ہوتا اور کچھ بی بی سی لندن بتاتا کہ دلی پر آج کیا بیتی۔

www.taemeernews.com

میں دس بجے کے قریب لندن کی خبروں سے فراغت پاکر سونا چاہتا تھا کہ آواز آئی ـــــــ "واحدی صاحب ـــــــ "

میں مکان کی دوسری منزل میں تھا۔ میرا لڑکا مجتبٰے نیچے اُترا۔ زینہ ہی سے اُس نے پکارا ـــــــ "ابا جی! لالہ دیس راج ہیں" میں نے کہا ـــــــ "بلالو"

اوپر مردانہ تھا۔ عورتیں اور بچے نیچے کے کمروں میں تھے، تاکہ اگر حملہ ہو تو گلی کی طرف کے دروازے سے گلی میں جا سکیں۔ مکان کا اصل دروازہ سڑک پر تھا۔

مجتبٰے نے جواب دیا ـــ "آپ ہی تشریف لائیے"

لالہ دیس راج چوہدری ڈیڑھ فرلانگ فاصلہ کے پڑوسی تھے اور دلی میونسپل کمیٹی کے ساتھی ـــ مجھ سے چھوٹے بھائیوں کی طرح ملتے تھے۔ اس کے باوجود یہ سن کر کہ "آپ ہی تشریف لائیے" میں گھبرایا۔ بہر حال جانا ضروری تھا۔

دیکھتا کیا ہوں۔ متعدد موٹریں کھڑی ہیں۔ چند آدمی سادہ لباس میں ہیں۔ چند وردیوں میں۔ ایک خاتون بھی ہیں۔ ماتھا ٹھنکا۔ کہیں تلاشی لینے والے نہ ہوں ـــــــ رات کے وقت تلاشی ـــــــ آجکل سب جائز ہے۔

www.taemeernews.com

کوئی مضائقہ نہیں۔ حسرت نکال لیں۔ ترکاری کاٹنے کی چھری تک مسعود صاحب اسپیشل مجسٹریٹ کے حوالہ کر دی ہے۔

لالہ دیس راج نے تعارف کرایا "یہ مسز کرپلانی ہیں۔ صدر کانگریس کی دھرم پتنی ۔۔۔ یہ مسٹر شانتی سروپ آہوجہ ہیں۔ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ"۔

مسز کرپلانی نے سوال کیا: "اس محلہ میں تو امن ہے؟" میں نے کہا: "ہاں۔ خاص کوچہ چیلان میں ابھی امن ہے۔ لیکن امن ٹوٹنے کا ہر آن امکان ہے"۔

مسٹر آہوجہ بولے: "مہاتما گاندھی کو کسی نے خط لکھا تھا کہ یہاں خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ آپ صاف صاف بتائیے، خطرہ کا وہم کیوں ہے۔ مسز کرپلانی مہاتما جی کو کیا رپورٹ دیں"۔

میں زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔ وہی بیان دوہرا دیا کہ "ویسے تو واقعی امن ہے۔ مگر باہر کے محلوں تک حملے پہنچ چکے ہیں۔ اس لئے اطمینان نہیں ہے۔ اب سبزی منڈی۔ قرول باغ۔ پہاڑ گنج اور نئی دلّی جیسے حملے بے شک بند ہیں، لیکن چھوٹے چھوٹے حملے تو ہو ہی رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے حصوں کو لیا ہی جا رہا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ العلماء ہند کا مکان نزدیک ہے۔ وہ ممکن ہے آپ کی رپورٹ زیادہ مکمل کرا سکیں"۔

آہوجہ صاحب نے دو فوجی میرے لڑکے کے ساتھ کئے اور مولانا کو بلا بھیجا۔

www.taemeernews.com

گفتگو ذرا لمبی تھی کہ پیچھے سے ایک صاحب نے فرمایا۔ "آداب عرض کرتا ہوں" یہ رائے صاحب ہنومان پرشاد، آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ان سے بھی کمیٹی کا تعلق تھا۔ میں اپنی اور دونوں ہندو میونسپل کمشنروں کی پوزیشن پر غور کرنے لگا۔

لالہ دیس راج نے صفائی کی غرض سے کہا کہ میں چونکہ اس علاقہ کا ہندو اسپیشل مجسٹریٹ ہوں۔ یہ پارٹی خطرہ کی تحقیقات کرنے میرے پاس آئی تھی۔ میں آپ کے پاس لے آیا کہ آپ کو جو محسوس ہوتا ہو بتا دیں۔

مولانا احمد سعید آ گئے۔ مسٹر آہوجہ نے اُن سے بھی وہی پوچھا جو مجھ سے پوچھا تھا۔ مولانا کے جوابوں اور میرے جوابوں میں فرق نہیں تھا۔ مولانا نے اتنا اضافہ کر دیا کہ "مسٹر آصف علی اور مفتی کفایت اللہ کا محلہ آپ کے انتظامات حفاظت کا منتظر ہے۔" مسٹر آہوجہ نے کہا۔ "کیا انتظام کرنا چاہیے۔" مولانا نے فرمایا۔ "یہ تو آپ جانیں۔ ہم آپ کو انتظام سکھانے والے کون۔" مسٹر آہوجہ نے کہا۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی خالی ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھی وہاں چلے جائیں۔ وہاں کوئی کھٹکا نہیں رہے گا۔ مولانا نے فرمایا اس وقت ساتھی اور غیر ساتھی کا فرق محال ہے۔ صرف اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانی مجھے منظور نہیں۔ بچا سکتے ہوں تو سب مسلمانوں کو بچائیے۔ مسٹر آہوجہ نے کہا۔ اچھا۔ میں بارہ کانسٹیبل آدھ گھنٹے کے اندر اندر بھیجتا ہوں۔ چھ کانسٹیبل اس سڑک پر گشت کریں گے اور چھ کانسٹیبل کسی چھت پر سے چاروں طرف

www.taemeernews.com

نگاہ رکھیں گے۔ کس چھت پر انھیں بٹھایا جائے؟"

میں نے ایک بالاخانہ کی چھت تجویز کی، جو خالی پڑا تھا اور جس کے آگے سے تین راستے کٹتے تھے۔ علاقہ کا سکھ پولیس انسپکٹر موجود تھا۔ وہ بولا۔"خالی بالاخانہ میں تو خود سپاہی محفوظ نہیں ہوں گے۔ واحدی صاحب کے مکان کی چھت مناسب رہے گی، یہ مکان سڑک پر ہے اور محلہ کے وسط میں ہے۔"
سب نے اُس کی رائے منظور کرلی۔ میں چپ تھا۔ آدھ گھنٹے بعد انسپکٹر بارہ کانسٹبل پہنچا گیا اور چار ہندو اور دو سکھ کانسٹبل میرے سر پر آبراجے۔

میں بعض پابندیوں کا اتنا عادی ہوں کہ ۱۹۴۷ء کے ستمبر میں بھی ان پابندیوں کو ترک نہ کرسکا۔ وقت پر سوتا تھا اور وقت پر جاگتا تھا۔ مگر اس رات کانسٹبلوں نے نیند حرام کردی۔

چھت پر چڑھتے ہی ہدایت ملی کہ "بغیر اطلاع صحن میں نہ نکلا جائے آپ کو تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ اوروں سے ہم واقف نہیں ہیں۔ ہمیں حکم ہے کہ آہٹ پاتے ہی گولی چلا دو۔"

مجھے گھر والوں کا فکر نہ تھا۔ گھر والے تو ہدایت پر عمل کرسکتے تھے لیکن گھر کے سامنے کی مسجد میں کرفیو کے باوجود صبح کی نماز کے واسطے نمازی آجایا کرتے تھے۔ ڈر لگا کہ اُن پر کہیں گولی نہ چل جائے۔ اہلِ محلہ کو اِن کے یہاں ہونے کا علم نہیں ہے۔ احتیاط کیسے برتیں گے۔ یوں بھی کرفیو میں ایک آدھ

www.taemeernews.com

جی دار باہر نکل آتا تھا۔

رات بھر کانسٹیبلوں کو سنبھالتا رہا۔ اُن پر دھونس جمائی۔ اُن کی خوشامد کی۔ اور اللہ میاں نے وہ دھونتال پانی برسایا کہ کانسٹیبل چھت سے اُتر پڑے اور کمرہ میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

صبح چا تیار کرائی۔ خاطر مدارات کا زمانہ نہیں تھا۔ مگر کانسٹبلوں کے لئے تکلف کا ناشتہ تیار کرایا مگر کشتی واپس لوٹی تو ناشتہ جوں کا توں موجود تھا اور پیالیاں ایسی صاف جیسے استعمال نہیں ہوئیں۔

کانسٹیبلوں نے چا اور دودھ پھینک دیا تھا۔ کانسٹیبل ڈرے کہ مسلمان ہیں، زہر نہ کھلا پلا دیں۔

خیر خدا خدا کر کے آٹھ بجے اور کانسٹیبل رخصت ہوئے۔ دوپہر کو گورکھا فوج کے کئی پکٹ محلہ کے ناکوں پر کھڑے کر دیئے گئے۔ رات کے رہنے کا اُنھوں نے ناکہ کے مکانوں میں بندوبست کیا۔ شکر ہے میرا مکان ناکہ پر نہیں تھا۔

پیشتر اس کے کہ فوجی پکٹوں کا تجربہ کرتا کہ وہ ہمیں بچاتے ہیں یا حملہ آوروں کی مدد کرتے ہیں، میں نے گھر کو، محلہ کو اور دلی کو خیرباد کہا۔ مجھ سے پہلے بھی آدھا محلہ بھاگ چکا تھا۔ میرے بعد باقیوں نے بھی سوچا کہ ہمارا محلہ سبزی منڈی وغیرہ کی شل ہندوؤں کی آبادی سے متصل ہے۔ اسے خوشی خوشی ہندوؤں کی نذر کر دینا چاہیئے۔

www.taemeernews.com

پھر اُس کے بعد نہ جانے وطن پہ کیا گذری

جب پاکستان بننا طے پا گیا اور مرکزی حکومت کے مسلمان ملازمین سے پوچھا جانے لگا کہ ہندوستان میں رہوگے یا پاکستان جاؤ گے، تو میرے بڑے لڑکے سید احمد مجتبیٰ واحدی نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ مجھے شبہ بھی نہیں تھا کہ مجھے بھی اُن کے ساتھ جانا پڑے گا۔ البتہ جس طرح بن بیاہے نوجوانوں کے ساتھ مائیں بہنیں چلی جایا کرتی ہیں، میرا ارادہ تھا کہ میں سارے گھر کو کراچی بھیج دوں گا اور خود تنہا بقیہ زندگی دلی ہی میں گزاروں گا۔ بڑھاپے میں نئی جگہ سے رشتہ جوڑنا اُڈلو اُڈلو لگتا تھا۔ علاوہ ازیں ؎

ایسے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

سوچتا تھا، ہوائی جہاز کا تین چار گھنٹے کا سفر ہے، جس روز دل تڑپے گا اُسی روز اُڑ کر پہنچ سکتا ہوں۔ مستقل قیام دلی میں رکھوں گا۔

بچے کوئی چیز ہیں تو دلی بھی کوئی چیز ہے۔ دلی کی جامع مسجد۔ دلی کا لال قلعہ۔ دلی کے بازار۔ دلی کی گلیاں۔ دلی کے مقبرے۔ دلی کے کھنڈرات۔ ہائے دلی، بائیس خواجہ کی چوکھٹ۔ دلی، جہاں مسلمانوں کی دُنیا پروان چڑھی اور مسلمانوں کا دین پروان چڑھا۔ دلی، جس میں اُجڑتے اُجڑتے اور مٹتے مٹتے، اکتوبر ۱۹۴۷ء تک وہ خصوصیات تھیں، جو آج نہ وہاں رہی ہیں اور نہ کہیں اور رہیں گی۔ ایسی دلی سے میں ہرگز مفارقت

www.taemeernews.com

کرنی نہیں چاہتا تھا۔ بچوں سے اتنے عرصے واسطہ نہیں رہا جتنے عرصے دلی سے واسطہ رہ چکا ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس نے مُلک کی تقسیم بطیب خاطر منظور نہیں کی تھی۔ تاہم سنجیدگی سے ضرور منظور کی تھی۔ مجھے یقین تھا کانگریسی شرافت کے ساتھ فیصلہ کا احترام کریں گے۔

میں نے اپنے ہفتہ وار اخبار ’’سچ‘‘ میں (جسے آزادی ملنے کی یادگار کے طور پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جاری کیا گیا تھا اور جو چار ہفتے نکل کر بربادی کی نذر ہوگیا) کئی بار یہ اُمید ظاہر کی کہ وہ کھینچا تانی جو عرصۂ دراز سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چلی آتی ہے آیندہ دوستی اور آشتی میں بدل جائے گی۔ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کو سہارا دیں گے اور جیسے دو سگے بھائی الگ الگ مکانوں میں سکونت اختیار کرکے ایک دوسرے کی ترقی کو اپنی ترقی سمجھتے ہیں ویسے ہی ہندوستان پاکستان کی ترقی کو اپنی ترقی سمجھے گا اور پاکستان ہندوستان کی ترقی کو اپنی ترقی سمجھے گا اور دونوں مُلک اتحاد و یک جہتی سے دنیا میں سربلندی حاصل کریں گے۔

۱۵ اگست کو میں نے سچ مُچ اپنے تئیں آزاد تصور کیا تھا۔ میں پھولا نہیں سماتا تھا کہ مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے مرنے سے پہلے آزادی کی صورت دکھا دی میں خیال کرتا تھا کہ پاکستان میں صرف مسلمان اور ہندوستان میں صرف ہندو اور سکھ آزاد نہیں ہوئے ہیں، دونوں سلطنتوں کے کُل باشندے آزاد ہوئے ہیں۔ مگر اگست کا مہینہ گذرنے نہ پایا تھا جو محسوس ہونے لگا کہ میں تو اور بندہ ہو گیا

www.taemeernews.com

میری محکومی اور غلامی تو اور اُبھر آئی۔ انگریز کے دور میں اس قدر احساس کمتری نہ تھا جس قدر آزادی کے زمانہ میں ہو رہا تھا۔

میں سرکل راشننگ آفس جاتا۔ میرا ہندو اور سکھ عملہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح پیش آتا۔ اس سرکل کا میں انچارج تھا، لیکن چاروں سمت فضا اتنی خراب تھی کہ میں اپنے ہندو اردلی کی بابت بھی سوچنے لگتا کہ یہ سلام کیلئے جھک رہا ہے یا میرا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اس کا تعلق حاکم قوم سے ہے اور میں اس کی قوم کا بھی محکوم ہوں اور اس کا بھی محکوم ہوں۔

آخر ستمبر آگیا اور ستم گری کا پروگرام شروع ہوا۔ کہتے ہیں مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر ظلم ڈھائے تھے۔ اُن کا بدلہ دلی کے مسلمانوں سے لیا جا رہا ہے ــــ کہتے ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی غرض سے کوئی سازش ہوئی تھی اُس سازش کی چکی میں مسلمان پس گئے۔

حقیقتاً یہ اللہ کا قہر تھا جو مجھ جیسے بے عمل اور بدعمل مسلمانوں کی وجہ سے دلی کو تباہ کر گیا۔ سبزی منڈی کے قریب، قرول باغ کے قریب اور پہاڑ گنج کے قریب مغربی پنجاب کے شرنارتھیوں کو ٹھیرایا گیا تھا۔ یہ تینوں آبادیاں دلی کے کناروں کی آبادیاں ہیں۔ ایسی ہی آبادیاں اور بھی ہیں اور اُن کے قریب بھی شرنارتھیوں کے کیمپ تھے۔ مگر طوفان سبزی منڈی۔ قرول باغ۔ پہاڑ گنج اور نئی دلی ہی میں پھیلنے پایا تھا کہ گاندھی جی لاہور جاتے جاتے دلی اُتر پڑے

www.taemeernews.com

اور طوفان رُک گیا۔ کسی اور آبادی پر وہ آفت نہیں آئی جو سبزی منڈی۔ قرول باغ۔ پہاڑ گنج اور نئی دلی پر آئی تھی۔ لیکن اطمینان اور بھروسہ سارے شہر کے مسلمانوں کا جاچکا تھا۔ خصوصاً جہاں مسلمانوں کی آبادی اور ہندوؤں کی آبادی پاس پاس تھی وہاں کے مسلمان بے حد سراسیمہ تھے۔

کوچہ چیلان بھی (جہاں میرا مکان ہے) اسی قسم کا علاقہ تھا۔ فیض بازار نام کی ایک چوڑی چکلی سڑک ہے، اُس کے ایک رُخ پچیس تیس ہزار ہندو بستے تھے اور دوسرے رُخ لاکھ سوا لاکھ مسلمانوں کے گھر تھے۔ ہندوؤں میں دلی کے قدیم رہنے والے کم تھے، پنجاب کے رہنے والے زیادہ۔ یہ پنجابی دلی میں ملازمتیں اور مختلف کاروبار کرتے تھے۔ مغربی پنجاب سے ان کے عزیز آتے تو پہلے ان کے ہاں ٹھہرتے اور پھر مکانوں اور دکانوں کی تلاش میں نکلتے۔ تلاش اس درجہ آتشیں ہوتی کہ سڑک کے مسلمان دُکاندار اُس کی تاب نہ لاسکے۔ دُکانوں کے بعد مکانوں کا نمبر لگا۔ ایک گلی۔ دوسری گلی۔ تیسری گلی۔ میرا مکان جس سڑک پر تھا اُس سڑک کا بھی خاصا حصّہ مسلمانوں سے خالی کرالیا گیا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ لاکھ سوا لاکھ مسلمان پچیس تیس ہزار ہندوؤں اور سکھوں سے کیوں دہل رہے تھے۔ نووارد ہندوؤں اور سکھوں کو شامل کرلیجیے تو بھی اُن کی تعداد مسلمانوں کے برابر نہ ہوگی۔ غرض یہ ہے کہ مقابلہ ہندوؤں اور سکھوں سے نہیں تھا، فوج اور پولیس سے تھا، جو حملہ آوروں کی بجائے اُنھیں نشانہ بناتی تھی جن پر حملہ ہوتا تھا۔

www.taemeernews.com

گاندھی جی کی چیخ پکار سے حملے رک گئے تھے لیکن حملوں کا امکان نہیں رکا تھا۔ قتل و غارت کی چھوٹی چھوٹی وارداتیں گاندھی جی کے قیام کے دوران میں بھی ہوتی رہیں اور بڑے حملے کے اندیشے کو بڑھاتی رہیں۔ میرے مکان کی سڑک پر ان مقامات کے قریب جہاں تک ہندو اور سکھ گھس آئے تھے حکومت نے دونوں طرف گورکھوں کو کھڑا کر دیا تھا تاکہ اور ہندو اور سکھ نہ گھسنے پائیں۔ میرا مکان ان پکٹوں کے بیچ میں گویا محفوظ تھا۔ لیکن میں نے اپنے میں اس تجربہ کے کرنے کی طاقت نہیں دیکھی کہ حملہ ہوگا تو گورکھے مسلمان آبادی کی حفاظت کریں گے یا ہندوؤں اور سکھوں کا ساتھ دیں گے۔

ہندو آبادی میں پنڈت تبلورام جیسے ہندو اور پنجابی ہندو موجود تھے جن کی پاک دلی اور پاک دماغی کی میں قسم کھا سکتا ہوں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون جیسے پیکرِ اخلاص اور دوستی نباہنے والے سکھوں سے بھی دلی محروم نہیں تھی۔ سردار صاحب مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رہے تھے۔ اور دلی کا قدیم ہندو تو اسی فی صدی اس طوفان سے بیزار تھا مگر دوسری قسم کے ہندوؤں اور سکھوں کا اتنا غلبہ ہوا، اور فوج اور پولیس اُن سے ایسی مل گئی کہ میں تو بہادری کا جوانی میں بھی مدعی نہیں رہا، بہادر مسلمان ایک ایک کرکے بھاگ نکلے۔ ہر وہ صورت جسے میں پہچانتا تھا اور جس سے کبھی کبھار بات ہو جایا کرتی تھی غائب ہو گئی۔ اردگرد مسلمان تھے بھی تو نئے تھے، جو سبزی منڈی۔

www.taemeernews.com

قرول باغ۔ پہاڑ گنج۔ اور نئی دلی سے دم لینے کے لئے یہاں آپڑے تھے اور پُرانے قلعے اور مقبرہ ہمایوں کے پناہ گزینوں میں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کوچہ چیلان ایک حسلب سے پناہ گزینوں کا ٹرانزٹ کیمپ (Transit Camp) بن گیا تھا۔

کچھ ممتاز مسلمان تھے جو مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دلی سے مت جاؤ۔ وہ پُرانے قلعے اور ہمایوں کے مقبرے جا جا کر بھی مسلمانوں کو سمجھاتے تھے کہ اپنے گھر واپس آؤ۔ اُن مسلمانوں کی گاندھی جی اور پنڈت نہرو تک رسائی تھی۔ بیان کیا جاتا تھا کہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو چاہتے ہیں کہ مسلمان دلی سے نہ جائیں۔ ایک روز مجھے بھی اُبھُلا اُٹھا اور میں نے چار مسلمانوں اور چار ہندوؤں کی جماعت بنائی اور جماعت کو لے کر چلا کہ لوگوں کو اطمینان دلاؤں گا اور بھاگنے سے روکوں گا۔ دریا گنج پوسٹ آفس کے پیچھے سرسید احمد روڈ پر سب سے پہلے ہمیں تانگے میں دو ہندو میاں بیوی سوار ہوتے ہوئے ملے۔ سامان رکھ چکے تھے اور خود بیٹھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا اس طرف مسلمان اگرچہ زیادہ ہیں لیکن وہ آپ کو ہرگز گزند نہیں پہنچائیں گے۔ ہندو ساتھیوں نے میری تائید کی اور ہندو میاں بیوی نے کہا مان لیا۔

آگے بڑھے تو کوچہ سعد اللہ خاں کے مسلمان آٹھ تانگے لئے کھڑے تھے۔ اُنھیں بھی منع کیا گیا اور کوچہ سعد اللہ خاں کے اندر جا کر ہدایت کر دی کہ جانے کی

www.taemeernews.com

غلطی نہ کی جائے۔

کوچہ سعد اللہ خاں سے ایک مکان کی کھڑکی کے ذریعہ کوچہ تارا چند پہنچے۔ وہاں ہندوؤں کی گھبراہٹ دور کی۔ مسلمان آبادی میں بسنے والے ہندو ابھی اپنے تئیں مسلمانوں پر غالب نہیں خیال کر رہے تھے۔

ہم کوچہ تارا چند ہی میں تھے کہ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ اُس دن کا قصہ ہے جس دن اخبار ڈان کے چھاپے خانہ میں گڑبڑ مچی تھی۔ ڈان کا چھاپہ خانہ کوچہ تارا چند کے قریب تھا۔ آگے بڑھنے کی جُرأت نہیں ہوئی۔ اُلٹے قدموں اُسی مکان کی کھڑکی کے راستے کوچہ سعد اللہ خاں لوٹے۔ مسلمانوں نے کہا۔ صاحب! آپ ہمیں روکتے ہیں اور دیکھئے سامنے چھت پر سے شیام بھون کے لڑکے چلا رہے ہیں کہ "بھاگو۔ ورنہ جان کی خیر نہیں ہے"۔

خیر ہم آٹھوں آدمی باہر نکلے اور دریا گنج کی طرف سے شیام بھون گئے اور وہاں کے بوڑھے ہندوؤں اور سکھوں سے کہہ کر لڑکوں کو چھت پر سے اُتارا۔ بوڑھے ہندوؤں اور سکھوں نے چھت پر چڑھ کر مسلمانوں کو دلاسا دیا کہ بالکل پریشان نہ ہو، شیام بھون کے لڑکے تمھیں نہیں چھیڑیں گے۔

شیام بھون کی چھت سے نیچے آئے ہی تھے جو خبر ملی کہ کوچہ تارا چند کے ہندوؤں نے کوچہ سعد اللہ خاں کے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ پھر دہی فوج اور پولیس کی امداد آئی۔ وہی مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ مکان

www.taemeernews.com

خالی کرائے گئے اور مسلمان حفاظت کی غرض سے خانہ بدر کر دیئے گئے۔ کوچہ سعداللہ کے مسلمان آٹھ آدمیوں کی پارٹی میں، بدقسمتی سے فقط مجھے جانتے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "ہم تو خلتے جا رہے تھے۔ واحدی صاحب نے جانے میں دیر کرا دی، ورنہ جو نقصان ہوا ہے وہ نہ ہوتا۔" یہ میری پہلی اور آخری مہم تھی۔ میں نے توبہ کی کہ اب کسی کو نہیں روکوں گا۔

ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ کچھ ممتاز مسلمان جن کا گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے روز ملنا ہوتا تھا گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ایما پر مسلمانوں کو دلی چھوڑنے سے منع کرتے تھے۔ لیکن ساتھ کے ساتھ جامع مسجد کے نیچے فوجی ٹرکیں بھی پہنچ جاتی تھیں اور شور مچاتی تھیں: "چلو پرانے قلعہ چلو"۔ مسلمان جان گئے تھے کہ جو مشینری ٹرکیں بھیج رہی ہے وہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کو پرے بٹھائے گی اور ایک ایک مسلمان سے دلی چھڑوائے گی۔ لہٰذا چلو۔ مسلمان ٹرکوں میں بیٹھ جاتے تھے اور صبح سے شام تک پرانے قلعہ جانے والی سڑکوں پر ٹرکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

میں نے آزادی ملنے کے بعد ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو جانے کا غلط اندازہ کیا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر میں نے یقین کر لیا کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو دلی میں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ اس یقین کے باوجود میں اپنے فیصلے پر قائم تھا کہ اکیلا دلی میں رہوں گا۔

www.taemeernews.com

۲۰ر اکتوبر سے ۲۵ر اکتوبر تک دسہرے اور عیدالاضحیٰ کی تعطیلات تھیں۔ ۱۹ر اکتوبر کو میں نے تعطیلات کے لئے راشن کے کام کا پروگرام بنایا اور اپنی ڈیوٹی لگائی کہ فلاں فلاں دن عملی نگرانی میں کروں گا اور فلاں فلاں دن مسٹر ہنس لال ایم۔ اے، اسسٹنٹ سرکل راشننگ افسر نگرانی کریں گے۔ ۱۹ر اکتوبر کی شام تک اطمینان سے تو نہیں لیکن استقلال سے دفتر میں بیٹھا۔

شام کو دفتر سے گھر پہنچا تو میونسپل کمیٹی کے ایک داروغہ صفائی نے خبر سنائی کہ ڈاکٹر فیض الحسن مفتی (میونسپل کمیٹی کے ہیلتھ افسر) زخمی کر دیئے گئے۔ دوسرے روز صبح اخباروں میں پڑھا کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے نے آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹا دیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنا فرض ادا کرنے پہاڑ گنج گئے تھے جو اس وقت مسلمان کا نام نہیں تھا۔ میں بھی جہاں بیٹھا اپنا فرض ادا کرتا تھا اور جس جگہ صبح سے شام کر دیتا تھا وہ جگہ ہندوؤں اور سکھوں سے گھری ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے ضروریات کے لئے بھی وہاں آنا بند کر دیا تھا۔ نیز مسلمان عملہ ایک ایک کر کے پاکستان جا چکا تھا۔ بس ایک انسپکٹر اور دو سب انسپکٹر مسلمان رہ گئے تھے۔ مسلمان افسر محکمہ بھر میں کوئی باقی نہیں تھا۔ تنہا میں سخت جان جما ہوا تھا۔ مجھے دکھائی دیا کہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی ہٹنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ بے آبرو ہو کر ہٹنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ جان کھو کر ہٹنا پڑے۔ لہٰذا سیدھے سیدھے ہٹ جانا چاہیئے۔ اور جب ہٹنا ہے تو بچوں کے ہمراہ چلنا چاہیئے۔

میرے عزیز سید راشد حسین مہینے ڈیڑھ مہینے سے اپنے اور میرے متعلقین
کے واسطے ہوائی جہاز کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ راشد میاں
راس مسعود کے حقیقی ماموں زاد بھائی ہیں۔ راس مسعود کے سالے مسٹر خورشید احمد
۱۹۴۷ء میں صوبہ دلی کے چیف کمشنر تھے۔ مگر ہوائی جہاز کے ٹکٹ دلوانا چیف کمشنر
کے بھی بس کا نہ تھا۔ ٹکٹ کسی طرح نہیں ملتے تھے۔

۳۰ اکتوبر کی صبح کو میں نے راشد میاں سے کہلا بھیجا کہ بھائی میرے ساڑھے
دو کی بجائے ساڑھے نو ٹکٹ خریدنا۔ اتفاق کی بات. گویا اس فیصلہ ہی کا انتظار
تھا۔ شام کو راشد میاں نے یکایک اطلاع دی کہ پورے ٹکٹوں کا انتظام ہو گیا۔
ٹیں حاضر ہیں۔ چلیے، رات شیر شاہ میس میں گزارنی ہے اور رات کے تین
بجے پالم ایرپورٹ جانا ہے۔ جلدی کیجیے نو بجے شیر شاہ میس کا دروازہ بند ہو جاتا
ہے۔

مہینے ڈیڑھ مہینے سے سامان روز بندھتا تھا اور روز کھلتا تھا۔ آج پتہ
لگا کہ پندرہ سیر فی بالغ اور ساڑھے سات سیر فی نابالغ کے حساب سے سامان جا سکے گا۔
منٹ بھر میں میں نے چند ضروری خط گھسیٹے اور چھٹی کی درخواست لکھی۔ خیال تھا
حالات سنورنے کے بعد آجاؤں گا۔ بیوی بچوں نے اُلٹا سیدھا سامان لپیٹا۔
لینا تھا وہ چھوڑا۔ جو چھوڑنا تھا وہ لیا۔ بہر حال اُس مکان پر جس میں ساٹھ
سال آرام پایا تھا اور جو ضرورت کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ حسرت کی نظر ڈالی اور

www.taemeernews.com

نو بجے سے پہلے ہی شیر شاہ میس میں جا حاضر ہوئے۔

دلی سے ہمارا قافلہ راولپنڈی گیا۔ راولپنڈی کے ٹکٹ ملے تھے۔ اور راولپنڈی سے ذریعہ ریل، براہ لاہور کراچی آیا۔ اب دلی کی بجائے کراچی وطن ہے۔ دیکھئے میرے پوتے اور پڑپوتے کون سی بولی بولتے ہیں اور کیا رہن سہن اختیار کرتے ہیں[1]۔ دلی والوں اور یوپی والوں کی زبان پر "یہ باجو اور وہ باجو" نوخاصا چڑھ گیا ہے۔ دہلویت اور لکھنویت افسانہ ہوتی جا رہی ہے۔

زندہ رہا تو دلی کی ایک دفعہ زیارت ضرور کروں گا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے مٹ کر دلی دوبارہ بسی تو اُس کی آبادی ۱۸۵۷ء سے قبل کی نسبت زیادہ تھی، مگر بزرگ ۱۸۵۷ء سے قبل کا ذکر کرتے تھے تو کہتے تھے شہر آبادی میں یہ ہوتا تھا اور شہر آبادی میں وہ ہوتا تھا۔ گویا اُن کے نزدیک شہر آباد نہیں تھا، اُجاڑ تھا۔ اب بھی دلی میں رونق روز بروز بڑھے گی۔ اب یہ بڑے بڑے مال داروں کا شہر ہوگا۔ لیکن میں اسے اپنا قبرستان سمجھ کر دیکھنے جاؤں گا۔ میری تہذیب اور میرے تمدن کا تو اب یہ شہر قبرستان ہی ہے۔

ایک صاحب ۱۸۵۷ء کے نکلے نکلے ۱۹۰۳ء میں دلی تشریف لائے۔ نابینا

---

[1] الحمد اللہ تادمِ تحریر اُردو بول رہے ہیں اور میرے گھر پر اب تک کراچی کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ کل کا حال اللہ جانے۔

www.taemeernews.com

ہو گئے تھے۔ کسی کی انگلی پکڑ کر شہر کا جائزہ لینے جاتے اور چلتے چلتے پوچھتے۔ کیا محلہ ہے۔ لوگ بتاتے حضرت میدان ہے۔ مقام وقام نہیں ہے۔ فرماتے۔ میاں کے آس پاس تو کچھ ہو گا۔ بیان کر دیا جاتا کہ فلاں عمارت ہے۔ کہتے۔ بھائی یہاں تو فلاں شخص کا مکان تھا اور فلاں نام کا بازار تھا جس میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ یہ آج میدان ہے۔ ارے کیسا پریڈ کا میدان۔ یہاں تو قلعہ کے متوسل درامرا رہتے تھے۔ خانم کا بازار کیا غائب ہو گیا۔ یہیں تو تھا۔ اور خاص بازار؟ وہ بھی نہیں رہا۔ ہائے ہائے۔ خاص بازار قلعہ اور فیض بازار (دریا گنج) کے درمیان تھا۔ اور بھائی پنجابی کٹڑہ۔ دھوبی دروازہ۔ راجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹڑہ۔ جرنیل کی بیوی کی حویلی۔ راجی داس گودام والے کے مکانات۔ صاحب رام کا باغ اور حویلی سب ندارد۔ محلے کے محلے ندارد۔

میں بھی دلی پہنچوں گا تو عظیم انقلاب پاؤں گا۔ میدانوں کی بجائے اونچی اونچی عمارتیں سہی، لیکن میری دلی نہیں ہو گی۔
جس گھر کی کنڈی کھٹکھٹاؤں گا، نوے فی صدی گھروں سے صدا آئے گی "جاؤ اس گھر میں تمہارا کوئی نہیں۔"

www.taemeernews.com

دِلّی چھوڑنے کے بعد

میں نے کراچی پہنچ کر جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک مضمون "دِلّی سے ہجرت" لکھا تھا وہ مضمون اضافہ کر کے اس کتاب میں "دلی چھوڑنے سے پہلے" کے عنوان سے درج کیا گیا ہے۔ اب دلی چھوڑنے کے بعد کی تھوڑی سی سرگذشت سناتا ہوں۔

اوروں کو ترکِ وطن کے سلسلہ میں جیسے جیسے مصائب پیش آئے ویسے مجھے پیش نہیں آئے۔ میں نے وطن میں ہنگامہ ۱۹۴۷ء کے مناظر بھی کم دیکھے تھے۔ ایک آدھ ہی منظر دیکھنے کا اثر اتنا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ میرے ترکِ وطن کی داستان بالکل سادہ ہے۔ محض اعزا و احباب کی خاطر ریکارڈ کئے دیتا ہوں۔

اللہ کی پناہ ـــ میرے منجھلے داماد حمید سلمہ کے ماموں ڈپٹی فدا ء اللہ اُس ٹرین میں تھے جس کے سارے مسافر قتل کر دیئے گئے تھے۔ فداء اللہ صاحب شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے بھتیجے ہیں اور شمس العلماء مولوی سید احمد، امام

www.taemeernews.com

جامع مسجد کے بھتیجے داماد۔ ڈپٹی کلکٹر اور کلکٹر رہ چکے ہیں۔ خدا جانے کیونکر ٹرین کا سالم ڈبہ انھیں مل گیا تھا۔ اُس میں چاروں طرف اوپر ٹرنک اور دروازوں کے آگے ٹرنک اور صندوق جما کر وہ مع متعلقین بیٹھ گئے اور ٹرنکوں اور صندوقوں کی آڑ میں بحمداللہ اس خاندان کی جان بچ گئی۔

اُس ٹرین کے قتل عام کا ڈپٹی فدا ر اللہ نقشہ کھینچتے ہیں تو دل ہلنے اور سر چکرانے لگتا ہے۔ لکھنے کے لائق مصائب وہ تھے۔ مجھے مقابلتہً نہ دلی میں تکلیف اُٹھانی پڑی، اور نہ دلی سے کراچی پہنچنے میں، اور نہ کراچی پہنچ کر۔

مجھے تو فقط دلی چھٹنے کی تکلیف ہے اور باوجود اس کے کہ اب دلی میری دلی نہیں رہی ہے آنکھیں کم از کم ایک مرتبہ اُسے دیکھنے کی متمنی ہیں[1]۔ میرے کراچی آنے کے بعد دلی کے متعدد عزیز اور دوست اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن بہت سے عزیز اور دوست ابھی وہاں ہیں جن کی طرف دل کھنچتا ہے۔

کبھی دلی کی ایسی شخصیت خیال میں آجاتی ہے جس سے واسطہ مطلق نہیں رہا اور جس کا نام تک نہیں معلوم ۔ دل اُس کے تصور سے بھی تڑپنے لگتا ہے۔ پھر بعض لوگ تو دلی میں وہ ہیں کہ جب میں کراچی میں چاند دیکھتا ہوں تو

---

[1] ۹ اپریل ۱۹۵۸ء کو پہلی دفعہ ویزا کی درخواست بھیجی تھی جو نامنظور کردی گئی۔ پھر درخواست منظور ہوئی تو ایسی سردی میں ہوئی کہ ریل راستے کی سردی اور دلی کی سردی سے ڈر گیا اور نہیں جاسکا۔ دلی میں مرنا چاہتا ہوں، لیکن خودکشی کرکے مرنا نہیں چاہتا۔

خیال ہوتا ہے کہ شاید اُن کی نظر بھی اِس وقت جاذبر ہو۔

میرے بھتیجے داماد اور خواجہ حسن نظامی کے بھتیجے مسٹر معز الدین اسسٹنٹ کول کمشنر ڈھاکہ جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ دلّی چھوڑوں گا۔ خواجہ صاحب سے کچھ کہنا ہو تو فرما دیجیے۔ میں نے کہا" خواجہ صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اور جب یہاں واپس پہنچو تو اپنی آنکھیں مجھے دکھا دینا۔ معز الدین نے میری بات کا لطف نہیں لیا، لیکن میں یہ فقرہ کہہ کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے ایسا کھویا رہا کہ میں نے اللہ سے دعا کی "یا اللہ اس کیفیت کو مستقل کر دے اور کیفیت کا رُخ اپنی اور اپنے رسول کی جانب پھیر دے" دلّی کے ساتھ مجھے مجنونانہ تعلق ہے۔ بعض اوقات تو ڈرجاتا ہوں کہ اللہ میاں خفا نہ ہو جائیں۔

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی (ایڈیٹر آستانہ و پیامِ مشرق دلّی) کراچی آئے۔ اُن سے میں نے عرض کیا کہ جامع مسجد کے صحن اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیّاؒ کے مزار کی تھوڑی سی خاک پیکٹ بنا کر بھیج دیجیے۔ شیشیوں میں بھر کر رکھوں گا۔ میرا دماغ مائل بہ دیوبندیت ہے۔ لیکن دل میں سلطان المشائخ کا مزار بسا ہوا ہے۔ مزار کا میں مجاور نہیں تھا۔ تاہم مزار کے جوار میں چالیس بیالیس سال گذار چکا ہوں۔ اور جامع مسجد

ل‍ہ یہ مضمون ۲ اگست ۱۹۵۱ء میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ختم ۱۷ جولائی ۱۹۵۶ء کو ہوا ہے۔

www.taemeernews.com

کے مینار تو میرے گھر ہیں تھے۔ گھر کی چھت سے دکھائی دیتے تھے۔
میں دلّی سے ایسا یکایک چلا تھا کہ دلّی کے کسی شخص اور دلّی کی کسی چیز سے نہیں مل سکا تھا۔ البتہ گھر کی چھت پر چڑھ کر جامع مسجد کے میناروں کو گلے لگا لیا تھا اور اپنے آقا و پیشوا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک سُنّت ادا کر دی تھی۔ حضورؐ نے ہجرت کی رات مکّے سے فرمایا تھا کہ تو مجھے ہر جگہ سے زیادہ محبوب ہے، لیکن تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ میں نے جامع مسجد سے خطاب کیا کہ تجھ سے میرا شاہجہاں کے وقت سے تعلق ہے۔ تجھے میرے باپ نے دیکھا۔ تجھے میرے دادا نے دیکھا۔ میری کئی پشتوں کی نگاہیں تجھ پر پڑی ہیں۔ میں تیری ایک ایک اینٹ اور تیرے ایک ایک پتھر میں اپنے بزرگوں کی نگاہیں پاتا ہوں اور تجھے دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں۔ یہ حالات اب تیرے زیر سایہ اور تیرے شہر میں رہنے نہیں دیتے۔ اور ممکن ہے آج کے بعد میں تجھے اور تیرے شہر کو نہ دیکھ سکوں ؎

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ لکھنے بیٹھا تھا دلّی چھوڑنے کے بعد کی روئداد۔ رونے چلا جاتا ہوں دلّی کا رونا۔ مگر کیسے نہ روؤں۔ وہ ملاحظہ فرمایئے۔ پھیری پھر کر ایک لڑکا استعمال شدہ بوتلیں اور پرانے اخبار خریدتا پھرتا

www.taemeernews.com

ہے اور آواز لگا رہا ہے "باٹلی پیپر"۔ یہ لڑکا کراچی کا نہیں ہے۔ فرخ آباد یو۔پی کا ہے۔ مگر آواز لگاتا ہے "باٹلی پیپر" صدر (بازار) میں خاص دلی کے تانگے والے پکارتے ہیں "بی ہائینڈ جیکب لائنز۔ بی ہائینڈ جیکب لائنز"
(Behind Jacob Lines) "گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر"[1] جیسی آوازیں سنتے سنتے کانوں میں اس قسم کی آوازیں آئیں تو کیسے نہ رولوں۔

---

[1] یہ آواز دلی میں جھاڑی بوٹی کے بیر بیچنے والے لگایا کرتے تھے۔ گھونگٹ والی نے توڑے ہیں بیر کے آگے ایک اور رومانی فقرہ ہوتا تھا۔ "لگ گیا کانٹا بکھر گئے بیر"۔ لگے ہاتھوں اور آوازیں بھی لکھ دوں۔ فالسوں کے لیئے آواز تھی:۔ سانولے سلونے لگا دیئے ہیں شربت کو۔ اودے اودے جوبن والے شربت کو۔ جلیبے کے لیئے:۔ ریشم کے جال میں ہلایا نگینوں بنا جلیبا کھالو۔ گنڈیریوں کے لیئے:۔ کیا معطر ہیں گنڈیریاں پونڈے کی۔ ککڑیوں کے لیئے:۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں۔ پیسے کی دو۔ کھجوروں کے لیئے:۔ شیدی گوہر کے باغ کا دانہ بنا۔ تربوز کے لیئے:۔ آباڑی کے لعل۔ لعل کا ڈلا۔ لعل کا ڈلا۔ خربوزوں کے لیئے:۔ ڈھول کوٹ کے خربوزے۔ دو ہی مزے ہیں، کھٹے یا میٹھے۔ انگوروں کے لیئے:۔ چمن کا موتیا انگور۔ اناروں کے لیئے:۔ اصلی تو ولایتی کھیڑے کا انار میوہ۔ بوٹوں کے لیئے:۔ کیا ہرے کیا پھلے دے۔ اودے جلیبے کے لیئے:۔ تیری چھاتی تر اودا اودا بنا ہے جلیبا کھالے۔ کھالے بھیلا اودا بنا ہے۔

www.taemeernews.com

آوازیں نہیں سنتا، کانوں پر ہتھوڑے بجتے ہیں۔ صدر کا یہاں تلفظ ہے۔ صدّر (Saddar) ہے۔

نہ پوچھ حال مرے گریۂ مسلسل کا
بہت قریب سے دیکھا ہے شاہ ولی کو

اچھا صاحب! سنئے۔ گھر سے شیرشاہ میں پہنچنے کا قصہ تو "دلی چھوٹنے سے پہلے" والے مضمون میں لکھا جا چکا ہے۔ گھر سے شیرشاہ میں تک کا سفر کسی نہ کسی طرح طے کیا اور شیرشاہ میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ شیرشاہ میں پاکستانی سفارت خانہ کی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷۶) جلیبا کھالے۔ آم کے لئے:۔ شرطیہ پڑ بے دانہ کھانہ کا لڈو۔ آم کی پال ہے۔ یہ پالوں والا لڈو لو۔ جامنوں کے لئے:۔ کالی بھونرالی جامنیں نون والا نگین لے۔ موتیا کے پھولوں کے لئے:۔ پھول ہیں گجراتی موتیا کے۔ لپٹیں آرہی ہیں بھی موتیا میں۔ گجک کے لئے:۔ بونٹوں سے کھالے کھجلا گجک۔ فالودہ کے لئے:۔ فالودہ ہے روزہ داروں کو۔ برف کے لئے:۔ بلور کے ٹکڑے برف۔ گولر کے لئے:۔ جھرنے کا بتاشہ گولر۔ بھٹوں کے لئے:۔ بھٹے لینا ہری ڈالیوں والے۔ کھرنیوں کے لئے: قطب صاحب کے چھینٹے ترمیوہ سے کھرنیاں کو — کچریوں کے لئے:۔ کالے بیاج کی سوندھی اور میٹھی کچریاں۔

* * *

www.taemeernews.com

مقبوضہ عمارت ہے ۔ یا تھی ۔ سفارت خانے کے بالکل سامنے ۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ پاکستان آنے والے مسافر وہاں سے ٹرکوں میں بھر بھر کر ہوائی جہازوں کے اڈے بھیجے جاتے تھے ۔ رات بھر یہ سلسلہ چلتا رہا ۔ جس کو جہاں کا ٹکٹ ملا تھا وہ وہاں کے جہاز پر پہنچا دیا جاتا تھا ۔ یہ جہاز دراصل ہمارے نہیں تھے ۔ یہ پاکستان سے ہندوؤں اور سکھوں کو دلی لاتے تھے ۔ پاکستانی سفارت خانہ نے اُن سے معاملہ کر لیا تھا کہ دلی سے خالی مت جاؤ ۔ دلی سے مسلمانوں کو لیتے جاؤ ۔ مسلمانوں سے جو چاہو کرایہ لو اور پاکستان میں جہاں چاہو اُتار دو ۔

ہمیں راولپنڈی داپس جلنے والے جہاز کے ٹکٹ دیئے گئے تھے ۔ ہم صبح چار بجے پالم ایرپورٹ روانہ ہوئے ۔ اینٹیں اور مٹی ڈھونے کے ٹرک پر ہمیں اور نہ معلوم کتنے خاندانوں کو لادا گیا ۔ عورت، مرد اور بچے اتنے تھے کہ بیٹھ نہ سکتے تھے ۔ سب کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑتے تھے ۔

از درد دست چہ گویم بچہ عنواں رفتم

سامان کا ٹرک الگ تھا ۔ اُس میں سے سامان گرتا جاتا تھا ۔ ہمارا بھی لحافوں، توشکوں اور تکیوں کا بُقچہ گر گیا ۔ ٹرک رُکوانے اور سامان اُٹھانے کی

لہ پروفیسر عبدالستار خیری کی لڑکی کو بھی ہمارے ساتھ کر دیا گیا تھا ۔ اُس کی ماں جرمن ہے ۔ اُسے انگریز سمجھ کر ڈرائیور کے پاس جگہ دے دی گئی تھی ۔

www.taemeernews.com

بھلا کون ہمت کرسکتا تھا اور شرک کیا ڈر کوانے سے رُکے جاتے تھے۔

فی مسافر پندرہ سیر وزن لیجانے کا حکم تھا۔ اس لئے ہم نے لحافوں اور توشکوں کی روئی نکال دی تھی اور غلاف رکھ لئے تھے کہ راولپنڈی میں روئی پھر والیں گے۔ اب نتیجہ گرجانے سے ہمارا سامان پندرہ سیر فی مسافر بھی نہیں رہا تھا مگر پالم ایرپورٹ کے عملہ نے ہمیں گھنٹوں دق کیا۔

جہاز میں سے سیٹیں اکھاڑ لی گئی تھیں۔ جہاز کے اندر کا منظر ٹرک ہی کا سا تھا۔ ہاں مسافر کھڑے نہیں تھے۔ تھرڈ کلاس مسافرخانوں میں جس طرح بیٹھا جاتا ہے اُس طرح بستروں اور ٹرنکوں پر بیٹھے تھے۔ نیز مسافروں کی تعداد اتنی تھی جتنی کہ جہاز سہار سکتا تھا۔

جہاز میں بیٹھ کر اطمینان نے مزید ترقی کی اور راولپنڈی میں جہاز سے اُتر کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ لیکن راولپنڈی میں جائیں کہاں، اور کس کے پاس جائیں۔ مجھے صحیح معنی میں سفر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ سفر دو چار کئے تھے مگر خواجہ حسن نظامی کے ساتھ کئے تھے۔ جن کے طفیل ہر غیر اپنا بن جایا کرتا تھا۔ اس سفر کا سربراہ میں خود تھا۔ سفر کا بے حد کچا۔ بات بات پر بڑھتا تھا ؎

غربت ہم کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

خیر تھوڑی دیر میں چند نوجوان والنٹیر آئے اور بولے۔ جہاں کہئے پہنچایا جائے۔ یا ایک دو دن ہمارے مہمان رہئے۔

www.taemeernews.com

راولپنڈی کے مسلمانوں نے مہاجرین کے قیام و طعام کا عظیم الشان انتظام کر رکھا تھا۔ والنٹیروں نے ایک ہوٹل دو بعض کمرہ ہمیں دے دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ آدھ گھنٹے قیام گاہ کی عمارت میں چکر لگایا اور انتظام کا اندازہ کیا۔ ہمدردی اور اخلاص کا دور دورہ تھا۔ کاش وہ دور ہمیشہ رہتا تو بلا تشبیہ یثرب کے مہاجرین اور انصار کا سماں بندھ جاتا۔ کہتے ہیں کُل پاکستان میں ہمدردی و اخلاص کا یہی حال تھا۔

رات راولپنڈی کی خیرات پر بسر کی۔ صبح مسٹر مظہر الحق خیری[۱] (رسالہ جام نو کراچی کے نگراں) کو خبر لگ گئی۔ وہ اُن دنوں راولپنڈی میں تھے۔ بہ اصرار گھر لے گئے۔ بقر عید میں تین چار دن باقی تھے۔ بقر عید تک ہم خیری صاحب کے ہاں رہے اور بقر عید کی نماز پڑھ کر کچوریاں مٹھائی خریدنے کی بجائے تانگے لے کر آئے۔ اور فوراً راولپنڈی سے لاہور کا سفر شروع کر دیا۔

ریلوے اسٹیشن پر بھی ہمدردی و اخلاص کا نظارہ تھا۔ ریل کے مسافر عموماً دوسرے مسافروں کو کمپارٹمنٹ میں گھسنے نہیں دیا کرتے۔ اُس دن بُلا بُلا کر بٹھایا جا رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اُن کی تواضع سے فائدہ اُٹھانے کی طاقت نہیں تھی۔ بیوی اور لڑکیاں تو زنانہ درجہ میں جا بیٹھیں۔ میں لڑکوں کو لئے ایسے

---

[۱] مسٹر مظہر الحق خیری پروفیسر عبد الستار خیری کے بھتیجے ہیں جن کی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی۔ لڑکی کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

www.taemeernews.com

کمپارٹمنٹ کی تلاش کر رہا تھا جس میں کم بھیڑ ہو۔ ایک کمپارٹمنٹ فوجیوں کے واسطے ریزرو تھا۔ فوجیوں نے مجھے ڈھونڈلتے دیکھا تو آواز دی۔ بڑے میاں! ہمارے کمپارٹمنٹ میں آجاؤ۔ تمھارے لڑکے بھی یہیں آجائیں۔ کمپارٹمنٹ میں آٹھ دس فوجی تھے۔ لاہور تک کے چھ ساڑھے چھ گھنٹے نہایت آرام سے کٹ گئے۔ لاہور اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ لاہور میں عید کل ہے۔ میں نے سوچا کہ عید کے دن راولپنڈی سے لاہور لاتے آدمی آتے تھے تو عید کے بعد لاہور سے کراچی کتنے جائیں گے۔ عید کے بعد سفر کرنا محال ہوگا۔ لہٰذا فوراً کراچی چلنا چاہیئے۔ لاہور نہیں رُکنا چاہیئے۔

رات بھر ہم لاہور کے اسٹیشن پر پڑے رہے۔ میں سیاہ رنگ کی گرم شیروانی پہنے تھا۔ اسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی سر پر تھی۔ ایک صاحب نے فرمایا۔ یہ ٹوپی اگرچہ گاندھی کیپ نہیں ہے لیکن گاندھی کیپ سے مشابہ ہے۔ آپ اسے اتار دیجئے۔ اور ننگے سر رہیئے۔ میں نے دل میں کہا ؎

ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

اور ٹوپی اتار دی۔

صبح ہوئی اور گاڑی کی روانگی کا وقت قریب آیا تو ایک قُلی سے عرض کیا۔

لہ یہ مقدر کی باتیں ہیں لاہور رہ کے، کھنستان کراچی آگئے۔ عنقریب ہم کوکریں سکوڑوں کی خوراک بنلے ہوتا۔

www.taemeernews.com

بھائی! کوئی طریقہ بتاؤ کہ ہم وصیلہ ٹکٹ کے بغیر گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ قلی نے کہا۔ گاڑی شیڈ میں تیار کھڑی ہے۔ میں وہاں لے چلتا ہوں اور سوار کرا دیتا ہوں۔ سات روپے انعام لوں گا۔ ہم نے سات روپے پیش کر دیئے اور قلی نے ہمیں خالی ڈبے میں لے جا بٹھایا۔ مگر گاڑی پلیٹ فارم پر لگی تو ہجوم نے اُس میں گھسنا شروع کیا اور میں دیوار کی اینٹ کی طرح بھنچ کر اور جم کر رہ گیا۔ جگہ سے ہلنا دیوار سے اینٹ کا نکلنا تھا۔ کھانا۔ پینا۔ پیشاب۔ پاخانہ سب بند۔ صبح سے شام ہوئی اور شام سے رات کے دو بج گئے۔

دوسروں کی حالت کا خیال کیجیے تو مجھ پر اللہ کا کرم ہی کرم تھا۔ خلقت صرف ڈبوں میں سوار نہیں تھی۔ ڈبوں کی چھتوں پر سوار تھی۔ جو زنجیریں ڈبوں کو آپس میں جوڑتی ہیں اُن پر سوار تھی اور جن سیڑھیوں پر پیر رکھ کر ڈبوں میں داخل ہوتے ہیں اُن پر کھڑی تھی اور ڈبوں کی کھڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر لٹک رہی تھی۔ العیاذ باللہ۔

رات کے دو بجے کسی نے کہا یہ ڈبہ روہڑی اسٹیشن سے کوئٹہ کی گاڑی میں جوڑا جائے گا۔ یعنی قلی نے سات روپے لے کر ہمیں جس ڈبے کے اندر بٹھایا تھا اُسے کبھی مقصود، کراچی جانا نہیں ہے۔ ترکستان کوئٹہ جانا ہے۔ میرے تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لیکن لڑکے ماشاء اللہ جوان ہیں۔ روہڑی پہنچنے سے پہلے پہلے انھوں نے ماں بہنوں اور سامان کو زنانہ درجہ میں منتقل

www.taemeernews.com

کر دیا۔ اور ریلوے گارڈ سے التجا کی کہ ہمارے بوڑھے باپ کو اپنے ساتھ بٹھا لیجیے اور کرایہ کا جو اضافہ ہوتا ہے وہ بتا دیجیے۔ نوجوان گارڈ نے بغیر ایک پیسہ لئے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور میں روہڑی سے کراچی تک بہ عافیت آگیا۔

صبح کی چلی چلی گاڑی دوسرے دن دو بجے کراچی وارد ہوئی۔ اُس زمانہ میں لاہور سے کراچی کا سفر اسی قدر دیر میں ہوتا تھا۔ لاہور سے کراچی اپنے بھانجے فرید احمد کو تار دیا تھا۔ مگر انھیں تار نہیں ملا۔ اور مجھ پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو راولپنڈی میں ہو گئی تھی کہ کہاں جائیں اور کیسے جائیں۔ سفر نہ کرنے کی عادت انسان کو بیحد کمزور بنا دیتی ہے۔ سفر ضرور کرتے رہنا چاہیئے۔ سفر نہ کرنے والوں کے حق میں سفر سقر ہے اور سفر کرتے رہنے والوں کے حق میں وسیلۂ ظفر ہے۔ بہر حال میں ملتان اور راستے بھر کی خاک میں اٹا حیران اور پریشان کھڑا تھا کہ ایک اور بھانجے تجمل حسین نے دیکھ لیا۔ وہ کراچی کے گلی کوچوں سے واقف تھے۔ دوڑ کر آئے اور انتہائی محبت سے فرید احمد کے کوارٹر پہنچا گئے۔

ایک مہینہ ہم نے فرید احمد کے ہاں قیام کیا۔ میں اس عرصہ میں کوشش کرتا رہا کہ فلیٹ کرایہ پر مل جائے اور مجتبیٰ کوشش کرتے رہے کہ اُن کے نام کوارٹر الاٹ ہو جائے۔ مجھے بڑھاپے کے باوجود چلنے پھرنے کی مشق ہے۔ میں نے مسلسل مہینہ بھر آٹھ آٹھ گھنٹے روزانہ فلیٹ ڈھونڈے۔ فلیٹ بہت خالی تھے۔ مگر جب افسرانِ متعلقہ کو بتایا جاتا تھا کہ فلاں جگہ فلاں نمبر کا فلیٹ خالی ہے تو وہ اسے میرے نام

www.taemeernews.com

بھی الاٹ کر دیتے تھے اور ایک آدھ اور شخص کے نام بھی الاٹ کر دیتے تھے۔ میں جب قبضہ لینے جاتا تھا تو فلیٹ آباد پاتا تھا۔

مہینہ بھر کے تجربہ کے بعد سمجھ میں آگیا کہ ضرورتمندوں سے فلیٹوں کی تلاش کا کام لیا جاتا ہے۔ الاٹمنٹ کے لئے بعض اور حرکتیں درکار ہیں۔ صرف تلاش کرلینا کافی نہیں ہے۔ فلیٹ اُس کا ہے جو فلیٹ پر قبضہ جما سکے اور دروازہ پر لکھ دے هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔ الاٹ کرنے والوں کا کرم ایسے ہی حضرات کے ساتھ مختص تھا۔

میں تھک کر یا ہار کر بیٹھ گیا۔ لیکن مجتبےٰ کی کوشش بارآور ہوئی۔ سرکاری کوارٹر انھیں مل گیا۔

کراچی شہر سے باہر پچاس ساٹھ کوارٹروں کی ایک بستی ہے جسے بزرٹا لائنز کہتے ہیں۔ پہلا خاندان جو بزرٹا لائنز میں آباد ہوا میرا خاندان تھا۔ مگر کہا یہ گیا کہ بزرٹا لائنز کا ایک ایک کوارٹر الاٹ کیا جاچکا ہے۔ بس ایک کوارٹر باقی ہے۔ وہ تم لے لو۔ اس کوارٹر میں چار گز لمبی اور تین گز چوڑی دو کوٹھریاں تھیں اور انہی کی مناسبت سے صحن۔ باورچی خانہ۔ غسل خانہ۔ پاخانہ تھا۔ مجھے یاد آیا۔ دلّی کے ہنگامے سے قبل میں منصوبے بنایا کرتا تھا کہ بیوی بچے مجتبےٰ کے ساتھ کراچی جارہے ہیں، میں نو کمروں کو (جو دلّی کے مکان میں تھے) یوں استعمال کروں گا کہ ایک کو مطالعہ کا کمرہ رکھوں گا۔ ایک کو کھانے کا۔ ایک کو سونے کا۔

www.taemeernews.com

فلاں فلاں کمروں میں دفتر رہے گا اور فلاں صرف ملنے جلنے کا کمرہ ہوگا۔ اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھے مکان میں رہنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ اب بزرٹالامٹر کا کوارٹر دیکھ کر اسکیم بنانی پڑی کہ دونوں کمروں یا کوٹھریوں میں ہم سب لیٹیں کیونکر۔ ماشاءاللہ خاندان بڑا ہے۔

دلّی سے روانگی کا ارادہ ابھی زیرِ غور تھا کہ ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین[۱] (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور مسٹر عباسی (اکزکٹو انجنیر) آ گئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب! آپ گاندھی جی وغیرہ کے ہاں روز جاتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ ہم پاکستان چلے جائیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ایک دوزخ سے نکل کر دوسری دوزخ میں جا پڑیے گا۔ دلّی چھوڑنے کے بعد قدم قدم پر ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ فقرہ کانوں میں گونجتا تھا۔ بزرٹالامٹر کے کوارٹر نے خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا کا یقین دلا دیا کہ دوزخ عارضی نہیں ہے، مستقل ہے۔

ایک طرف مکان کی اذیت تھی، دوسری طرف پیسے کی قلت۔ قلت کیا۔ پیسہ قطعی مفقود تھا۔ بس مجتبیٰ کی معمولی سی تنخواہ۔ میرے منجھلے لڑکے سید علی مقتدیٰ واحدی دلّی میں ایم۔ اے پرویس کر چکے تھے اور ایم۔ اے فائنل کا امتحان دینے والے تھے۔ اُن سے کہا۔ بھائی! اب تم بھی نوکری کرو۔ اور میں بھی کسی

---

[۱] ڈاکٹر صاحب آجکل بہار کے گورنر ہیں (۱۹۵۸ء)

www.taemeernews.com

اخبار کو پکڑتا ہوں۔ چنانچہ مقتدیٰ نے کلرکی اختیار کی۔ اور مجھے مسٹر عثمان آزاد نے اپنے روزنامہ انجام کی مینجری پر متعین کر دیا۔ مینجری کیا تھی۔ عثمان آزاد صاحب کو مجھ پر ترس آگیا تھا۔ ورنہ اُس وقت میرا دماغ مینجری یا ایڈیٹری کے لایق کہاں تھا۔

ترس کے لفظ سے ذہن منتقل ہو رہا ہے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر اخبار ریاست کی جانب۔ سردار صاحب "ریاست" میں میرے منجن کا اشتہار چھاپا کرتے تھے[1]۔ مقتدیٰ کو کہیں ریاست مل گیا۔ اُس میں منجن کا اشتہار موجود تھا۔ پتہ وہی۔ "کوچہ چیلان۔ دہلی"۔ مقتدیٰ نے سردار صاحب کو لکھا۔ "ہم تو کراچی میں ہیں"۔ سردار صاحب نے جواب دیا۔

"عزیزم! تمھارا خط جس وقت پہنچا ہے اُس وقت بھتیجا احسان الحق صاحب دفتر ریاست میں تشریف فرما تھے۔ وہ بھی رونے لگے اور میں بھی رونے لگا۔"

پھر سردار صاحب نے چار صفحوں میں میرے دلی چھوڑنے کا نوحہ کیا اور آخر میں لکھا:۔

تمھارے ابا کے تھوڑے سے روپے میرے ذمہ ہیں۔ کراچی کے

---

[1] اب بھی چھاپتے ہیں۔

www.taemeernews.com

فلاں نیوز پیپر ایجنٹ کو یہ خط دکھادو اور کہو کہ جب تک منع نہ کیا جائے
ریاست کا روپیہ تمھیں دیتا رہے۔"

روپیہ وروپیہ سردار صاحب کے ذمہ نہیں تھا۔ بہر حال کئی بیتے سردار صاحب سے امداد لی۔

دو محسن اور ہیں۔ قلم کا تقاضا ہے کہ اُن کا ذکر کر کے آگے بڑھنا۔ ایک پنڈت تیلورام، اکاؤنٹس افسر، ریلوے کلیئرنگ آفس، دلی اور دوسرے خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن، او، بی، ای، سابق پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی، دلی۔

پنڈت جی کو میں نے کراچی سے لکھا کہ مسٹر سیٹھ، کنٹرولر آف راشننگ، دلی سے کہہ کر میری واجب الادا تنخواہ بھجوا دیجیے۔ میں دلی آنا چاہتا ہوں۔ کرایہ وغیرہ کے لئے روپے نہیں ہیں۔ مسٹر سیٹھ نے پنڈت جی سے فرمایا کہ گزیٹڈ افسران کی تنخواہ کا کاغذ راشننگ کے دفتر میں تیار نہیں ہوتا۔ اے۔ جی۔ سی۔ آر کا دفتر تیار کرتا ہے۔ میں وہاں تاکید کراؤں گا کہ جلد تیار کر دیا جائے۔ پنڈت جی نے میری گزارش کی تعمیل میں دیر لگتی دیکھی تو خود دو نوٹ، سو سو روپے کے، معمولی لفافے میں بند کئے اور مجھے بھیج دیئے۔ اللہ کی شان ہے وہ لفافہ پہنچ گیا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں رجسٹریاں اور بیمے نہیں پہنچتے تھے۔ پنڈت جی نے میرے لئے اپنے دو سو روپوں کو خطرہ میں ڈال دیا۔ خیر میرے منجھلے داماد حمید شاہ دلی میں تھے۔ میں نے اُن سے پنڈت جی کے روپے ادا کرائے۔ کیونکہ دل اِس ہرگز باؤ

www.taemeernews.com

نہ ہوا کہ بیوی بچے یہاں تکلیف کی زندگی گزاریں اور میں دلی میں جا براجوں۔ ریٹسنگ افسری کی تنخواہ اور چلتے ہوئے کاروبار کی آمدنی مجھے دلی نہ کھینچ سکی۔

حمید شاہ کو میں روانگی کے وقت سیونگ بینک کی کتابیں اور روپیہ نکالنے کے فارم دستخط کر کے دے آیا تھا۔ حمید شاہ نے مطلع کیا کہ ڈاک خانہ ٹالم ٹول کر رہا ہے۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن اس وقت تک دلی میونسپل کمیٹی کے صدر تھے۔ مگر کراچی آتے رہتے تھے۔ انھوں نے میرے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھے۔ پوچھا، روپے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ روپیہ جتنا درکار ہو مجھ سے لے لیجیے میں نے کہا۔ آپ بس اتنا کیجیے کہ آپ کے دلی جائیے تو حمید شاہ کو سیونگ بینک سے روپے دلوا دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے دلی میونسپل کمیٹی کے کسی ہندو کلرک کو ڈاک خانہ بھیجا اور وہ ایک ہی پھیرے میں پانچ ہزار روپے لے آیا۔ خان بہادر صاحب نے کراچی ٹیلیفون کر دیا اور ان کے بھتیجے شیخ شفیع احمد پانچ ہزار روپے دے گئے۔

یہ ساری داستان ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۷ء کے درمیان کی ہے۔ روپیہ آتے ہی میں نے روزنامہ انجام سے استعفیٰ دے دیا اور ۱ر جنوری ۱۹۴۸ء کو نظام المشائخ شائع کر دیا۔

نظام المشائخ نے جولائی ۱۹۰۹ء سے اکتوبر ۱۹۴۷ء تک کبھی ناغہ نہیں کی تھی۔ اور جیسا تیسا جنوری ۱۹۴۸ء کے بعد بھی ہر مہینے نکل رہا ہے۔ فقط نومبر

www.taemeernews.com

اور دسمبر ۱۹۴۷ء کے دو پرچے نہیں نکل سکے۔

کچھ روپیہ ایک اور بینک میں تھا۔ خان بہادر صاحب نے اسے بھی وصول کرایا۔ پھر خان بہادر صاحب کراچی آ گئے تو میری خاطر ماہنامہ فردوس جاری کیا۔ نو مہینے پانچ سو ساڑھے پانچ سو روپے ماہوار فردوس پر خرچ کرتے رہے۔ اور اور روپیہ خرچ کرتے رہتے۔ مگر میں نے زبردستی فردوس کی اشاعت روک دی۔ کہاں تک احسان اٹھائے جاتا۔ کاروبار چلانے کی قابلیت میری سلب ہو چکی تھی۔

تھوڑا سا قصہ کوارٹر کا اور سن لیجیے۔ میں تو دفتر انجام میں تھا۔ میرے پیچھے میرے بھانجے فرید احمد آئے اور کوارٹر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ فرید احمد ماشاء اللہ اب تو اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ اس وقت مسٹر چندریگر (وزیر) کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ وزیر کا پرسنل اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے اُن کی پہنچ بڑے بڑے افسروں تک ۱۹۴۸ء میں بھی تھی۔ اُنھوں نے افسروں سے کہہ کر طے کرالیا کہ بزرٹا لائنز کے دوسرے کوارٹر سے بھتیجے کا کوارٹر بدلا جا سکتا ہے۔

بزرٹا لائنز میں چھوٹے بڑے کئی کوارٹر ابھی یونہی پڑے تھے۔ وہ تو الاٹ کرنے والوں نے خواہ مخواہ کہہ دیا تھا کہ سب الاٹ ہو چکے۔ لیکن میرا حوصلہ دو تین مہینوں کے جھٹکوں نے اس قدر پست کر رکھا تھا کہ زیادہ بڑا

www.taemeernews.com

کوارٹر نہ مانگ سکا۔ جس درجہ کے کوارٹر کے مجتبےٰ مستحق تھے اُس درجہ کا کوارٹر نہیں مانگا۔ مذکورہ کوارٹر سے کچھ بڑا کوارٹر مانگ لیا اور اُسے مسلسل پانچ برس تک پہلے کوارٹر کے مقابلہ میں محل سمجھتا رہا۔

انسان احساس برتری میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور احساس کمتری میں بھی۔ مجھے دو تین مہینوں کے تجربوں نے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا کہ میں بہتر مکان کا مستحق نہیں ہوں۔ حالانکہ مجتبےٰ مستحق کئی گنے بڑے مکان کے تھے۔ چنانچہ اب ایک عرصے سے کئی گنے بڑے مکان میں ہیں۔ جیکب لائنز کا کوارٹر بزرٹا لائنز کے کوارٹر سے کئی گنا بڑا ہے۔[1]

اقبال عشق نے دیئے سب خم مرے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

انقلاب ۱۹۴۷ء کا ایک اثر مجھ پر اچھا ہوا۔ پڑھنے لکھنے کی فرصت میسر آگئی[2]۔ دلّی میں متعدد مشاغل تھے۔ کراچی میں پڑھنے لکھنے کے علاوہ کوئی شغل نہیں ہے۔ بڑے دو لڑکے مجتبےٰ اور مقتدےٰ بفضلہ تعالیٰ ملازم ہیں۔

---

[1] میرا اپنا مکان بدتر بھی یہاں کوئی نہیں ہے۔ بچّوں کے مکان کو اپنا کہہ رہا ہوں۔ [2] فرصت تو ہے لیکن، کتابوں کا اتنا انبار جمع ہو چکا ہے کہ مکان اس کے لئے تنگ پڑا جاتا ہے۔ شاید آئندہ اور کچھ نہ لکھ سکوں۔ کیونکہ عادت یہ ہے کہ لکھا ہوا ساتھ کے ساتھ چھپتا جائے۔ چھپے نہیں تو لکھا نہیں جاتا اور چھپے تو انبار کو کہاں جگہ دوں۔

www.taemeernews.com

تیسرا موٹی رضا پڑھتا بھی ہے اور منجن و سُرمہ کو بھی اُس نے سنبھال لیا ہے۔ چوتھا بیٹا رضا پڑھتا ہے اور موٹے رضا کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ منجن اور سُرمے سے مجھے سروکار نہیں رہا۔ کتابیں بھی بچے ہی شایع کرتے ہیں۔ میں تو صرف نظام المشایخ کی قبر کا مجاور ہوں یا نظام المشایخ کی لاش لیے بیٹھا ہوں۔ تین بھائی کماتے ہیں اور چوتھے بھائی کو اور بہنوں کو پڑھواتے ہیں اور گھر کا سارا خرچ چلاتے ہیں۔

کراچی کی نسبت شہرت ہے کہ یہاں آکر لوگوں کے خون سفید ہو جاتے ہیں۔ میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کراچی کی آب و ہوا انسان کی اندرونی کیفیت کو باہر کھینچ لاتی ہے۔ جس طرح شرابی اپنی اندرونی کیفیت نہیں چھپا سکتا۔ اسی طرح کراچی کی آب و ہوا اندرونی کیفیت کو چھپا نہیں رہنے دیتی۔ بُرے زیادہ بُرے ہو جاتے ہیں اور اچھے زیادہ اچھے ہو جاتے ہیں۔ کم از کم مجھے اپنے گھر میں اور اپنے احباب میں کسی کا خون سفید دکھائی نہیں دیتا۔

دلی میں مشاغل اس نوعیت کے تھے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی گھیرے رکھتا تھا۔ لیکن واقعتہً وہ زندگی میری طبیعت کے مطابق نہیں تھی۔ کراچی میں جو زندگی حاصل ہو گئی ہے اسے طبیعت دلی میں ڈھونڈا کرتی تھی۔ پیر سے ہفتہ تک پورا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اگرچہ

www.taemeernews.com

آنکھیں جواب دے رہی ہیں۔ پانی اُترنے لگا ہے۔ مگر میں آنکھوں سے کام لئے جاتا ہوں۔ اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ کبھی کبھار حضرت مولانا محمد ایوب (میرے استاد)، شیخ شجاع الحق (سابق صدر مسلم لیگ صوبہ دلّی) پروفیسر ضیاء الاسلام (حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے داماد) ۔حاجی محمد یونس (مولانا احمد سعید کے بھتیجے)، عاشق رسول محمد اشرف خاںؒ ۔ رسالدار میجر حاجی کامیاب خاں۔ لطیف الرحمٰن صدیقی۔ عبدالرحیم حسن ہر نظامی۔ عبدالرشید غزالی حکیم امتیاز الحق اور قاضی مبشر العابدین وغیرہ آجاتے ہیں۔

اتوار خان بہادر حبیب الرحمٰن کے ساتھ گزرتا ہے تیئیس چوبیس سال سے یہ وضع ہے، جیسے خان بہادر صاحب یہاں دلّی کی طرح نباہ رہے ہیں۔ اُن کے ہاں پاکستان کے مشہور و معروف مقرر مولانا احتشام الحق حاجی شیخ محمد خلیل سورت والے۔ نواب قمر الاسلام اور حاجی محمد شفیع سے مل لیتا ہوں۔

خان بہادر حبیب الرحمٰن یورپ وغیرہ چلے جاتے ہیں تو مولانا محمد ایوب صاحب انوار کے اتوار جناب اسد ملتانی کے بنگلہ میں، یا ایک کوچے میں اُن کے مکان پر تقریر فرمایا کرتے ہیں۔ وہاں حاضری دیتا ہوں۔ دلّی میں تیس سال مولانا سے استفادہ کیا ہے، دلّی میں اتوار کے اتوار مولانا کی تقریر میرے ہاں ہوتی تھی۔

---

[1] افسوس اشرف خاں صاحب کا ۷ ر نومبر ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوگیا۔ واقعی عاشق رسول تھے۔

www.taemeernews.com

پندرھویں دن بھتیا احسان الحق کے ہاں جاتا ہوں۔ وہاں مختاری عباس حسین اور مولانا ابوالکمال ماہر آجاتے ہیں۔ بھتیا کی بینائی جاتی رہی ہے۔ دوسرے تیسرے بیٹے حکیم محمد سعید، مالک ہمدرد دواخانہ، کراچی یاد کر لیتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ یہ ہے دلی چھٹنے کے بعد میرے تعلقات کی دُنیا۔ نئے تعلقات پیدا نہیں کئے۔ قدیم اور محدود تعلقات ہی نبھ جائیں تو غنیمت ہے۔

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم
جھٹکے دے کر تار توڑے جا رہے ہیں ساز کے

دو حضرات اور ہیں، جن سے دلی میں بھی راہ و رسم تھی، مگر کراچی کی آب و ہوا نے اُن کی شرافت کو زیادہ اُبھار دیا تھا اور راہ و رسم میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک مولوی شمس الاسلام، سابق ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن بیورو۔ وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ دوسرے آغا محمد اشرف، نبیرہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد۔ اُن کا یو۔ این۔ او کے چیف آف پبلک انفرمیشن کی حیثیت سے نیویارک (امریکہ) تبادلہ ہو گیا۔ کراچی میں یو۔ این۔ او کی طرف سے ڈائرکٹر آف انفارمیشن برائے پاکستان تھے۔

---

www.taemeernews.com

دلّی کی اہمیت

پاکستان آنے کے بعد میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو دلی میں صرف پانچ سات سال سے مقیم تھے۔ وطن اُن کا کہیں اور تھا۔ لیکن پاکستان چلے تو اپنے وطن کی بجائے دلی سے چلے۔ اب وہ کبھی ذکر کرتے ہیں تو دلی کا کرتے ہیں۔ اصل وطن انھیں یاد نہیں آتا اور دلی کی یاد اُنھیں تڑپا دیتی ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ دلی کے آگے انسان اپنا وطن بھول جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو بھی سواد رومۃ الکبریٰ میں یاد آئی تو دلی یاد آئی۔

دِلی والے دِلی سے تعلق رکھیں تو تعجب کی بات نہیں۔ دلی والوں کا سب کچھ دِلی میں ہے۔ انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے اور پلتا بڑھتا ہے اُس جگہ سے محبت کیا ہی کرتا ہے۔ مگر یہ دلی کی خصوصیت ہے کہ دلی باہر والوں کو بھی عزیز ہے۔ اُسے ہر باہر والا اپناتا ہے اور اپنا وطن سمجھتا ہے۔ دلی ہر ہندوستانی اور پاکستانی کا مرکزی وطن ہے۔

www.taemeernews.com

دلی جب سے دلی بنی، راجاؤں اور بادشاہوں کی راج دھانی رہی اور ہمیشہ راجاؤں اور بادشاہوں کے مقرب اور متوسل دلی میں بس گئے۔ اس لئے ہمیشہ سارے ملک کی نگاہیں دلی کی طرف اٹھتی رہیں اور دلی کی طرف کھنچتی رہیں۔ کوئی تو مرکز ہونا چاہیئے۔ نگاہوں کو کسی طرف تو اٹھنا اور کھنچنا چاہیئے اور راجاؤں اور بادشاہوں کے شہر کے سوا مرکزی مقام اور کون سا ہو سکتا ہے۔

راجاؤں اور بادشاہوں میں محض سیاسی کشش نہیں ہوتی تھی۔ دوسری کششیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اہل فن ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اہل علم ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اہل عرفان ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

آگرہ چند روز دارالسلطنت رہا تھا۔ دلی سے حضرت شیخ عبدالحق محدث کے فرزند شیخ نورالحق آگرہ پہنچ گئے تھے اور سرہند سے حضرت مجدد الف ثانیؒ آگرہ آ گئے تھے۔

دلی دارالسلطنت نہ ہوتا تو حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کو دلی کی خلافت کیوں دیتے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان بھی دلی کا نہیں تھا مگر دلی میں بس گیا تھا۔

غرضکہ دلی کے قدیم باشندوں نے اور دلی میں ایسے ایسے منتخب روزگار بزرگوں نے بس کر، اور دلی کے ہندو مسلمانوں نے سر جوڑ کر ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک

www.taemeernews.com

معاشرت، ایک زبان اور ایک ادا دلی میں نمودار کردی تھی۔ دور والے اس کا اثر لیتے تھے اور قریب والے اس کے اثر میں رنگے جاتے تھے۔

دلی کا رنگ آگرہ پہنچا اور لکھنؤ پہنچا اور سارے اودھ میں پھیل گیا۔ بہار پہنچا۔ ڈھاکہ پہنچا۔ حیدرآباد، دکن پہنچا۔ اور جہاں راجائیت اور بادشاہت گئی وہاں پہنچا۔ اب پنجاب اور پورے مغربی پاکستان کی سمت اس کا رخ ہے۔ اور اب یہ دلی ہی کا نہیں سارے بھارت اور پاکستان کا رنگ ہے۔ دلی میں دلی کا مخصوص رنگ مٹ گیا۔ لیکن دلی کا پھیلا ہوا رنگ مٹائے نہیں مٹتا۔

مسلمانوں سے، خصوصاً مغلوں سے پہلے ہمارے معاشرہ کا جو حال ہوگا وہ بھی خوب ہوگا۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں ہے۔ ہمیں قدرتاً لگاؤ اس معاشرہ سے ہے جو ہم نے دیکھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد وہ ہمیں ورثہ میں ملا تھا۔ ہم نے اسے اس کے مکمل ہونے پر دیکھا۔ اور پھر اسے آہستہ آہستہ ہلکا پڑتے اور بالآخر دلی سے نابود ہوتے بھی دیکھا۔

۱۹۱۱ء میں دلی انگریزوں کی راجدھانی بنی اور پرانا رنگ اترنا اور نیا رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ اور ۱۹۴۷ء میں دلی کی دنیا بدل گئی۔ دلی دلی نہ رہی۔

دلی کو آج بھی مرکزیت حاصل ہے۔ دلی آئندہ بھی تہذیب، تمدن، زبان اور اداؤں میں بھارت کی رہنمائی کرے گی۔ مگر ہمارے لئے اس میں جاذبیت نہیں رہی۔ ہم اپنی دلی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس دلی سے جسے ہم اپنا کہتے تھے ۱۹۴۷ء کے

www.taemeernews.com

بعد ہم نے دلی کو دوبارہ پالیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم کیا وزیر اعظم بھارت پنڈت جواہر لال نہرو اُسے نہ پا سکے، جو الٰہ آباد (یو۔ پی) کے رہنے والے ہیں اور جن کے نانا نہر سعادت خاں (دہلی) کے کنارے رہتے تھے اور اسی لئے خاندان نہرو، نہرو کہلاتا ہے۔

اب ہم یہی کر سکتے ہیں کہ دلی کی تصویر محفوظ کر دیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں اُس تصویر سے تھوڑا بہت اندازہ لگا لیں کہ ہماری دلی کیا تھی۔ ورنہ آنے والی نسلیں نہیں، آج کل کے بچے بھی دلی کو نہیں جانیں گے۔ لکھنؤ کو نہیں جانیں گے۔ آگرہ کو نہیں جانیں گے۔ الٰہ آباد اور حیدر آباد کو نہیں جانیں گے۔

مغربی سیاست نے مشرق کی ایک تہذیب اور مشرق کے ایک تمدن کو ختم کر دیا۔ تاریخ میں بعض کتب خانوں کے جلائے جانے کا ذکر پڑھا ہے۔ مگر کسی اچھی تہذیب اور اچھے تمدن کو ختم کر دینا کتب خانوں کے جلانے سے بھی عظیم تر ظلم ہے۔ وحشی پن ہے۔

تو اِدھر اُدھر کی نہ بات کر، یہ بتا وہ دلی کہاں گئی
تری رہبری کا سوال ہے مجھے راہزن سے غرض نہیں

* * *

www.taemeernews.com

دِلّی کے نو زخم

اِس دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے کہ آج جہاں بہار ہے کل وہاں خزاں چھا گئی اور کل جہاں خزاں تھی وہاں آج بہار کا دور دورہ ہوگیا۔ دُنیا کی تاریخ انقلابوں سے بھری پڑی ہے۔ شاید ہی کوئی صدی ایسی ملے گی جس میں اس حوادث آباد عالم کی کسی نہ کسی جگہ، کسی نہ کسی طرح کا انقلاب برپا نہ ہوا ہو۔ دنیا کا ایک گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں نے تغیرات اور انقلابات کی منازل طے نہیں کیں۔ زمین کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا جہاں ہمارے پیر ٹکے ہوں، غور کیجیے تو تغیر و انقلاب کی ایک داستان اُس کے نیچے دبی ملے گی۔ اسی حالتِ انقلاب کی طرف عمر خیام نے اشارہ کیا ہے ؎

خارے کہ بہ زیرِ پائے حیوانے ست | زلفِ صنمے و ابروئے جانانے ست
ہر خشت کہ بر کنگرہ ایوانے ست | انگشتِ وزیر و سرِ سلطانے ست

www.taemeernews.com

ایک اور رباعی میں عمر خیام کہتا ہے ؎

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودست
دربند سر زلف نگارے بودست

ایں دستہ کہ در گردن وے می بینم
دستے ست کہ در گردن یارے بودست

نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں ؎

ایک دن اک استخواں اوپر پڑا میرا جو پاؤں
کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھ کو اُس دم دھیان تھے

پاؤں پڑتے ہی غرض اُس استخواں نے آہ کی
اور کہا غافل کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے

ایسی بے دردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر
او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

میر تقی دہلوی ارشاد کرتے ہیں ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

یہ شاعرانہ خیالات نہیں ہیں۔ زندہ حقیقتیں ہیں۔ دُنیا کا ذرّہ ذرّہ تغیّر و انقلاب کی طویل داستانیں اپنے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ انسان۔حیوان۔جمادات۔نباتات۔زمین۔آسمان کوئی تغیّر و انقلاب سے نہیں بچا۔اللہ کی ذات کے سوا ہر شے متغیّر و منقلب ہے۔

www.taemeernews.com

انسان بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہی خوبصورت چہرے جن سے نگاہ ہٹانے کو جی نہ چاہتا تھا کریہہ منظر بن جاتے ہیں۔ آنکھوں کو طراوت دینے والے ہرے ہرے درخت، ایک وقت آتا ہے کہ اُن کا وجود آنکھوں کو کھٹکنے لگتا ہے اور اُنھیں کاٹ پھینکا جاتا ہے۔ تمام حیوانات کا بھی یہی حال ہے اور تمام جمادات کا بھی یہی حال ہے۔ جن ہیرے جواہرات کو آج آپ نے سر پر چڑھا رکھا ہے کون جانتا ہے کہ کل اُن کی قیمت کیا اُٹھے گی۔ دیکھئے نا، سونے نے فولاد سے مات کھائی

زمینوں کے ساتھ بھی عروج و زوال لگا ہوا ہے۔ بعض زمینیں مردم خیز کہی جاتی ہیں۔ ایک عرصہ تک اُن کی یہ تعریف اور شہرت رہتی ہے۔ پھر جاتی رہتی ہے۔ بعض زمینوں کو اس بات کا امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ اُس پر دولت مند بکثرت بستے ہیں۔ یہ امتیاز بھی مدام نہیں رہتا۔

دلی یا دہلی ایسی جگہ ہے کہ اُس کے میلوں اِدھر اور میلوں اُدھر کی زمین پر دُنیا بھر کی زمینیں رشک کر سکتی ہیں۔ دلی یا دلیوں کی زمین نے جو کچھ دیکھا اور جتنے عرصے دیکھا دُنیا کی کوئی زمین اس اعتبار سے دلی کی زمین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دلی کا نام پہلے اندر پرست یا اندر پت[1] تھا۔ اِندر ایک دیوتا

---

[1] مشہور ہے کہ پانچ پت آباد ہوئے تھے۔ (۱) پانی پت (۲) سونی پت۔ (باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

قسم کے راجہ کا نام ہے - اور پرست کہتے ہیں (سنسکرت میں) دونوں ہاتھوں کے ملے ہوئے لپوں کو - ہندوؤں کا بیان ہے کہ دلی میں اندر راجہ لپیں بھر بھر کر موتیوں کا دان کیا کرتا تھا - اس لئے یہ شہر اندرپرست مشہور ہوگیا - اور پت کے معنی ہیں مالک اور حاکم کے - اندرپت یعنی وہ شہر جس کا مالک ہندوؤں کے عقیدے میں اندر ہے -

اندرپرست یا اندرپت چاندنی چوک میں دریبہ کے سامنے جو خونی دروازہ ہے، اُس دروازہ سے لے کر پرانے قلعہ تک واقع تھا - بعد میں راجہ دیلو یا دہلو کے نام پر اس شہر کا نام دلی یا دہلی پڑ گیا - یہ نام اب تک قایم ہے -

جب سے یہ شہر آباد ہوا ہے اِسے دار الحکومت رہنے کا شرف حاصل ہے - درمیان میں یہ شہر اپنی جگہ اس طرح ادلتا بدلتا رہا جس طرح دریا اپنی جگہ بدل دیتا ہے - شاہجہاں نے دلی بسائی تو پھر اندرپرست کی بہت سی زمین کو شامل کر لیا اور جو زمین اندرپرست کی بچ رہی وہ پرانی دلی کہلانے لگی - مگر ۱۹۱۱ء سے شاہجہاں کی دلی پرانی دلی ہوگئی اور نئی دلی نئی دلی -

خیر، تو عرض کرنا یہ ہے کہ ایسی زمین جو اتنے طویل عرصے سے صرف

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۰) (۳) ماریت (۴) باگ پت یعنی باغپت - پانچویں پت کا کوئی نام نہیں لیتا - غالباً اندرپت ہی پانچواں پت ہوگا،

www.taemeernews.com

آباد نہیں ہے، دارالحکومت بھی ہے، اور جس کی خاک سے ایسے ایسے لوگ اُٹھے کہ دنیاوی اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے اور دینی اعتبار سے بھی مقبول ہیں، اُس زمین کا بنتے رہنا اور بگڑتے رہنا تو نئی دلی کی شان وشوکت اور نئی دلی کے قریب کے کھنڈرات سے ہویدا ہے۔ کل کی بات ہے کہ جہاں اب نئی دلی ہے یہاں کھنڈرات اور چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر یہ شاید بہتوں کو معلوم نہ ہوگا کہ دلی نے ایک دفعہ نہیں پورے آٹھ دفعہ دارالحکومت نہ رہنے کا صدمہ برداشت کیا ہے۔ آٹھ دفعہ دلی کا سہاگ لُٹا ہے۔ دلی کے یہ آٹھ زخم تاریخ میں مذکور ہیں۔ دلی کی توڑ پھوڑ نہیں کی جاتی تھی۔ صرف دارالحکومت دلی کو نہیں رکھا جاتا تھا۔

پہلا زخم تو وہ تھا جس سے دلی یا اندرپرست کے وجود کا پتہ چلتا ہے کہ راجہ یدھشٹر نے راجہ دریودھن پر فتح پائی اور دلی چھوڑ کر ہستناپور میں جا راج کیا۔ اس واقعہ سے پہلے دلی کا نام کہیں نہیں ملتا۔ ہستناپور راجہ یدھشٹر کی نسل میں سات پشتوں تک دارالحکومت رہا۔ آخر نمی عرف راجہ ڈشٹ دان کے عہد میں گنگا ایسے زور سے چڑھی کہ ہستناپور بہہ گیا اور نمی عرف راجہ ڈشٹ دان کو دلی آنا پڑا۔

دوسرا زخم جب لگا جب راجہ بکرماجیت والیٔ اُجین نے راجہ بھگونت کو ہی کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کر لیا مگر دارالحکومت اُجین

www.taemeernews.com

ہی کو رکھا۔ دلّی میں راجہ بکرما جیت کی طرف سے صوبہ دار رہتا تھا۔ جوگیوں کا راج ہوا تو اُنھوں نے دلّی کو دوبارہ دارالحکومت بنایا۔

تیسری مرتبہ دلّی رائے پتھورا کے زمانے میں اس امتیاز سے محروم ہوئی۔ رائے پتھورا نے اجمیر کو دارالحکومت قرار دیا اور اپنے بھائی کھانڈے راؤ کو دلّی کا صوبہ دار مقرر کیا۔

چوتھا موقع وہ تھا جب ۱۱۹۱ء میں سلطان شہاب الدین نے دلّی فتح کی اور قطب الدین ایبک اُس کے صوبہ دار کی حیثیت سے دلّی میں رہنے لگا۔ شہاب الدین خود غزنی چلا گیا۔

پانچواں موقع وہ تھا جب ۱۳۳۶ء میں سلطان محمد تغلق کو خیال آیا کہ دارالحکومت ایسے مقام پر ہونا چاہیئے جو ممالک محروسہ کے بالکل وسط میں ہو۔ سلطان محمد تغلق نے دیوگری کو دارالحکومت بنایا اور دولت آباد اُس کا نام رکھا۔ سلطان محمد تغلق نے دلّی والوں کو حکم دیا کہ سب دلّی خالی کر کے دولت آباد میں آباد ہوں۔ اس حکم کی اتنی سختی سے تعمیل کرائی گئی کہ دلّی واقعی خالی ہوگئی۔ دلّی میں جنگلی جانور آ بسے۔ آدمی کا نام نہ رہا۔

پانچ سال بعد دلّی کی تقدیر پھر جاگی۔ ۱۳۴۱ء میں اعلان کیا گیا کہ جس کا جی چاہے دلّی جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

چھٹا موقع وہ تھا جب سلطان سکندر لودھی نے آگرہ کو دارالحکومت بنالیا

ساتویں دفعہ جلال الدین محمد اکبر نے دلّی چھوڑی اور آگرہ چلا گیا اور آگرہ کا نام اکبرآباد رکھا۔ جہانگیر بھی اکبرآباد ہی میں رہا۔ لیکن شاہجہاں نے دلّی پر نظرِ عنایت فرمائی اور شاہجہان آباد کے نام سے اس قطعۂ زمین کو غیر معمولی رونق بخشی۔

آٹھویں دفعہ جارج سوم کے عہد یعنی ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دلّی فتح کی تو دلّی برائے نام دارالحکومت رہ گئی۔ جس طرح سلطان شہاب الدین غزنی میں بیٹھا ہندوستان پر حکومت کرتا تھا اسی طرح شاہ جارج سوم لندن میں بیٹھا (ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کرکے) حکومت کرتا رہا۔ پھر جب انگریزوں کا پورا تسلط ہوگیا تو کلکتہ دارالحکومت قرار پایا۔ مگر ۱۹۱۱ء سے انگریزوں نے بھی دلّی کو دارالحکومت بنالیا اور نئی دلّی آباد کی۔

کوئی مکان گر پڑتا ہے، یا گرادیا جاتا ہے تو اُس کی جگہ عموماً اُس سے بہتر مکان بنا کرتا ہے۔ دلّی بھی اُجڑ اُجڑ کر ہمیشہ پہلے سے بہتر بنی۔ دلّی کے زخموں پر "جو رجرّاح بہ زہر بیدر" والی مثل صادق آئی۔ جس طرح درختوں کی نشوونما کے لئے درختوں کی کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے اسی طرح دلّی بگڑ بگڑ کر بنی اور بہتر بنی۔ شاہجہاں کی دلّی پہلی سب دلّیوں سے زیادہ شان دار تھی۔ تاج محل (آگرہ) جامع مسجد (دلّی) اور لال قلعہ (دلّی)

www.taemeernews.com

جیسی عمارتیں بنوانے والے بادشاہ کا ذوق دلی کی ایک ایک عمارت میں جھلکتا تھا۔ نئی دلی مغربی ذوق کے مطابق نہایت حسین شہر ہے۔

۱۹۴۷ء میں دلی کو نواں زخم لگا اس زخم کی نوعیت مذکورہ بالا آٹھ زخموں کی نوعیت سے الگ تھی۔ یہ زخم ایسا ہے کہ کبھی مندمل نہیں ہوگا۔

نزع کی آخری ہچکی کو ذرا غور سے سُن
دمِ ہستی کا خلاصہ اسی آواز میں ہے

بہرحال دلی سلطنتوں، تہذیبوں اور تمدنوں کا مدفن ہے۔

* * *

www.taemeernews.com

میرے زمانے کی دِلّی

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

میرا نام، ماں باپ کا رکھا ہوا، محمد ارتضےٰ ہے۔ ایک صاحب ظہیر احمد زاہدی، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کے بھتیجے اور منصف نثار احمد کے بیٹے، اینگلو عربک ہائی اسکول دلّی میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اُن سے یونہی مذاقاً کہہ دیا تھا "تم زاہدی، میں واحدی" وہ دن اور آج کا دن یہ نام چل گیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے اِس پر اپنی مُہر تصدیق لگا دی اور اسے شہرت دے دی۔ اب لوگ اِسی نام سے پُکارتے ہیں اور اصلی نام بھول گئے ہیں۔ مگر مجھے اصلی نام یاد ہے۔ واحدی نام کو خواجہ صاحب سے نسبت ہے تو محمد ارتضےٰ نام کو ماں باپ سے نسبت ہے۔ اور پھر ارتضےٰ کے ساتھ محمدؐ جیسا مقدس نام

www.taemeernews.com

چھپیاں ہے اور خود ارتضےٰ کا لفظ قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے۔

والد ماجد کا اسم گرامی سیّد محمد مصطفیٰ تھا۔ ہم فوجدار خاں والے کہلاتے ہیں۔ شاہجہاں نے دلّی بسانے، جامع مسجد بنانے اور لال قلعہ میں رہائش اختیار کرنے کے بعد تین مستند و منتخب سیّد بخارا سے بلوائے تھے۔ ایک جامع مسجد کی امامت کے لئے۔ ایک عیدگاہ کی امامت کے لئے۔ اور ایک ہاتھی پر اپنے اور مہابت کے درمیان بیٹھنے کیلئے۔ سیّد کے سوا کس کی مجال تھی کہ نماز میں بھی بادشاہ کی طرف پشت کرسکتا۔ مہابت اور بادشاہ کے درمیان جو سیّد صاحب بیٹھتے تھے اُن کی پشت مہابت کی طرف رہتی تھی اور مُنہ بادشاہ کی طرف ہوتا تھا۔ وہ مہابت کی پشت اور بادشاہ کے مُنہ کے درمیان حجاب کا کام دیتے تھے۔ اس عہدہ کو پیش نشینی کہا جاتا تھا اور اس عہدہ دار کا خطاب فوجدار خاں تھا۔ آخری فوجدار خاں میر نجف علی کی بیٹی میری پردادی تھیں۔ پردادی کی وجہ سے ہمارا خاندان فوجدار خانی کہلانے لگا۔ ورنہ میرے پردادا تو حضرت میر محمد اکبر معروف بہ حکیم شاہ ارزانیؒ کی اولاد تھے۔ میرے والد سیّد محمد مصطفیٰ۔ اُن کے والد حافظ سیّد محمد الیاس۔ اُن کے والد میر پناہ علی (جن کو میر نجف علی آخری فوجدار خاں کی بیٹی بیاہی تھیں)۔ میر پناہ علی کے والد میر امام بخش۔ اُن کے والد سیّد حمایت اللہ عرف

www.taemeernews.com

سید شاہ میرؒ (المتوفی ۲ ر جمادی الثانی ۱۱۹۴ھ) اُن کے والد سید شاہ شکر اللہؒ (المتوفی ۲۵ ر محرم ۱۱۴۹ھ) اُن کے والد حضرت میر محمد اکبر معروف بہ حکیم سید شاہ ارزانیؒ (المتوفی ۱ ر ربیع الثانی ۱۱۳۴ھ۔ زمانہ شاہ عالم ثانی)

حکیم شاہ ارزانی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے طب یونانی کی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور ترجمہ کرکے طب کو عام اور ارزاں کردیا تھا۔ اسی لئے ارزانی عُرف پڑ گیا۔ طبیب بھی تھے اور درویش بھی تھے۔ اُن کے والد حضرت میر محمد مقیمؒ (المتوفی ۱۱ ر جمادی الاول ۱۰۹۷ھ) حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ کے خلیفہ تھے۔

بہر حال پردادا کے جدامجد بھی قدیم شاہجہاں آبادی تھے اور پردادی کے جدامجد اُس وقت سے شاہجہاں آبادی تھے جس وقت شاہجہاں آباد نیا نیا آباد ہوا تھا۔ لہذا شاہجہاں کی دلی سے میرا تعلق انتہا درجہ قدیم ہے۔ اور یہ تعلق شاہجہاں صاحبقراں کے عہد سے ۱۸۵۷ء تک مسلسل رہا۔ خاندان کا کوئی آدمی دلی سے باہر نہیں گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملازمتوں کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر جانا پڑا۔ لیکن سالانہ پھیرا دلی کا ضرور کرلیا جاتا تھا۔ گیارہ سال کی عمر یعنی ۱۸۹۸ء تک میرے بھی پھیرے ہی ہوتے تھے ۱۸۹۸ء میں تعلیم کے خیال سے مجھے دلی چھوڑ دیا گیا اور پھر میں دلی میں ایسا جما جیسے قطب! کہ قطب از جا نمی جنبد۔ طویل ترین سفر عمر بھر

www.taemeernews.com

میں دو گئے ہیں۔ ایک حیدرآباد (دکن) اور بمبئی کا اور ایک سرینگر (کشمیر) کا۔ وہ سفر بھی دس دس بارہ بارہ دن کے تھے۔ دلی سے اتنا دل لگا تھا کہ کہیں دل ہی نہ لگتا تھا۔ پندرہ بیس دفعہ میرٹھ گیا ہوں۔ پندرہ بیس دفعہ علی گڑھ۔ صبح گیا، شام کو لوٹ آیا۔ دو تین مرتبہ اجمیر شریف اور آگرہ جانا ہوا ہے۔ ایک مرتبہ کانپور۔ ایک مرتبہ متھرا۔ میرٹھ خواجہ صاحب کے ساتھ بھیّا احسان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ علی گڑھ میں خالہ زاد بھائی خان صاحب سید محمد ادریس انجنیر تھے۔ اجمیر میں بہنوئی خان صاحب سید احمد کوتوال۔ اور آگرہ میں مولانا عارف ہسوی (صدر کانگریس کمیٹی صوبۂ دلی) مقیم۔ ہاں لکھنؤ۔ امرتسر۔ انبالہ۔ پٹیالہ اور لاہور بھی راستہ ناپنے جا چکا ہوں۔ شملہ کے سفر اس شان سے کئے ہیں کہ رات کے آٹھ بجے ریل میں بیٹھا اور دوسرے دن ایک بجے شملہ پہنچا اور دو گھنٹے اسٹیشن پر ٹھیر کر تین بجے کی ٹرین سے دلی آ گیا۔

کہنا یہ ہے کہ شاہجہان آباد، دلی میں میرے خاندان نے بھی بڑا طویل زمانہ گزارا اور میں نے بھی۔ خاندان کا دوسرے خاندان مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً مولانا سید حمید، امام جامع مسجد کا خاندان۔ لیکن میرا مقابلہ شاید نہ کیا جا سکے۔ کراچی کے سفر نے ریکارڈ ضرور خراب کر دیا ہے۔ گو پچاس برس دلی کا قطب رہا۔ کراچی آ کر کراچی کا قطب

www.taemeernews.com

ہوں۔ سفر کا جذبہ کبھی تھا ہی نہیں۔ کراچی کے سفر نے اُسے اور دبا دیا۔ کراچی کا سفر نمونہ سقر تھا۔ بھائی محمد ادریس۔ بھائی محمد اسحٰق۔ حافظ عزیز حسن بقائی۔ مولوی عبدالحمید۔ اسرار حسن خاں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید۔ حکیم عبدالحمید۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن۔ مولانا سمیع اللہ۔ مولوی شفیع الدین نیر۔ مسٹر عبدالرزاق۔ شاہ صابر حسین۔ خواجہ زید پاشا۔ خواجہ حسن ثانی۔ خواجہ مہدی۔ مفتی شوکت فہمی۔ مولانا امداد صابری۔ آغا محمد طاہر۔ قاری اخلاق حسین۔ سر شری رام۔ پنڈت زار۔ پروفیسر گل زار۔ لالہ شمبھو ناتھ۔ لالہ شام ناتھ۔ لالہ اونکار ناتھ۔ مولانا سید حمید۔ مولانا سید عبداللہ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ حافظ فیاض احمد۔ حکیم عبدالسلام نئی۔ پیرجی عبداللہ فاروقی۔ پیرجی عبدالحق فاروقی۔ پنڈت تیلو رام۔ منشی عبدالقدیر۔ مولوی عبدالقدیر۔ سید محمد جعفری۔ ڈاکٹر بدھ دیر سنگھ۔ لالہ گوپی ناتھ امن۔ لالہ داتا رام۔ چودھری احمد بخش۔ وغیرہ وغیرہ، خدا معلوم کتنے حضرات دلّی میں ہیں جن کے دیکھنے کے لئے دل تڑپتا ہے [له]

[له] حافظ عزیز حسن بقائی آغا محمد طاہر اور مولوی عبدالقدیر کا انتقال ہوگیا۔

www.taemeernews.com

جیسے تیشے سے کوئی ٹکڑے کرے فولاد کے
اس طرح کاٹے ہیں ہم نے دن تمہاری یاد میں

لیکن کراچی کا سفر کرکے ایسا ڈرا ہوں کہ سفر کی ہمت نہیں ہوتی تاہم ؂

اس درجہ ہے نسبت ترے کوچہ کی زمیں سے
ہوں دفن کہیں بھی مگر اُٹھوں گا وہیں[1] سے

حُسنا کو، جو میرے مکان کے آگے کی سڑک پر جھاڑو دیا کرتے تھے اور حسینی اور میرو، جن کے ذمّہ میرے گھر کی صفائی ستھرائی تھی میں کیونکر بھول سکتا ہوں۔ اِن تینوں نے ہمیں اُس وقت دغا نہیں دی جس وقت (۴۷ ۱۹ میں) دلّی کے مہتروں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ہم دلّی سے چلے ہیں تو ہمیں رخصت کرنے والے صرف دو تھے۔ حسینی اور میرو۔ اُن کا رونا ہمارے دل پر نقش ہے اور ہماری جُدائی اُن کے دل پر نقش ہے۔ ۱۹۵۳ء میں میری لڑکی اور داماد (شاکرہ اور شریف) اور میرے منجھلے لڑکے علی مقتدیٰ واحدی دلّی گئے تو حسینی اور میرو نے

---

[1] یہ شعر رَو میں قلم سے نکل گیا ہے ورنہ میں تو اِسے یوں پڑھنا چاہتا ہوں اور پڑھتا ہوں ؂ اس درجہ تعلق ہے مدینہ کی زمیں سے
ہوں دفن کہیں بھی مگر اُٹھوں گا وہیں سے
مر کر اُٹھنے کے لئے مدینہ سے بہتر زمین دوسری بھلا کیسے ہو سکتی ہے۔

www.taemeernews.com

اُنھیں پھولوں اور گوٹے کے ہاروں سے لاد دیا، اور پھلوں کا اُن کے آگے ڈھیر لگا دیا۔ میں دلی یوں بھی نہیں جاتا کہ حسینی اور میر کا بدلہ اُتارنے کے لائق دلی میں روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔

حضرت شاہ کرار حسین رح جب حج کر کے کراچی کے راستے دلی گئے ہیں تو ملے تھے۔ اُن کا آخری معانقہ کرتے کرتے چشم پُرآب ہو جانا آنکھوں میں پھرتا ہے۔ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ رح کے ساتھ پچاس سال پڑوس کے تعلقات رہے۔ اُن کی شریفانہ متانت اور مومنانہ فراست نظر کے سامنے ہے۔

میری حقیقی خالہ نور جہاں بیگم (والدہ محمد ادریس) اور میرے حقیقی ماموں سید ضمانت علی دونوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد انتقال فرمایا ہے۔ اور حضرت خواجہ حسن نظامی کا اور میرا رشتہ کون نہیں جانتا۔ خواجہ صاحب میرے سفر زندگی کے سب سے اہم ساتھی تھے۔ وہ بھی بچھڑ گئے۔

مولانا سید عبدالرؤف (نبیرہ حضرت میاں نذیر حسین محدث رح) دوسرے تیسرے مہینے دلی آنے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اُن کا بھی دنیا سے کوچ ہو گیا۔

خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ سر شنکر لال۔ لالہ مرلی دھر شاد۔

www.taemeernews.com

سردار بہادر سندر سنگھ دھوپیا۔ لالہ راج نراین کمنہ سب کو میرے پیچھے موت کھا گئی۔

دلی میں والدہ کی قبر ہے اور والد کے علاوہ سارے خاندان کی قبریں ہیں۔ والد نے روڑہ ضلع کانپور میں وفات پائی تھی۔ وہ وہاں سب ڈویژنل افسر (محکمہ نہر) تھے۔

۱۹۰۹ء سے میں بالکل دلی کا ہو گیا لیکن ۱۹۰۹ء سے پہلے کا دلی جاتا رہنا حافظہ میں محفوظ ہے۔ کبھی کا کم کبھی کا بیش۔ کبھی کی فقط اتنی بات کہ ریل گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ ایک گنواری نے دوسری گنواری سے کہا۔ "اری اِس چھوکرے کا اِترانا دیکھ" اور میں اُس کی فقرہ بازی سے خجل ہو کر گاڑی میں گھس گیا۔۔۔ اور کبھی کا پورا سفرنامہ۔

۱۹۰۶ء میں میری بڑی بہن روشن آرا بیگم کی خواجہ فضل احمد خاں شیدا سے شادی ہوئی۔ اُس شادی کا سماں مجھے خوب یاد ہے۔ میرے چھوٹے بھائی سید محمد مرتضےٰ جو اُس وقت دو ڈھائی برس کے تھے، شادی کے زمانے میں کچھ ایسے بیمار پڑے کہ والدہ اور والد شادی کو بھول گئے۔ لیکن میں بہ ضد تھا کہ سلیم شاہی کا مدار جوتی پہنوں گا اور میرے چچا سید محمد عمر نے یہ ضد پوری کی۔ خواجہ فضل احمد اس شادی کا سماں مجھ سے بہتر کھینچ سکتے ہیں۔ اُن سے کہوں گا کہ اپنی شادی کا نہ سہی دلی کی کسی اور ہی شادی کا

www.taemeernews.com

نقشہ کھینچ دیجئے۔ خواجہ محمد شفیع اور سید یوسف بخاری سے بھی گذارش کی جائے گی۔ ان دونوں کے مضامین حاصل ہو گئے تو کتاب کے دوسرے حصّے میں درج ہوں گے۔ انشاء اللہ۔

۱۹۰۸ء میں مجھے اسکول میں نہیں داخل کرایا گیا۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھ چکا تھا اور مکتبی اُردو، فارسی تحصیل کر چکا تھا۔ کوشش یہ کی گئی کہ ابتدائی (پرائمری) جماعتیں بھی گھر پر ختم کرلوں اور ایک دم پانچویں میں داخل ہوں۔

اُس زمانہ میں پانچویں کا سرٹیفیکیٹ ملا کرتا تھا۔ انسپکٹر مدارس کا دستخط شدہ۔ پانچویں پاس کو پٹوارگیری اور قرق امینی قسم کی نوکریاں مل جاتی تھیں۔ اور مڈل یعنی آٹھویں کا امتحان یونیورسٹی لیتی تھی۔ مڈل پاس کرکے لڑکے بیرسٹری پڑھنے انگلستان جاسکتے تھے۔ بی۔اے کی قید ال۔ال۔بی کے لئے تھی۔ بیرسٹری کے لئے نہیں تھی۔

خیر میں ڈیڑھ سال میں اس قابل ہو گیا کہ سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول نے پانچویں میں لے لیا۔

مشن ہائی اسکول کوتوالی (چاندنی چوک) کے قریب وہاں تھا جہاں اب کپڑے کا تھوک کاروبار ہوتا ہے اور جو مولوی عبدالاحد (مالک مطبع مجتبائی) کا کٹرہ کہلاتا ہے۔ گھنٹے والے شاہی حلوائی کی

www.taemeernews.com

دکان سے بالکل متصل۔ اسکول کی عمارت مولوی عبدالاحد نے خرید لی تھی اور اُسے ڈھوا کر کٹڑہ بنا دیا تھا۔ اسکول موری دروازہ چلا گیا تھا۔

اس زمانہ میں سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول دلی کا بہترین اسکول تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت جانکی ناتھ کشمیری عیسائی تھے۔ اُن کے ماتحت کئی انگریز کیمبرج اور آکسفورڈ کے فارغ التحصیل کام کرتے تھے۔ باقی ٹیچر بھی قابل تھے۔ بیشتر عیسائی۔

سنسکرت اور عربی کے اُستاد ہندو اور مسلمان تھے۔ میرے پھوپی زاد بھائی قاری سرفراز حسین کے برادرِ نسبتی مولوی محمد نعیم عربی پڑھاتے تھے۔ ماسٹر امیر چند مالک امپیریل بک ڈپو جنھیں لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے ۱۹۱۲ء) پر بم پھینکنے کے شُبہ میں پھانسی ملی تھی اسی اسکول کے اُستاد تھے۔

طالب علموں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ عیسائیوں کے مقابلہ میں۔ مسلمان تو ایک میں تھا۔ ایک آصف علی[1] اور ایک عبدالرحمٰن[2]۔ کل تین آصف علی میرے ہم جماعت تھے اور عبدالرحمٰن دو جماعتیں آگے۔

---

[1] انڈین نیشنل کانگریس کے مشہور لیڈر، جو حکومت قایم ہونے کے بعد وزیر، سفیر اور گورنر رہے۔ سوئٹزرلینڈ میں انتقال ہوا۔ بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں مدفون ہیں۔

[2] جسٹس سر عبدالرحمٰن (سابق جج سپریم کورٹ، پاکستان)

www.taemeernews.com

مشن ہائی اسکول کے بعد دوسرا نمبر گورمنٹ ہائی اسکول کا تھا۔ تیسرا اینگلو عربک ہائی اسکول کا۔ چوتھا اینگلو سنسکرت ہائی اسکول کا۔ پانچواں شاہزادہ ہائی اسکول کا۔

شاہزادہ ہائی اسکول مرزا ثریا جاہ اور اُن کے برادر بزرگ مرزا سلیمان جاہ نے مغل شاہزادوں کے واسطے قائم کیا تھا۔ مگر شاہزادے کیا پڑھ کے دیتے تھے۔ دوسرے مسلمان ہی پڑھتے تھے اور دوسرے مسلمان شاہزادہ اسکول میں وہ آتے تھے جو مشن۔ گورمنٹ۔ عربک اور سنسکرت اسکولوں میں بار نہ پاتے تھے۔

سنسکرت اسکول میں مسلمانوں کا اور عربک اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ہوتا تھا۔ سنسکرت اسکول کے ایک تعلیم یافتہ میرے زمانے کے اور میرے ہم عمر مولوی مجید الحسن حیدرآباد دکن میں موجود ہیں۔ عربک اسکول میں آنجہانی مسٹر تاراچند (سینیر) وکیل میرے ہم جماعت تھے۔ میں اور آصف علی مشن اسکول سے عربک اسکول آگئے تھے۔

مولوی مجید الحسن اور مسٹر تارا چند اب مرحوم ہیں

دلی کے مسلمان نہایت ذہین اور طباع ہوتے تھے۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں محنت نہیں کرتے تھے۔ محنت کرتے تھے تو کھیلوں میں کرتے تھے۔ جس طرح پاکستان کرکٹ میں نام پیدا کر رہا ہے، اسی طرح عربک ہائی اسکول کی کرکٹ میں دور دور دھوم تھی۔ ہندوؤں کا حال برعکس تھا۔ ذہانت

اور طباعی میں کم اور پڑھنے لکھنے میں برق۔ کوچہ چیلان، جہاں کا میں قدیم باشندہ ہوں، اُس سے ملحق بازار دریا گنج میں ایک ہندو افیون فروش کی دکان تھی۔ افیون فروشی سے پندرہ بیس روپے ماہوار آمدنی ہوجاتی ہوگی۔ اُس زمانہ میں افیون فروش ڈاک کے ٹکٹ، لفافے، کارڈ بھی بیچا کرتے تھے۔ افیون فروش کے معمولی سمجھ بوجھ کے لڑکے نے دیکھتے دیکھتے انٹرنس پاس کیا۔ افیون فروش کا محکمۂ ڈاک میں تعارف تھا ہی۔ لڑکا ڈاک خانہ کا بابو بن گیا۔ وہ نوکری بھی کرتا تھا اور مزید امتحانوں کی تیاری میں بھی لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ بی۔ اے ہوگیا اور مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا اور میرے دلی چھوڑنے سے پہلے کہیں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف تھا۔ اُس لڑکے کا (جواب بوڑھا ہے) جینتی پرشاد نام ہے۔

رامجس کالج دلی کا مشہور و معروف کالج ہے۔ لالہ رامجس حلوائی تھے حلوائی کیا، شیر فروش۔ دریا گنج ہی میں۔ رامجس کے بیٹے نے پڑھ لکھ کر سشن جج تک ترقی کی اور پنشن ہونے کے بعد باپ کی یادگار میں رامجس کالج قایم کیا اور اپنی کل جمع پونجی اُس پر صرف کر دی، بلکہ پنشن بیچ کر پنشن کی رقم بھی اُسے دے دی۔ کالج کے ساتھ ساتھ کئی رامجس ہائی اسکول کھولے اور رامجس پرائمری اسکولوں کا تو جال بچھا دیا۔

www.taemeernews.com

میونسپل کمیٹی کے پرائمری اسکول اتنے نہیں تھے جتنے رامجس پرائمری اسکول تھے۔ جس نے اپنا سب کچھ کالج کی نذر کر دیا ہو اُسے چندہ ملنا کیا دشوار تھا۔ پھر ریٹائرڈ سشن جج اور بانیٔ کالج نے اپنی زندگی یہ رکھی کہ رامجس کالج میں بورڈر طالب علموں کے ساتھ رہتے تھے۔ غالباً اب بھی رہتے ہیں۔ غالباً زندہ ہیں۔

رامجس کالج کی خصوصیت یہ تھی کہ پندرہ روپے ماہوار میں ایف۔ اے اور بی۔ اے کا طالب علم بورڈنگ میں رہتا بھی تھا۔ کھاتا بھی تھا اور پڑھتا بھی تھا۔ بانیٔ کالج بھی پندرہ روپے کالج کو دے کر طالب علموں کے معیار کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جاننے والوں میں اُن کا صرف اعتبار ہی نہیں تھا، اُن کی بڑی عزت تھی۔ نہ جاننے والے شکل اور وضع قطع سے سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ کون ہیں اور کیا ہیں۔ پولیس کا کانسٹبل ڈانٹ دیتا تھا کہ "او بوڑھے! گاڑی نہیں سوجھتی۔ مرنے نکلا ہے۔ بیکنٹھ جانے کی جلدی ہے"۔ وہ نہ اچھے برتاؤ سے خوش ہوتے تھے اور نہ بُرے برتاؤ کی پروا کرتے تھے۔ دن بھر کالج اور اسکولوں کی دیکھ بھال کی دُھن میں پھرتے رہتے تھے۔

اُن کا نام بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ مجھے بھی معلوم نہیں۔ باپ کا نام یاد رکھنے پر میں بھی مجبور رہوں اور دنیا بھی مجبور ہے۔ یہ صاحب ہزار ہزار،

ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ کے پرنسپل اور پروفیسروں سے کام لیتے تھے لیکن ذہانت وطباعی (تیزی وطرّاری) کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ فقط محنت کی عادت اور ایثار کے جذبے سے وہ کام کیا جو ذہین وطباع (تیز وطرّار) مسلمان نہ کرسکے۔

عربک ہائی اسکول کے چند ممتاز تعلیم یافتہ

آخری نصف صدی میں جتنے مسلمان، دلّی کے، ذہانت وطباعی کی وجہ سے اُبھرے، سب عربک ہائی اسکول کے رہینِ منّت ہیں۔ خان بہادر میر ناصر علی (ایڈیٹر صلائے عام) مولانا راشد الخیری (صاحبِ طرز مصنّف) قاری سرفراز حسین (مصنّف، سیّاح اور مبلغ اسلام) مولوی عنایت اللہ (ناظم دارالترجمہ حیدرآباد۔ دکن) مسٹر رضاء اللہ (اسٹیٹ انجنیر، بہاولپور) مولوی اشرف حسین احمن سے سر عبدالقادر نے مثنوی بدرِ منیر کا دیباچہ لکھوایا تھا۔ اور اُس ایک دیباچہ نے اُن کی دھاک بٹھا دی تھی) مرزا محمد اشرف گورگانی (ادیب اور منچن آباد، بہاولپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) خواجہ فضل احمد خاں شیدا (ان کے معمولی خطوط ادبی شہ پارے ہوتے ہیں) امیر جالب (چیف ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور۔ روزنامہ ہمدرد دہلی۔ روزنامہ ہمدم وہمّت لکھنؤ) مسٹر مشتاق احمد زاہدی (پرنسپل بہاولپور کالج)۔ مسٹر آصف علی (وزیر۔ سفیر۔ گورنر) مسٹر رؤف علی (بیرسٹر) سیّد حیدر رضا (۱۹۰۳ء ۔ ۴ء کے کانگریسی لیڈر) شیخ ذکر الرحمٰن (ایڈوکیٹ) مسٹر عطاء اللہ (بیرسٹر) شیخ محمد تقی (ایڈوکیٹ)

www.taemeernews.com

شیخ عبدالعزیز (ایڈوکیٹ) مرزا فرحت اللہ بیگ (ادیب، مصنف اور حیدرآباد دکن کے جج ہائی کورٹ) مسٹر سلطان حیدر جوش (ادیب اور ڈپٹی کلکٹر) خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ (سینیر وائس پریسیڈنٹ دلی میونسپل کمیٹی) خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن، او۔ بی۔ ای (دلی میونسپل کمیٹی کے پہلے ہندوستانی پریسیڈنٹ) ڈاکٹر ایم۔ ایچ سجاد (ڈی۔ ڈی۔ ایس پاکستان) خان بہادر حاجی محمد یوسف پائی والے۔ مسٹر وحیدالدین (جج ہائی کورٹ، مغربی پاکستان) مسٹر ممتاز حسن، سکریٹری وزارت مال، پاکستان۔ مسٹر محمد اسمٰعیل صوفی اسسٹنٹ پرائیویٹ سکریٹری، وزیر اعظم پاکستان، مولوی شمس الاسلام (ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن بیورو) سید بدر (الاسلام اسسٹنٹ رجسٹرار کراچی یونیورسٹی) ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ہاشمی (کراچی کے ممتاز ڈاکٹر) مسٹر زیڈ۔ اے۔ ہاشمی (کراچی کے سابق کلکٹر) ماسٹر ذاکر حسین (مصنف اتالیق انگریزی) میر محمد حسین (سکریٹری عربک کالج۔ میر صاحب کے دور میں اسکول کالج بنا) شیخ محمد صدیق (ایڈوکیٹ) مولوی محمد عظمت اللہ (ایڈوکیٹ و سکریٹری عربک کالج۔ مولوی صاحب کے دور میں کالج ڈگری کالج بن گیا) مولوی فضل الدین (پرنسپل عربک کالج) آغا محمد اشرف (چیف آف پبلک انسٹرکشنز یونائیٹڈ نیشنز) قاری عباس حسین (جرنلسٹ اور مقرر) شیخ منظور الحق (عوامی لیگ کے ممتاز لیڈر) شیخ ظہور الحق (ایڈوکیٹ) خواجہ عبدالمجید (پروفیسر سینٹ اسٹیفنز کالج) خواجہ محمد شفیع (ادیب

www.taemeernews.com

اور مصنف) مسٹر فصیح الدین احمد (سکریٹری ہارڈنگ لائبریری) جنھوں نے میری شرکت میں رسالہ ادیب نکالا تھا) سید مناظر علی (تحصیلدار) مسٹر رئیس الدین (ڈپٹی سکریٹری حکومت پاکستان) مولانا رازق الخیری (ایڈیٹر عصمت) مسٹر صادق الخیری (مصنف) مسٹر شاہد احمد (ایڈیٹر ساقی) سید رضا مرزا (ایڈوکیٹ) مسٹر امین الدین (ایڈوکیٹ) ڈاکٹر ناصر عباس۔ سید عبدالحی (ایڈوکیٹ) شیخ محمد یامین (ایڈوکیٹ) مسٹر آصف زاہدی (ایڈوکیٹ و ممبر کراچی میونسپل کارپوریشن) مسٹر نورالدین (بیرسٹر و نائب صدر دلی اسٹیٹ اسمبلی) ڈاکٹر اظہر علی (پروفیسر سینٹ اسٹیفنز کالج) مسٹر انیس احمد رشدی (بیرسٹر) سید اقبال حسین رضوی (سپرنٹنڈنٹ پولیس ٹریبونل) ڈاکٹر سید سجاد (پروفیسر حیدرآباد دکن) نواب زادہ عزیز احمد خاں (سب رجسٹرار) میر مرتضیٰ علی (میر منشی کمانڈر انچیف آف انڈیا) ڈاکٹر عبدالجبار خیری۔ مولانا عبدالغفار خیری۔ ڈاکٹر عبدالستار خیری۔ مولانا انوارالحق خیری۔ مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ سید مبارک۔ مسٹر انصار ناصری۔ مسٹر فضل حق قریشی۔ مسٹر احترام اللہ۔ کس کس کو گنواؤں، حضرت خواجہ حسن نظامی۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں۔ شمس العلما مولوی سید احمد، امام جامع مسجد۔ نواب فیض احمد خاں اور میر ناصر نذیر فراق۔ ان پانچ بزرگوں نے تو عربک اسکول میں پڑھا نہیں باقی انگریزی پڑھے لکھوں میں دلی کا جو شخص بھی نمایاں ہوا وہ عربک اسکول کا

تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھا۔ گروان کبوتر مشن اسکول یا گورنمنٹ اسکول میں بھی جاتے تھے تو پھر پھرکر عربک اسکول آجاتے تھے۔ مشن اسکول اور گورنمنٹ اسکول سے کوئی نمایاں مسلمان منسوب نہیں ہے۔

میرے زمانہ میں[1] عربک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین تھے۔ سیکنڈ ماسٹر مولوی فضل الدین، جو بعد میں ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ آخر عمر میں عربک انٹر میجیئٹ کالج کے پرنسپل رہے۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کا چارج مرزا احمد بیگ اور ماسٹر امتیاز حسین کے پاس تھا۔ عربی کے اُستاد مولوی آفتاب حسین (خطیب اعظم مولوی سید محمد کے والد ماجد) تھے۔ اور فارسی کے اُستاد مولوی عمر علی۔ ریاضی۔ الجبرا اور اُقلیدس سیکنڈ ماسٹر صاحب پڑھاتے تھے یعنی فضل الدین۔ ریاضی کے نایب اُستاد مولوی

---

[1] یہ اسکول کبھی علوم مشرقیہ کا دارالعلوم تھا۔ اس کے صدر مدرس حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولانا رشید الدین خاں دہلوی تھے پھر اُن کے شاگرد مولانا مملوک علی نانوتوی نے اُن کی جگہ سنبھالی۔ سرسید احمد خاں۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ مفتی ذکاء اللہ وغیرہ اکابر اسی دارالعلوم کے فیض یافتہ تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اس کا نام دہلی کالج ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد سے پھر دہلی کالج کہلاتا ہے۔ اینگلو عربک کالج اور اینگلو عربک اسکول نام نوّے سال رہا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۸ء تک۔

www.taemeernews.com

نجم الدین مؤلف نجم الحساب تھے۔ تاریخ و جغرافیہ کے اُستاد ماسٹر ذاکر حسین۔ (مصنف تاریخ اسلام و اتالیق انگریزی و کتب کثیرہ)

میرے زمانہ سے قبل کے اُستادوں میں مولانا الطاف حسین حالی قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی فضل الدین مولانا حالی کے شاگرد تھے۔ میرے زمانہ کے اور سب اُستادوں نے مولانا حالی کے ساتھ پڑھایا تھا۔ میرے زمانے کے اُستادوں نے عربک اسکول ہی میں ملازمت شروع کی تھی اور عربک اسکول ہی میں ملازمت ختم کردی۔ عربک اسکول کے اُستادوں کے تبادلے نہیں ہوتے تھے۔ مولانا حالی ملازمت سے استعفیٰ دے کر چلے گئے تھے۔

میرے سامنے میرے اُستادوں کی ملازمت پر زوال آیا۔ تیس تیس اور چالیس چالیس سال کا تعلیمی تجربہ ہونے کے باوجود حکومت نے اُنھیں رخصت کردیا اور بی۔ اے۔ بی ٹی پاس نوجوان اُستادوں کو لا بٹھایا۔ صرف مولوی فضل الدین پُرانے اُستادوں میں رہ گئے اور ہیڈ ماسٹر کردیے گئے۔ وہ بی۔ اے بی ٹی تھے۔ وہ پُرانے اُستادوں میں سب سے کم عمر تھے۔ بالکل جوان۔

بوڑھے اور دلّی کے رہنے والے اُستادوں کا اپنے ہر شاگرد سے رشتہ تھا۔ کوئی شاگرد بھتیجہ تھا۔ کوئی بھانجہ۔ کوئی پوتا تھا۔ کوئی نواسہ۔ پٹھانہ سہی، اپنے دوست کا سہی، رشتہ ناتا کا سہی۔ دلّی کے رہنے والے

www.taemeernews.com

اُستاد اِس طرح پڑھاتے تھے جس طرح باپ بیٹوں کو پڑھاتے ہیں اور اِس طرح تربیت دیتے تھے جس طرح بزرگ خُردوں کو تربیت دیتے ہیں۔ خانہ ساز دوا اور بازاری دوا میں جو فرق ہوتا ہے وہ عربک ہائی اسکول کے پُرانے اُستادوں اور نئے اُستادوں میں تھا۔ پُرانے سمجھتے تھے کہ ہمیں اسی اسکول میں جینا ہے اور اسی اسکول میں مرنا ہے۔ نئے استاد اِس اُدھیڑبُن میں رہتے تھے کہ عربک اسکول سے زیادہ تنخواہ کہیں ملے تو وہاں چلے جائیں۔

مولوی فضل الدین

میں نے نئے اُستادوں کو بھی برتا۔ اُن میں جو دلّی کے تھے وہ دِلّی سے باہر جانا نہیں چاہتے تھے' اس لئے غنیمت تھے۔ خصوصاً مولوی فضل الدین خواجہ شہاب الدین کے قدم بہ قدم تھے۔ مولوی فضل الدین کالج کی پرنسپلی عمامہ باندھ کر اور دیسی' ادھوڑی کی جوتی پہن کر کر گئے۔ مولوی فضل الدین شاگردوں کا اتنا خیال رکھتے تھے اور شاگردوں کی اتنی نگرانی فرماتے تھے کہ شاگردوں کو راہ چلتے ڈر رہتا تھا کہ مولوی صاحب نہ آجائیں۔ اور مولوی صاحب واقعی آجاتے تھے۔ چاندنی چوک میں پٹری پر تصویریں بکری کے لئے پھیلی رہتی تھیں۔ میں ایک دن رُک کر اُنھیں دیکھنے لگا۔ یہ حرکت ناپسندیدہ اور ثقاہت کے خلاف تھی۔ مولوی فضل الدین میرے تصوّر میں آگئے۔ تصوّر کرنا تھا کہ مولوی فضل الدین کا ہاتھ کندھے کے اوپر موجود تھا۔ مولوی

www.taemeernews.com

صاحب میرا کندھا دبا رہے تھے اور پیچھے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

لال قلعہ کے دلی دروازہ اور سنہری مسجد[1] کے درمیان ایک ڈیڑھ فٹ چوڑی پختہ نالی تھی۔ نہر سعادت خاں کا پانی چاندنی چوک کے راستے قلعہ میں آتا تھا اور قلعہ سے اس نالی کے ذریعہ دریا گنج کے حوضوں اور دریا گنج کی نہر میں جاتا[2] تھا۔ نالی کے نیچے زمین بہت نیچی تھی۔ نیچان کو درپنا کر

---

[1] مشہور سنہری مسجد تو چاندنی چوک میں ہے، کوتوالی کے برابر۔ فوارے کے سامنے، لیکن قلعہ اور پردہ باغ کے قریب والی مسجد بھی سنہری مسجد کہلاتی ہے۔

[2] میں نے نہر سعادت خاں کو بہتے اور اس میں کشتیاں چلتے دیکھا ہے اور چاندنی چوک کی نہر میرے دیکھتے دیکھتے بند ہوئی تھی اور نہر کی جگہ سڑک کے وسط میں پٹڑی بنی تھی۔ پٹڑی اب نہیں ہے۔ اور دریا گنج کی نہر میں تو میں سینکڑوں بار نہایا ہوں۔ دریا گنج کی نہر گویا میرے گھر کے صحن میں تھی۔

سنا ہے ایک ایسی ہی سکڑی سی نہر چاوڑی بازار سے بھی گزرتی تھی جو قاضی کے حوض پر گھس کر لال کنوئیں کی طرف مڑ جاتی تھی اور فتح پوری پہنچ کر چاندنی چوک کی بڑی نہر میں مل جاتی تھی۔ میں نے یہ نہر نہیں دیکھی۔ مگر قاضی کا حوض دیکھا ہے۔ قاضی کے حوض کی جگہ آج کل پھل ترکاری وغیرہ کی دکانیں ہیں۔ قاضی کے حوض سے ایک سڑک لال کنوئیں جاتی تھی ایک اجمیری دروازے۔ ایک سیتا رام کے بازار ہوتا ایک چاوڑی بازار۔

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

www.taemeernews.com

دور کیا گیا تھا۔ دروں پر نالی دوڑتی تھی اور نالی پر بچے دوڑا کرتے تھے۔ زمین سے تین چار گز اونچی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی نالی پر دوڑنا بچوں کا کھیل تھا۔ میں ایک روز یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے نالی کے قلعہ والے سرے

(صفحہ ۱۲۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) مغل بادشاہ فقط اپنے محلوں اور قلعوں ہی میں باغ نہیں لگاتے تھے اور نہریں نہیں دوڑاتے تھے، رعایا کے لئے بھی باغ لگاتے اور نہریں بہاتے تھے۔ پھر دلی تو سلطنت کا دل تھا۔ یہاں تمازت آفتاب دور کرنے کی غرض سے باغوں اور نہروں کی بڑی افراط تھی۔ شہر کے اندر بھی بے شمار باغ تھے۔ اور سبزی منڈی سے آگے تو میلوں باغ ہی باغ چلے گئے تھے۔ آج ان میں کا ایک روشن آرا باغ باقی ہے۔ وہ بھی غالباً روشن آرا کلب کی خاطر۔ ہاں باغ محل دار خاں کا دروازہ کھڑا رہ گیا ہے۔ خدا جانے کیوں۔ باغ بہت سے میرے سامنے تک تھے۔ کچھ رؤساء شہر کی ملکیت۔ کچھ لاوارث۔ کچھ اُجڑے اُجڑائے۔ شہر کو وسعت دینے کے نام سے باغات کی جگہ کوٹھیاں تعمیر ہو گئیں اور حفظانِ صحت کے نام سے نہروں کو بند کر دیا گیا۔

قصبوں کی آبادی گھٹانا اور شہروں کی آبادی بڑھانا اُسی طرح انگریزوں کا پڑھایا ہوا سبق ہے جس طرح امیروں کو امیر تر اور غریبوں کو غریب تر بنانا انگریزوں نے سکھایا ہے۔ دلی کی آبادی ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک لاکھ بھی نہیں تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بڑھتے بڑھتے ۱۹۱۱ء میں پونے دو لاکھ تک پہنچی تھی۔ شاہجہاں دلی کو نہایت خوبصورت شہر

(باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

پر جا بیٹھا، جہاں املی کا درخت ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس درخت کو سلامت چھوڑ کر آیا ہوں۔ درخت سے میں نے ایک کتارا توڑا اور منہ میں ڈالا اور مولوی

(صفحہ ۱۲۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) رکھنا چاہتا تھا۔ شاہجہاں نے دو منزلہ مکانوں کی ممانعت کر دی تھی۔ یک منزلہ مکان اتنے وسیع تھے کہ شاہجہاں کے بعد بھی مدتوں اتنے وسیع رہے کہ اُن میں محلے آباد ہیں۔ اعظم خاں کی حویلی۔ حویلی مظفر خاں۔ حویلی حیدر قلی خاں۔ حویلی خان دوراں خاں۔ حویلی حسام الدین حیدر۔ حویلی قاسم جان۔ حویلی نواب مصطفےٰ خاں۔ حویلی نواب مرزا بدل بیگ۔ نمک حرام کی حویلی۔ حویلی خان زماں خاں۔ حویلی قمر خاں۔ حویلی کلو خواص۔ حویلی رجب بیگم۔ حویلی سعادت خاں۔ حویلی کالے صاحب کے ناموں میں حویلی کا لفظ موجود ہے۔ رائمان کا کوچہ۔ کوچہ قابل عطار۔ کوچہ نثواں (زناواں) بارہ دری شیر افگن خاں۔ بارہ دری خواجہ میر درد۔ نواب وزیر کی بارہ دری۔ چاندنی محل۔ شیش محل۔ رنگ محل۔ پھاٹک بنگش۔ نجبش خاں کا پھاٹک۔ کوچہ ناہر خاں۔ کوچہ سکھانند۔ کوچہ پیر عاشق۔ کوچہ خان چند۔ باڑا ہندو راؤ۔ باغ شیدی گوہر۔ باغیچی اچھے جی۔ کٹرہ نیل۔ ہاتھی خانہ۔ فراش خانہ۔ زینت محل کا کمرہ۔ کٹرہ سپہ دار خاں۔ کٹرہ شیخ چاند۔ کلاں محل۔ کوچہ سعد اللہ خاں۔ کھڑکی تفضل حسین خاں۔ پھاٹک مفتی والان۔ چھتہ لال میاں۔ چھتہ شیخ منگلو۔ مدرسہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ۔ نواب گنج۔ چھتہ شاہ جی۔ کوچہ سربلند خاں عرف لال دروازہ۔ کٹرہ دینا بیگ۔ پھاٹک خورشید عالم۔ (باقی صفحہ ۱۲۸)

www.taemeernews.com

فضل الدین کا خیال کیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم۔ لُو چل رہی تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آدمی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ مگر مولوی فضل الدین نمودار ہو گئے۔

(صفحہ ۱۱۴ کا بقیہ فٹ نوٹ) کٹرہ شہنشاہی۔ چھتہ صوفی اللہ یار خاں۔ کٹرہ روشن الدولہ۔ کٹرہ مہرپرور۔ کٹرہ زماں شاہ۔ چھتہ چوہیا میم وغیرہ سب مکان تھے۔

کوچہ چیلان کا نام دراصل کوچہ چہل امیراں[1] تھا۔ جس طرح کوچہ ناتواں کا کوچہ نثھان بن گیا۔ یا جس طرح بوعلی شاہ بھٹیاری کی رہائش گاہ کو بھوری بھٹیاری کے محل کہنے لگے اسی طرح کوچہ چہل امیراں کو کوچہ چیلاں کہنے لگے۔ کوچہ چیلاں میں کبھی صرف چالیس امرا کے مکانات تھے۔ اُن اُمرا کے جنھیں بادشاہ کے قریب رہنا چاہئے تھا۔ کوچہ چیلان قلعہ کے بالکل نزدیک ہے۔

میں نے اپنی ممبری میونسپل کمیٹی کے زمانہ میں کوچہ چیلاں کی بجائے کوچہ چہل امیراں نام کمیٹی سے منظور کرا لیا تھا اور کوچہ چہل امیراں کے بورڈ کوچہ چیلاں کی بجائے لگوا دیئے تھے۔ نیز جامع مسجد سے وکٹوریہ زنانہ ہسپتال جانے والی سڑک کا نام اُردو بازار رکھوا دیا تھا۔ اُردو بازار بھی مغلوں کے زمانہ کا نام ہے اور اُردو بازار ۱۸۵۷ء سے پہلے وہیں کہیں تھا جہاں اب جدید اُردو بازار ہے۔ الحمد للہ اُردو بازار نام مقبول ہو گیا لیکن افسوس کوچہ چہل امیراں نام نہیں چلا۔ بورڈ غالباً ہنوز موجود ہیں۔

---

[1] یہ نام مجھے نواب مصلح الدین نے بتایا تھا جو دلی کی پرانی تاریخ مانے جاتے تھے۔

خواجہ شہاب الدین، ہیڈ ماسٹر، پڑھاتے کم تھے۔ شاگردوں کو انسانیت زیادہ سکھاتے تھے۔ اور پڑھانے کا بھی یہ حال تھا کہ کم پڑھانے کے باوجود

(صفحہ ۱۲۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) مگر نام کوچہ چیلان ہی لیا جاتا ہے۔ میں خود کوچہ چیلان لکھنے پر مجبور ہوں۔ شہر کی خوبصورتی شاہجہاں کے زمانہ میں کیسی تھی، اس کا اندازہ لال قلعہ۔ جامع مسجد اور تاج محل بنانے والے کے ذوقِ تعمیر سے کیجے۔ غیر موزوں عمارت شاہجہاں برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ عمارتیں بھی خوبصورت تھیں۔ بازار بھی خوبصورت تھے۔ فراخ اور کشادہ۔ ایک جانب دریائے جمنا تھا۔ دوسری جانب باغات کی بہتات تھی۔ شہر کے اندر بھی باغ تھے اور شہر سے باہر روشن آرا بیگم کے باغ سے باغات کا ایک سلسلہ چلتا تھا۔ شہر کے اندر مرکزی باغ جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کا تھا جو انگریزوں کے دور میں ملکہ کا باغ اور کمپنی باغ کہلایا جانے لگا۔ گویا ملکہ وکٹوریہ کا باغ یا آزیبل جان کمپنی کا باغ۔ بیگم یعنی جہاں آرا بیگم، بیگم صاحب کے نام سے مشہور تھیں۔

اس باغ میں جہاں آرا بیگم کے مہمان ٹھہرا کرتے تھے۔ جہاں اب میونسپلٹی کے دفاتر ہیں، یہ مہمان خانہ تھا اور جہاں مرحوم گھنٹہ گھر کے پاس نصف دائرہ میں بزازوں کی دوکانیں ہیں، یہاں مہمانوں کے واسطے متعدد حمام تھے۔ گھنٹہ گھر جہاں بنا تھا وہاں حوض تھا اور حوض کے اِدھر اور اُدھر چاندنی چوک کی نہر تھی۔

دلی کے مکانوں کا نقشہ یہ تھا۔ دالان، در دالان۔ دالانوں کے آگے طویل و عریض پختہ چبوترہ۔ چبوترے کے آگے کچا صحن۔ دالان در دالان کو آج کل کا ڈرائنگ روم سمجھ لیجے۔ چبوترہ اور دالانوں کی بغلوں میں کمرے ہوتے تھے اور دالانوں کی پشت پر شہ نشینیں اور غلام گردشیں۔ چبوترے پر بیٹھا جاتا تھا۔ صحن میں پھولوں اور پھلوں کے

www.taemeernews.com

اُن کے مضمون میں لڑکے پاس عموماً ہو جاتے تھے۔ پاس گھریلو امتحان ہی نہیں، یونیورسٹی کے امتحان میں۔ وہ نویں اور دسویں جماعت کو صرف انگریزی پڑھاتے تھے۔

خواجہ شہاب الدین پڑھانے کے کمرہ میں آتے اور بجائے کرسی کے میز پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے اور لڑکوں سے خطاب شروع کر دیتے۔ لمبا چوڑا اور متناسب ڈیل۔ میدہ شہاب رنگ۔ شریفانہ اور بزرگانہ خدوخال۔ سر پر عمامہ۔ جسم پر جُبہ۔ زبان میں طلاقت۔ سر میں فراست۔ رُعب کی جگہ رُعب۔ محبّت کی جگہ محبّت۔ حکمت اور موعظت کی باتیں۔ اُن کے شاگردوں کو اُن سے وہ فیض پہنچا تھا کہ آج کل اس کا تصوّر کرنا مشکل ہے۔

(صفحہ ۱۲۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) درخت بوئے جاتے تھے اور چھوٹا سا مستطیل حوض بنایا جاتا تھا، جس میں فوارے چھوٹتے رہتے تھے۔ شہ نشینوں اور غلام گردشوں کی پشت پر باغ تھا۔ باغ والا مکان میرے زمانہ کی دلّی میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن باقی وضع قطع قدیم دلّی والوں کے مکانوں میں باقی تھی۔ خود میرا مکان چھوٹے پیمانہ پر اسی وضع قطع کا تھا۔ کوچہ چیلان میں میرے پھوپی زاد بھائی سیّد ابوالحسن۔ ڈپٹی فداء اللہ، مسٹر رضاء اللہ اور مسٹر آصف علی کے مکانات اسی وضع قطع کے تھے۔

مغل امرا کے چند مکانات ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے کوڑیوں کے مول نیلام کر دئیے تھے۔ وہ ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں۔ انھیں دیکھ لیجیے۔ دیکھنے دکھانے کے لایق ہیں۔ نیا فیشن کوٹھیوں کا ہے، یا کابکوں کا۔ "کابکیں" یعنی فلیٹ۔

ماسٹر امتیاز حسین کا بھی خواجہ شہاب الدین سے ملتا جلتا انداز تھا۔ اُن کی باتوں میں ادیبانہ شان بھی تھی۔ شگفتہ انسان تھے۔

ماسٹر احمد بیگ پڑھانے کے دھنی تھے۔ باتیں بالکل نہیں کرتے تھے۔ دوسرے اُستادوں کے پڑھانے کی کمی اور کسر نکال دیتے تھے۔

ماسٹر ذاکر حسین دوسرے ماسٹر احمد بیگ تھے۔ تاریخ اور جغرافیہ کا اُستاد اُن جیسا دوسرے اسکولوں میں نہیں تھا۔ عربک ہائی اسکول کے اُستادوں کو اپنے شاگردوں سے کیا تعلق رہا ہے اُس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ماسٹر ذاکر حسین پنشن لینے اور بہت بوڑھے ہو جانے کے بعد روز صبح ایڈورڈ پارک کے ٹھنڈی سڑک والے دروازے کے قریب چبوتری پر آ بیٹھتے تھے۔ میں ادھر سے گزرتا اور وہ مجھے دیکھ لیتے تو کھڑے ہو جاتے۔ میں نے ایک دفعہ عرض کیا۔ حضرت! میں آپ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمانے لگے۔ میاں! اللہ نے تمھیں عزّت دی ہے۔ ہم اُس عزّت کو نہیں بڑھائیں گے تو اور کون بڑھائے گا۔

ایسا ہی اور سب اُستادوں کا حال تھا۔ کس کس کا اور کیا کیا حال کہوں۔

میرے لڑکپن میں دلّی کے چار مسلمانوں کو علمی و ادبی اعتبار سے سارے ملک میں امتیاز حاصل تھا۔ شمس العلما مولوی نذیر احمد ال۔ ڈی، شمس العلما

[illegible] ۱۹۱۱ [illegible]

مولوی محمد حسین آزاد، شمس العلما منشی ذکاء اللہ، شمس العلما مولوی ضیاء الدین ال۔ ال۔ ڈی۔ غیر مسلموں میں ماسٹر رام چندر اور ماسٹر پیارے لال آشوب اِن کے ساتھی تھے۔ شمس العلما مولوی الطاف حسین حالیؔ پانی پتی کو بھی دِلّی ہی کا شمار کرنا چاہیئے۔ اوّل تو پانی پت دلّی کا محلّہ ہے۔ دوسرے مولانا حالیؔ پانی پت میں ٹِکے کب تھے۔ اُنھوں نے عمر کا جتنا حصّہ دلّی میں بسر کیا۔ پانی پت میں نہیں کیا۔ اور کہیں اور بھی وہ اتنا نہیں رہے جتنا دِلّی میں رہے۔ لہٰذا کہنا چاہیئے کہ دلّی کے چار مسلمانوں کو نہیں پانچ مسلمانوں کو علمی و ادبی اعتبار سے ملک میں امتیاز خاص حاصل تھا اور ملک بھر میں اُن کی شان کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ اور ہاں سرسید احمد خاں۔ وہ بھی تو دِلّی کے تھے اور کوچہ چیلان کے، یعنی میرے پیارے محلّہ کے۔ وہ اِن سب کے پیشوا تھے خصوصاً نذیر احمد۔ ذکاء اللہ اور حالیؔ کے۔ محمد حسین آزاد اور ضیاء الدین کا سرسیّد سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ لیکن تھے یہ دونوں بھی سرسیّد ہی کے رُجحانات سے متاثر۔

شعرا میں نواب مرزا داغؔ زندہ تھے۔ وحید الدین بیخودؔ۔ نواب سراج الدین سائلؔ۔ آغا شاعر قزلباش اور مولانا عبدالرحمٰن راسخؔ کو بھی ہوش سنبھالا تو نمایاں پایا۔

۱ مولانا راسخؔ نے ایک ماہنامہ جاری کر رکھا تھا۔ اُردو ماہناموں میں

مولانا فقیر محمد۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی ضیاء الدین۔ ماسٹر رام چندر۔ ماسٹر پیارے لال۔ مولانا حالی۔ سرسید احمد خاں۔

www.taemeernews.com

اُس وقت تک نثر کے مضامین عموماً نہیں چھپتے تھے۔ نثر کا پہلا ماہنامہ جس کی دلی نے تقلید کی لاہور کا مخزن تھا۔ مخزن خود لاہور سے دلی آگیا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی آغا شاعر کے شاگرد جنیشور پرشاد مایل نے رسالہ زبان نکالا۔ مولانا راشد الخیری نے تمدن اور عصمت۔ خواجہ حسن نظامی نے اور میں نے نظام المشائخ۔

مجھے نوجوانی میں شاعری کا شوق تھا اور میں مولانا راسخ کے گلدستے کے لئے غزلیں لکھا کرتا تھا۔ مولانا راسخ کے ایک شاگرد محمد مرزا مشتاق میرے پڑوسی تھے۔ وہ مصرع طرح بتا دیتے تھے اور میں جو غزل لکھتا اُس کی اصلاح کر دیا کرتے تھے اور مولانا راسخ کے گلدستہ مذاقِ سخن میں چھپوا دیتے تھے غزلیں چھاپنے والے رسالے ماہنامے یا رسالے نہیں کہلاتے تھے، گلدستے کہلاتے تھے۔

پہلی دفعہ جب میری غزل مذاقِ سخن میں چھپی ہے تو کیا بتاؤں کتنی خوشی ہوئی تھی۔ محمد مرزا مشتاق نے صبح کے وقت مطلع کیا کہ میاں! تمہاری غزل چھپ گئی ہے۔ شام کو مغرب کے لگ بھگ آؤں گا تو دکھاؤں گا۔ جی چاہا کہ کہوں۔ ابھی کیوں نہیں دکھاتے جاتے۔ لیکن خیر ضبط کیا۔ البتہ مغرب سے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے قبل اپنے مکان کی چھت پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ بار بار سڑک کو دیکھتا تھا کہ محمد مرزا آ رہے ہیں یا نہیں۔ کم ایسا کسی کا انتظار کیا ہے جیسا اُس دن محمد مرزا کا کیا تھا۔

www.taemeernews.com

ہیں مولانا راسخ سے ملا کبھی نہیں۔ مولانا حالی کی بھی دور ہی سے زیارت کی۔ دونوں میری نوجوانی میں رحلت کر گئے تھے۔ اور میں تو ملنے جلنے کا آج بھی چور ہوں۔ مگر مولانا راسخ کا وعظ جمعہ کے جمعہ سنتا رہتا تھا۔ ابتدا میں مولانا راسخ نرے کھرے شاعر تھے۔ اُن کے والد مولوی محمد حسین فقیر بڑے پایہ کے مولوی گزرے ہیں۔ بڑے بھائی مولوی حبیب الرحمٰن بھی مولوی تھے۔ نیز چھوٹے بھائی مولوی محمد ابراہیم مولوی تھے اور سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحٰق علم دین حاصل کر رہے تھے۔ لیکن مولانا راسخ کو مولویت سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ مولوی محمد حسین فقیر اُن سے خفا رہتے تھے۔ مولانا راسخ کی طبیعت علم دین کی طرف جوانی ڈھلنے کے بعد آئی۔ پھر اُنھوں نے درس نظامی باقاعدہ پڑھا اور بھائیوں اور باپ سے بازی لے گئے۔

جامع مسجد کے سامنے جس مسجد میں مولانا احمد سعید وعظ کہا کرتے تھے، یہ مسجد مولانا راسخ کی تھی۔ مولانا راسخ کے معتقدوں نے اسے از سرِ نو تعمیر کیا تھا اور وسعت دی تھی۔ مولانا احمد سعید وعظ گوئی میں مولانا راسخ کے متبع ہیں۔ مولانا احمد سعید کی گل افشانی سے مولانا راسخ کے وعظ کی بہار کا اندازہ کیجیے۔ اُن کا قال حال تھا۔ شاعری کا زمانہ طویل رہا اور قال و حال کا زمانہ قلیل۔ مگر یہ قلیل زمانہ حسنات سے اوپر تک بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا راسخ کا انجام زمین پر بہت اچھا کر دیا۔ اُمید ہے آسمان پر بھی نوانا ہوگا۔

منشی ذکاء اللہ میرے ہم محلہ تھے۔ میرے بزرگوں سے اُن کا میل جول تھا۔ میں نے نظام المشائخ جاری کیا تو اُنھوں نے اُس کے واسطے تابڑ توڑ مضامین لکھے۔ میں منشی ذکاء اللہ کی خدمت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ منشی ذکاء اللہ کی زندگی مشین جیسی تھی۔ بلکہ مشین رُک سکتی ہے، منشی ذکاء اللہ کے مشاغل اور معمولات نہیں رُکتے تھے۔ جس کام کا جو وقت مقرر کر لیا تھا اُسے وہ مقررہ وقت پر ضرور انجام دیتے تھے۔ میری زندگی میں بھی مشین پن ہے۔ یہ منشی ذکاء اللہ ہی کی صحبت کا اثر ہے۔

منشی ذکاء اللہ رہتے اپنی قدیم حویلی میں تھے، کٹرہ مہر پرور کے بالمقابل، اور لکھتے پڑھتے اپنے بیٹے عنایت اللہ کی کوٹھی میں تھے، جو میرے اور مسٹر آصف علی کے مکانوں کے درمیان سڑک پر واقع ہے[1]۔ صبح ناشتہ کر کے کوٹھی آجاتے تھے اور دوپہر تک لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ کھانا کھانے گھر جاتے اور کھانا کھا کر اور قیلولہ کر کے پھر کوٹھی آتے۔ شام کو ہمیشہ ایک ہی راستہ سے چاندنی چوک جاتے اور میونسپل ٹاؤن ہال کے غرب رویہ کونے کے کمرہ میں یا کمرہ کی چھت پر مولوی ضیاء الدین۔ مولوی نذیر احمد۔ ماسٹر رام چندر اور ماسٹر پیارے لال آشوب اور میونسپل کمیٹی کے چند بوڑھے ہندو مسلمان ممبروں کے ساتھ بیٹھتے۔ راستہ میں سر سید احمد خاں کے بڑے

---

[1] مولانا محمد علی کا دفتر کامریڈ و ہمدرد اس کوٹھی کے بالکل سامنے تھا۔

www.taemeernews.com

بیٹے کپتان سید حامد کا مکان پڑتا تھا جس وقت منشی ذکاء اللہ سید حامد کے مکان کے آگے پہنچتے تھے۔ سید حامد ازراہِ مذاق گھڑی ملانے لگتے۔ یہ مذاق بھی تھا اور واقعہ بھی۔ سید حامد کے مکان کے آگے پہنچنے کے وقت میں فرق نہیں ہوتا تھا منشی ذکاء اللہ وقت پر نکلتے تھے۔ نپی تلی رفتار سے چلتے تھے اور ٹھیک وقت پر سید حامد کے مکان کے آگے ہوتے تھے۔

بے حد قاعدہ ضابطہ کے آدمی تھے۔ میں نے گھر سے باہر اُنھیں کبھی انگرکھا اور چُغہ پہنے اور عمامہ باندھے بغیر نہیں دیکھا۔ گھر سے کوٹھی بالکل پاس تھی۔ مگر وہاں بھی آتے تو انگرکھا اور چُغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر آتے۔ جُوتی، لال زری کی دیسی استعمال کرتے تھے۔ انگریزی جوتا عمر بھر استعمال نہیں کیا۔

چھیاسی ستاسی سال عمر پائی۔ انتقال سے پہلے اُن کے معالج ڈاکٹر ہیم چند رسین کہا کرتے تھے کہ اعضاءِ رئیسہ سب ٹھیک ہیں لیکن عمر کا کیا علاج کروں۔ عمر موت کو بُلا رہی ہے۔

بسترِ مرگ پر پڑے پڑے روزانہ صبح گذشتہ چوبیس گھنٹوں کی کیفیت لکھ لیتے تھے، یا لکھوا لیتے تھے۔ جو مزاج پُرسی کے لئے جاتا، زبانی جواب دینے کی بجائے لکھی ہوئی سرگزشت اُس کے آگے سرکا دیتے تھے۔ اُسی زمانہ میں ایک روز مجھ سے فرمایا میں نے حساب لگایا ہے۔ تمام تصنیفات اور تمام مضامین، اگر فلسکیپ کاغذ کے اوپر نقل کئے جائیں تو فلسکیپ کے دو لاکھ صفحوں میں

آئیں گے گویا ساری عمر میں دو لاکھ صفحے فلسکیپ سائز کے لکھے۔ انتقال سے چند دن پہلے کمرہ کی کھڑکی کے پاس پلنگ پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھے تھے۔ میں حاضرِ خدمت تھا سامنے ایک ضعیف العمر شخص جاتا نظر آیا۔ بارہ تیرہ برس کی لڑکی اُس کی چڑھی پر سوار تھی۔ فرمایا۔

" دیکھو یہ بڑا آدمی ہے۔ آج بارہ تیرہ برس اِس بچی کی ماں کو
مرے ہوئے گزر چکے۔ بچی پیدائشی مفلوج ہے۔ چل پھر نہیں
سکتی۔ دماغ بھی ماؤف ہے۔ مگر بارہ تیرہ برس سے بڈھا
اِسے اُٹھائے اُٹھائے پھر رہا ہے۔ گو۔ موت اور رال کے
دریا بڈھے کے اوپر بہہ جاتے ہیں لیکن بوڑھا نہیں گھبراتا۔
اللہ کا خوف ہے۔ یا بیٹی کی محبت، یا مرنے والی بیوی سے
وفاداری، بہر حال اِس بوڑھے میں بڑی پاکیزہ روح کارفرما ہے۔
تم آیندہ نہ جانے کیسے کیسے بڑے آدمی دیکھو گے،
مگر اِس نوعیت کے بڑے آدمی شاید اب نہ پیدا ہوں "

میونسپل کمیٹی کے جس کمرہ میں منشی ذکاء اللہ وغیرہ بیٹھتے تھے۔ میونسپل کمیٹی سے کہہ کر اُس کمرہ میں اِن حضرات نے ریڈنگ روم قایم کیا۔ پھر ریڈنگ روم کے ساتھ اُسے لائبریری بنا دیا۔ کتابیں کچھ میونسپل کمیٹی نے خرید دیں اور کچھ بانیان لائبریری نے مہیا کیں۔

میں اِس لائبریری کا اوّل دن سے ممبر تھا۔ بعد میں یہ لائبریری بیگم کے باغ ہی میں وہاں منتقل ہوئی جہاں پھر تیسرے درجہ کے آنریری مجسٹریٹ عدالت کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں حاجی بخش الٰہی سی۔ آئی۔ ای کی تحریک سے اِس کے لئے لارڈ ہارڈنگ کے بم سے بچ جانے کی یادگار کے طور پر عظیم الشان عمارت تیار کی گئی اور لائبریری کا نام ہارڈنگ لائبریری قرار دیا گیا۔ میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک ہارڈنگ لائبریری کی گورننگ باڈی میں بھی رہا ہوں۔

حاجی بخش الٰہی سرکٹ والے

حاجی بخش الٰہی نے پچاس ہزار روپیہ اِس لائبریری کے عمارت فنڈ میں دیا تھا۔ حاجی صاحب اُس زمانے کے نامور اور بڑے کامیاب مسلمان تھے۔ دِلّی کی پنجابی برادری سے اُن کا تعلق تھا۔ کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے۔

دلی کا ایک تاریخی مکان

اوپر رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے دفتر کامریڈ و ہمدرد کا حوالہ آیا ہے۔ دفتر ہی کے ایک حصہ میں مولانا محمد علی علیہ الرحمہ رہتے بھی تھے۔ یہ دِلّی کا ایسا تاریخی مکان ہے کہ بھارت کی حکومت کو اسے محفوظ کر دینا چاہیئے۔

جامع مسجد کے جنوبی دروازہ سے سیڑھیاں اُتر کر سیدھے سامنے کی طرف چلئے اور مٹیا محل اور حویلی اعظم خاں ہوتے ہوئے چتلی قبر کی جانب مڑئیے اور خانقاہ شاہ ابوسعیدؒ و شاہ ابوالخیرؒ کے پاس سے گزر کر

www.taemeernews.com

ترکمان دروازہ پہنچ جائیے وہاں سے فصیل[1] دلی دروازہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی (جہاں آخری زمانہ میں انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا) اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی سے لال قلعہ اور لال قلعہ سے ایڈورڈ پارک اور درگاہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی درمیانی سڑک طے کر کے جامع مسجد کے مشرقی دروازہ کے نیچے شاہ ہرے بھرے اور سرمد شہید کے مزارات کے آگے رک جائیے[2]۔ ان حدود کے اندر کا چپہ چپہ تاریخی ہے۔ شاہ جہاں کی دلی کا پہلا مکان انہی حدود میں تھا یعنی مٹیا محل۔ یہ کچا پکا مکان تھا جس میں بیٹھ کر نگران عملہ جامع مسجد اور لال قلعہ اور سارے شہر کی تعمیرات کی نگرانی کرتا تھا۔ مٹیا محل اب پورا محلہ ہے۔

ان ہی حدود میں حضرت شاہ عبدالرحیم۔ حضرت شاہ ولی اللہ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز۔ حضرت شاہ رفیع الدین۔ حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین رہتے تھے۔ بازار کلاں محل گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز[3] میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ تھا۔ کوچہ چیلان کی اس

---

[1] ۱۹۴۷ء تک ترکمان دروازہ اور دلی دروازہ کے درمیان شاہجہانی فصیل باقی تھی۔ فصیل یعنی شہر کی چار دیواری۔ اب فصیل توڑ دی گئی ہے اور فصیل کی زمین پر عالیشان عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔

[2] یہیں مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام کے مزارات بھی ہیں۔

[3] گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیز اب تو چھوٹا سا محلہ ہے لیکن کبھی ایک وسیع مکان تھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۴۰ پر)

www.taemeernews.com

مسجد میں جسے اب کالے خاں کی مسجد کہتے ہیں حضرت شاہ رفیع الدین درس دیتے تھے یہ مسجد بالکل میرے مکان کے بالمقابل ہے۔ سڑک کے پار اور نزدیک ہی مولانا محمد علی کے دفتر ہمدرد سے متصل کیکر والی مسجد میں حضرت شاہ عبدالقادر کا درس ہوتا تھا۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ دلّی کے اسی حصّہ کے باشندہ تھے حضرت خواجہ میر دردؒ یہیں پلے بڑھے۔ بارہ دری خواجہ میر درد کوچہ چیلان میں ہے۔ گلی مفتی والان حضرت شیخ عبدالحق محدث کی اولاد کے واسطے مختص تھی۔

ابقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۹) جو محمد شاہ (بادشاہِ ہند) نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے والد حضرت شاہ ولی اللہؒ کو اُن کے مدرسہ رحیمیہ کی تنگ دامنی دور کرنے کے خیال سے دیا تھا۔ مدرسہ رحیمیہ اُس زمانے کی "پرانی دلّی" کے کوچہ شیخ نزد میں واقع تھا۔ کوچہ نزد ر عرصہ دراز سے مہندیوں یا مہدیوں کا قبرستان بن گیا ہے اور عہد مغلیہ کی پرانی دلّی ۱۶۴۸ء سے نئی دلّی ہے۔ محمد شاہ کے پیش کردہ مکان پر حضرت شاہ ولی اللہ تھوڑے دن درس دے سکے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے بہت دن درس دیا۔ اس لئے وہ مکان مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہوگیا۔ مکان کے گنبد کی ڈاٹ اور صدر دروازہ کی چوکیاں ہنوز موجود ہیں۔ لیکن آثار عمارتوں کے اندر دب کر غیر محسوس ہوگئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد حضرت کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ اس مدرسہ کے نگراں رہے۔ شاہ محمد اسحٰق کے جانشین شاہ عبدالغنی مجددیؒ ہوئے، جن کے مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس) اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شاگرد تھے۔ دیوبند اور گنگوہ میں دینی علوم کی جو شمعیں روشن ہیں وہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز ہی سے روشن ہوئی ہیں۔

www.taemeernews.com

حکیم مومن خاں کا مکان بھی کوچہ چیلان میں تھا۔ ان کی گلی پر میں نے کمیٹی سے
کہہ کر "گلی مومن خاں" کا بورڈ آویزاں کرا دیا تھا۔ سر سیّد احمد خاں کا مولد
مسکن بھی یہیں تھا۔ اُن کے مکان کے آگے کی سڑک کا نام میں سر سیّد احمد روڈ
رکھوا آیا ہوں۔ سر سیّد کے بیٹوں کپتان سیّد حامد اور جسٹس سیّد محمود کا مولد مسکن
ہی ظاہر ہے یہی علاقہ تھا۔ سر سیّد کا اور سر سیّد کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں کا
سارا خاندان یہیں رہتا تھا۔ سیّد محمد علی جج اور پرنسپل مرزا محمد سعید (سیّد
محمد خاں کے نواسے اور پر نواسے) بھی اسی علاقہ سے نسبت رکھتے ہیں۔ منشی
ذکاء اللہ۔ مسٹر عنایت اللہ۔ قاری سرفراز حسین اور مولانا احمد سعید۔ کپتان
حبیب الرحمٰن سی۔ آئی۔ ای۔ خواجہ فضل احمد شیدا۔ بھتیا احسان الحق، میر
ناصر نذیر فراق۔ میر جالب۔ میر باقر علی داستان گو۔ اور مسٹر آصف علی سب
اسی علاقہ کے باشندے ہیں مفتی کفایت اللہ پچاس برس اسی علاقے میں
رہے۔ ڈاکٹر انصاری نے قیام دہلی کا سارا زمانہ اِدھر ہی گذارا۔ خواجہ حسن نظامی
کا بھی اِس علاقہ سے غیر معمولی اور مسلسل تعلق رہا۔ مولانا شوکت علی کی خدامِ کعبہ
کا مرکزی دفتر مولانا محمد علی کے دفتر ہمدرد کے قریب ہی تھا۔ مولانا راشد الخیری
کا مکان اور دفتر رسالہ عصمت اسی علاقے میں تھا۔ خواجہ عزیز حسن بقائی
کا رسالہ پیشوا[1]۔ مولوی عبد الحمید کا رسالہ مولوی۔ سردار دیوان سنگھ مفتون

---

[1] پیشوا اب بند ہے۔

www.taemeernews.com

کا اخبار ریاست اور پیرجی عبداللہ فاروقی کا رسالہ الخاتون شرقی چاروں پرچے اب بھی اسی علاقہ سے نکلتے ہیں اور میرے اور خواجہ حسن نظامی کے متعدد اخباروں اور رسالوں کا مدفن یہی علاقہ ہے۔

غرضکہ دلّی کا یہ ٹکڑے کا ٹکڑا اپنے ساتھ تاریخ وابستہ رکھتا ہے۔ مگر میں یہاں اس ٹکڑے کے صرف ایک مکان کی تاریخ عرض کرتا ہوں۔ یہ مکان کوچہ چیلان میں مسٹر آصف علی کے مکان کے برابر اور منشی ذکاءاللہ ماسٹر عنایت اللہ کے دیوانخانہ کے مقابل واقع ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ کی مسجد سے متصل۔

اس وسیع اور بلند عمارت کو حاجی علی جان والے، حاجی عبدالغفار نے ۱۸۹۹ء میں تارکشی کے کارخانہ کے لئے اُمنگ اور شوق سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ دلّی کے مسلمانوں کا واحد مِل تھا۔ مِل میں مشینوں اور انجن کے ذریعہ تارکشی کی جاتی تھی۔ لیکن مِل چل نہ سکا۔ مکان آج کل حاجی عبدالغفار کے فرزند حاجی محمد صالح کی ملکیت ہے۔

اتنا جہاز کا جہاز مکان کرایہ پر کون لیتا۔ چند دن کے واسطے ریاست ٹونک کے ایک ولی عہد باپ سے بگڑ کر اس مکان میں آگئے تھے یا ۱۹۱۱ء کے دربار میں ریاست مانگرول اور ریاست مانادر کے نوابوں نے یہاں دربار کا مہینہ بسر کیا تھا۔ ورنہ مکان خالی پڑا رہتا تھا۔

www.taemeernews.com

مستقل کرایہ دار کی حیثیت سے اوّل اس میں شیخ محمد اکرام
ب ایڈیٹر رسالہ مخزن بسے۔ مخزن شیخ عبدالقادر٭ کا رسالہ تھا، شیخ
بدالقادر بیرسٹری پاس کر کے لندن سے لوٹے تو انھوں نے پریکٹس
لی میں شروع کی اور مخزن کا دفتر لاہور سے دلی منتقل کر لیا۔ شیخ عبدالقادر
نے اپنی سکونت اور اپنی رہائش تو کچہری کے قریب محلہ کشمیری دروازہ میں رکھی تھی۔
ر مخزن کے لئے اور شیخ محمد اکرام کے رہنے کیلئے یہ میل والا مکان منتخب کیا تھا۔

شیخ عبدالقادر بلا ناغہ روز شام کو دفتر مخزن میں تشریف لاتے تھے۔
ر رات گئے تک ٹھیرتے تھے۔ پھاٹک سے ملحق دربان کی کوٹھری کے آگے
یک چبوترہ تھا، اس پر نشست ہوتی تھی۔ دلی کے اور باہر کے اکثر شاعروں
ر ادیبوں کو میں نے اوّل مرتبہ اسی چبوترے پر دیکھا۔ بزرگوں کی باتیں سننے
ں بھی اس مجلس میں جا بیٹھتا تھا۔

شیخ محمد اکرام کے بعد علی برادران کوچہ چیلان میں تشریف لائے۔
دام کعبہ کا دفتر کوچہ چیلان کے نکڑ پر سید محمد علی جج کے مکان میں تھا۔
لانا شوکت علی رہتے بھی وہیں تھے۔ اور مولانا محمد علی، والدہ محمد علی، یعنی
اماں اور بیگم محمد علی اس میل والے مکان میں رہتے تھے۔ کامریڈ مولانا
د علی کلکتہ سے ساتھ لائے تھے۔ روزنامہ ہمدرد یہاں سے جاری کیا گیا تھا۔

٭ سر عبدالقادر

www.taemeernews.com

ہندوستان کا کوئی ہندو مسلمان ادیب اور شاعر ہو گا جو شیخ عبدالقادر کے زمانہ میں اس مکان میں نظر نہ آیا ہو۔ مولانا محمد علی کے دور میں یہ ہندوستان کے سیاسیین کا مرکز بن گیا تھا۔

مولانا محمد علی تحریک خلافت کے قائد اعظم تھے اور کانگریس کی صدارت کے باعث ہندو لیڈروں کا بھی اُن کے گرد جمگھٹا رہتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو مولانا محمد علی کی صدارت کے زمانے میں کانگریس کے سکرٹیری تھے۔ گاندھی جی نے اکیس روز کا برت اسی مکان میں رکھا تھا۔ برت کی ابتدا۔ برت کے اختتام اور برت کے درمیان کے نظارے میری آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی یگانگت کا عجیب وغریب دور تھا۔

اس مکان سے ہندوستان کے جیسے جیسے ممتاز لوگوں کا واسطہ رہا، ہندوستان بھر میں بس پنڈت موتی لال نہرو کے آنند بھون اور گاندھی جی کی کُٹی ہی سے شاید اور رہا ہو گا۔ اور ایک خصوصیت کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ مولانا محمد علی کے ہاں بڑے سے بڑے آدمی بھی پہنچتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی بھی پہنچتے تھے۔

یہ مکان دلی کی طرح بستا اور اُجڑتا رہتا ہے۔ بستا ہے تو رونق کی انتہا نہیں رہتی اور اُجڑتا ہے تو بھائیں بھائیں کرنے لگتا ہے۔ اُجاڑ ہو جاتا ہے۔

غیر مکان کا ذکر چھوڑیئے اور مولوی نذیر احمد کا حال سنئے۔ منشی ذکار اللہ کے بعد مولوی نذیر احمد ہی کو لینا تھا۔ مکان کا ذکر ضمناً آگیا۔

مولوی نذیر احمد کے ہاں بس ایک مرتبہ خواجہ صاحب کے ساتھ مجھے جانے کا شرف ملا۔ کرتہ آدھے، تہ بند باندھے، کھری چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ چارپائی کمرہ میں بچھی ہوئی تھی۔ چارپائی کے آگے تین چار مونڈھے پڑے تھے۔ ہم مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ خواجہ صاحب نے باتیں کرتے کرتے پوچھا۔ حضرت! آپ کی پردہ کے متعلق کیا رائے ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کا ناول "زیب النساء کی مصیبت" پردہ کے خلاف نیا نیا نکلا تھا۔ جس نے پردہ کی بحث چھیڑ رکھی تھی۔ مولوی نذیر احمد نے گرج کر کہا۔ "کس کے پردہ کے متعلق سوال ہے۔ لڑکیوں کے یا لڑکوں کے؟ میری رائے میں تو آجکل لڑکوں کو بھی پردہ کرنا چاہیئے"۔

ڈپٹی نذیر احمد ایل ایل ڈی ۔ ۱۸۳۱ء — ۱۹۱۲ء

۱۹۱۱ء تک بے پردگی دلی والوں کے نزدیک اتنی معیوب تھی کہ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی دلی آکر بسے اور اُن کے ساتھ بیگم محمد علی برقعہ اوڑھے اور منہ چھپائے تانگہ میں نکلیں تو دلی والوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ تانگہ پر پردہ کیوں نہیں لپیٹا گیا۔

برقعہ اوڑھ کر پھر نا دلی میں وصولی سقوں کا شیوہ سمجھا جاتا تھا۔ شریف عورتیں کہیں جاتی تھیں تو پالکیوں یا ڈولیوں میں جاتی تھیں۔ گھوڑا گاڑی بھی عورتوں کے واسطے پالکی نما ہوتی تھی جو پالکی گاڑی ہی کہلاتی تھی۔ مرد بھی پالکی گاڑیوں میں بیٹھتے تھے لیکن عورتیں کھلی گاڑیوں، لینڈو اور فٹن وغیرہ میں نہیں بیٹھتی تھیں۔ تانگے

www.taemeernews.com

دلّی میں سنہ ۱۹۱۰ء سے چلے ہیں۔ تانگوں کو عورتوں نے قبول نہیں کیا تھا، اور مجبوراً بیٹھتیں تو تانگہ کے گرد فرشی چاندنی یا جاجم لپیٹ لی جاتی تھی اور تانگہ کو یکّہ بنالیا جاتا تھا۔ یکّہ دلّی کی عورتوں کے نزدیک تانگہ سے بہتر سواری تھی۔ پردہ دار ہونے کے سبب۔

پردہ دار سواریوں میں بھی سوار ہوتے وقت سڑک کے ناکوں پر کنبے کے مرد کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ غیر مردوں کو روک دیں اور اس کے باوجود گاڑی کے دونوں جانب چادریں تانی جاتی تھیں۔ تب بیگم صاحبہ گاڑی میں قدم رنجہ فرماتی تھیں۔ کیا وزیروں اور بادشاہوں کی خواتین کا ٹھاٹ ہوگا جو غریب شرفائے دہلی اپنی تنخواہ کا دکھاتے تھے۔ کم از کم پردہ کے شاندار مظاہرہ کے اعتبار سے دلّی کی عورتیں آجکل کے وزیروں اور بادشاہوں کی عورتوں پر فائق تھیں اور مولوی نذیر احمد تو وزیروں اور بادشاہوں سے اونچے تھے ہی۔ وہ پردہ کی بھلا کیسے حمایت نہ کرتے دلّی والوں نے بے پردگی کے اعتبار سے جتنی ترقی اسلامی مملکت پاکستان پہنچ کر کی ہے، انگریزوں کی دلّی میں نہیں کی تھی۔ ۵ــــ ۱۹۵۶ء کی روشن خیالیوں کا ۱۹۴۷ء تک پتہ نہیں تھا۔

منشی ذکاء اللہ ضابط اور خاموش طبیعت کے انسان تھے۔ اُن کے ہاں بیٹی ہوئی ہی نہیں۔ بیٹی ہوتی اور کوئی آجکل کی سی غلطی کرتی تو منشی ذکاء اللہ اُسے سلو پوائزن (SLOW POISON) پلاتے اور خاموشی سے

قبریں سُلا دیتے۔ مولوی نذیر احمد کی طبیعت مرحوم سُلطان ابن سعود سے مشابہ تھی۔ مولوی نذیر احمد غلطی کرنے والی اور غلطی کرنے والے کو علی الاعلان سنگسار کرکے رہتے۔

مولانا محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد کو میں نے اُس دن دیکھا، جس دن مولانا عالم وارفتگی میں لاہور سے دلّی پیدل پہنچے تھے۔ منشی ذکاء اللہ کے ہاں۔ اُن کی بابت اُسی قدر جانتا ہوں جس قدر سب جانتے ہیں۔

مولوی ضیاء الدین سے بھی مجھے سابقہ نہیں پڑا۔

ماسٹر پیارے لال آشوب

ماسٹر پیارے لال آشوب کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ صاحب خمخانۂ جاوید لالہ سری رام، ایم۔ اے کے چچا تھے۔ خود بھی ایم۔ اے تھے۔ رائے بہادری کا خطاب تھا۔ نئی سڑک پر رہتے تھے۔ کایستھ تھے۔ کرنل ہالرائیڈ (سررشتۂ تعلیم پنجاب کے پہلے ڈائرکٹر) کے مزاج میں انھیں دخل تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی۔ مولوی سید احمد، مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ مولوی حوجان۔ اور مرزا بیگ خاں بیدل (ساکن گلی ابنیا) کو ماسٹر پیارے لال آشوب ہی نے دلّی سے لاہور بُلوایا تھا اور کرنل ہالرائیڈ کی ماتحتی میں کام سے لگایا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اُس وقت کرنل ہالرائیڈ کے پیش کار تھے۔ آخر میں انسپکٹر آف اسکولز ہوگئے تھے۔ اُن سے قبل کسی ہندوستانی کو یہ عہدہ نہیں ملا تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔

www.taemeernews.com

مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی اور مرزا بیگ خاں بیدل بھی اُس دور کے ممتاز شاعر اور ادیب ہیں۔ ایک اور صاحب تھے مولوی سیف الحق۔ اُن کا تخلص ہی ادیب تھا۔ حیدر آباد دکن میں اونچے عہدہ دار تھے۔ مولوی سیف الحق ادیب کا تعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان سے تھا۔ یہ خاندان محلہ مفتی والان میں اُسی طرح یک جا رہتا تھا جس طرح حکیم شریف خاں کا خاندان بلی ماران میں یک جا رہتا تھا۔ اب سارا خاندان کراچی اور لاہور میں ہے۔ مولوی شمس الاسلام (سابق ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن بیورو) اور مسٹر رئیس الدین (ڈپٹی سکریٹری وزارت صحت) اسی خاندان کے افراد ہیں۔ (مولوی سیف الحق ادیب)

شعرا میں مولانا راسخ کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ منشی وحید الدین بیخود ابھی تک زندہ تھے۔ اُنھوں نے سو کے لگ بھگ عمر پائی۔ بیخود صاحب کے والد کی عمر بھی طویل ہوئی تھی۔ بیخود صاحب کے والد کو میں نے دیکھا ہے۔ میرے لڑکپن میں طویل عمروں کے آدمی کثرت سے تھے۔ ایک صاحب کو میں نے دیکھا جنھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ کو دیکھا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے والد شاہ ولی اللہؒ اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں پیدا ہو چکے تھے۔ اور ایک صاحب محمد مرزا خاں کو دیکھا جن کی عمر اتنی تھی کہ لوگ اُنھیں "نوح" کہنے لگے تھے۔ آغا شاعر کے والد کی عمر بھی خاصی تھی۔ وہ شیخ عبدالقادر کی مجلس میں کبھی کبھی آ جاتے تھے۔ (منشی وحید الدین بیخود)

نواب سائل کی عمر بیخود صاحب سے کم رہی اور آغا شاعر کی نواب سائل

www.taemeernews.com

لم۔ مگر مولانا راسخ کے بعد اوّل آغا شاعر سدھارے۔ پھر نواب سائل اور پھر حضرت
بیخود۔ بیخود صاحب مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ خصوصاً جب میں نے اور مسٹر
میح الدین نے رسالہ ادیب نکالا تو ادیب میں میرے مضامین پڑھ کر بڑی حوصلہ
فزائی کیا کرتے تھے۔

نواب سراج الدین سائل

سائل صاحب سے روشناس نہ جانے کب سے تھا لیکن میں اُن کے گھر
رف ایک دفعہ جا سکا۔ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار، لاہور کے ہمراہ۔ مولانا
فر علی خاں میرے ہاں مہمان تھے۔ اُنھیں سائل صاحب سے ملانا تھا۔ پھر سائل
احب نے وضع ایسی نباہی کہ انتقال سے کئی سال قبل ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں
شا میں پھرتے تھے۔ مگر میرے مکان کے آگے سے گذرتے تو رکشا رُکوا لیتے
ے اور مجھے بلا کر ملتے تھے۔ بغیر ملے نہ جاتے تھے۔

آغا شاعر

آغا شاعر کو جب دیکھا جب وہ خوب جوان تھے۔ آغا مجھ سے پندرہ سولہ برس
ے ہوں گے۔ لیکن کم عمری ہی میں اُن کی شاعری کی دھوم مچ گئی تھی۔ آغا شاعرؒ
خ۔ بیخود۔ اور سائل کی نسبت زیادہ زندہ دل تھے۔ سنئے۔ درگاہ حضرت خواجہ
م الدین اولیاء سے دلی آنے کے لئے میں نظام الدین ریلوے اسٹیشن پہنچا۔
م الدین ریلوے اسٹیشن اب ہمایوں کے مقبرہ کی طرف ہے۔ اُن دنوں منصور
قبو کی طرف تھا۔ اسٹیشن کے مسافر خانہ میں ایک صاحب سراپا شعر بنے یار دل
ہُرمٹ میں تشریف فرما تھے۔ برسات کا موسم ۔ ساون کا مہینہ۔ مینہ چھما چھم

www.taemeernews.com

برسنے لگا۔ جناب سراپا شعر نے کہا ؎

گھٹائیں دیکھ کر بیتاب ہے بےچین ہے شاعر
ترے قربان اے مطرب سنا دے کوئی موسم کی

مُطرب بھی ساتھ تھا۔ معلوم ہوا یہی آغا شاعر ہیں۔ اُن کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔ ہاں اُستاد! پوری غزل ہو جائے۔ آغا نے مطلع کہا ؎

یہ کیسے بال بکھرے ہیں، یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

آغا نے پوری غزل کہہ ڈالی اور شاگردوں نے اُسے نوٹ بکوں میں لکھ لیا۔ مجھے بس مطلع اور مقطع یاد رہ گیا ہے۔

آغا شاعر کی غزلیں گانے والوں اور گانے والیوں میں فوراً پھیل جاتی تھیں اور گلی گلی اور کوچے کوچے چھوٹے بڑے اُنھیں گاتے پھرتے تھے۔

آغا شاعر سے میرا تعارف شیخ عبدالقادر کی مجلس میں ہوا اور آغا شاعر نے بھی نواب سائل کی طرح تعلق اور وضع کو نباہا۔

آغا شاعر بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی تھے۔ راستہ چلتے میں کوئی ہوتا تو خاموش نہیں رہتے تھے۔ وہ میرے گھر کے اندر بعد میں گھستے تھے۔ اُن کی آواز پہلے گھس آتی تھی۔ آخر عمر میں مرثیے زیادہ لکھنے لگے تھے۔ مرثیہ پڑھتے تھے تو آدمیوں تک آواز چلی جاتی تھی۔ اس کے باوجود آواز میں لوچ تھا۔ خوب پڑھتے

www.taemeernews.com

اور خوب لکھتے تھے۔ دلّی والوں نے اُنھیں "حمّادِ اہلِ بیت" کا خطاب دیا تھا۔ دلّی کے دیوانے تھے۔ جوانی میں کُل موروثی جایداد بیچ ڈالی تھی۔ بڑھاپے میں دلّی سے باہر (غالباً ریاست جھالاواڑ میں) نوکری کرنی پڑ گئی۔ دلّی کا پھیرا کرتے تھے اور ملتے تھے تو آنسو نہ تھمتا تھا۔ ایک دفعہ دریبہ کے نکڑ پر چاندنی چوک میں آمنا سامنا ہو گیا۔ "ہائے میری دلّی۔ ہائے میری دلّی" کہہ کر لپٹ گئے اور اپنا اور میرا تماشہ بنا لیا۔

جن جن کا میں تذکرہ کر رہا ہوں، اُن کی سوانحِ عمریاں لکھنی مقصود نہیں ہیں۔ بعض اِن میں ایسے ہیں جن کی سوانحِ عمریاں چھپ چکی ہیں۔ جیسے مولوی نذیر احمد۔ اُن کی سوانحِ عمری "حیات النذیر" پڑھیے۔ اور ایسے حضرات اور بھی آئیں گے۔ مثلاً حکیم اجمل خاں۔ مولانا محمد علی۔ خواجہ حسن نظامی۔ حکیم اجمل خاں کی سوانحِ عمری "حیاتِ اجمل" قاضی عبدالغفار مرادآبادی لکھ گئے ہیں۔ مولانا محمد علی کی سوانحِ عمری مولوی رئیس احمد جعفری ندوی نے لکھی ہے۔ اور خواجہ حسن نظامی کی سوانحِ عمری میں اس کتاب سے الگ لکھ رہا ہوں[1]۔ اس کتاب میں تو میں ذاتی تاثرات قلمبند کرنے چاہتا ہوں کہ دلّی کے فلاں

---

[1] سوانحِ عمری حضرت خواجہ حسن نظامیؒ چھپ گئی ہے۔

www.taemeernews.com

مشہور شخص اور فلاں غیر مشہور شخص میں میں نے کیا خاص بات محسوس کی۔ وہ بات دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں نہیں ملے گی۔

حکیم محمد اجمل خاں

لگتے ہاتھ حکیم اجمل خاں کا حال ملاحظہ فرمایئے۔ حکیم صاحب سے ایک سال میرا روز کا سابقہ رہا۔ اُنھوں نے آل انڈیا یونانی اینڈ ویدک طبی کانفرنس کا آرگن "ہفتہ وار طبیب" نکالنے کے لیے مجھے منتخب فرمایا تھا اور جنوری ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک یہ اخبار میری ادارت میں نکلا۔

حکیم صاحب کی متانت اور سنجیدگی ضرب المثل ہے۔ مگر وہ روتی شکل کے متین اور سنجیدہ نہیں تھے۔ شگفتگی، بلکہ غیر محسوس مسکراہٹ اُن کے چہرہ پر رہتی تھی اور دن بھر اور آدھی رات تک کام کرنے کے باوجود کبھی ہز ہائی نس سر امیر الدین احمد خاں، نواب لوہارو (موجودہ نواب کے پردادا) اور نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں (نواب سائل کے بڑے بھائی) وغیرہ آجاتے تھے تو حکیم صاحب عارف قوالؔ سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیتے تھے۔

ؔ عارف خاں بہادر خاں کی چوکی کو میرے زمانے کی دلّی میں اس اعتبار سے امتیاز خاص حاصل تھا کہ عارف خاں بڑے قوال نہیں تھے گانے کا فن جانتے تھے۔ اور غالباً بہادر خاں بھی فن کے ماہر تھے۔ اُن کی چوکی تانرس خاں والوں کی چوکی کہلاتی تھی۔ تانرس خاں موسیقی کے استاد گذرے ہیں۔ تانرس خاں اصل میں تان رس خاں تھے۔ (باقی صفحہ ۱۵۳ پر)

www.taemeernews.com

حکیم صاحب کا ساد ما مئ توازن کسی دوسرے ہندو مسلمان لیڈر میں نہیں تھا۔ گاندھی جی میں ہو تو ہو۔ کانگریس کی شرکت سے پہلے ہندوستان بھر کے مسلمان لیڈروں پر اُن کی حکومت تھی۔ اکبرالٰہ آبادی کا شعر ہے ؎

(صفحہ ۱۵۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) تان رس خاں والوں کے علاوہ قوالوں کی یہ چوکیاں میرے زمانہ میں مشہور تھیں۔ (۱) یعقوب خاں ولایت خاں۔ ۱۹۱۰ء میں جب علامہ اقبالؒ نے یورپ کے لیے جاتے ہوئے حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی ہے تو یہی ولایت خاں تھے جن کا خواجہ حسن نظامیؒ نے مرقد غالب پر گانا کرایا تھا اور آخری غزل ولایت خاں نے مرزا غالب ہی کی گائی تھی۔ جس کا ایک شعر ہے ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

یہ شعر اس قدر برمحل اور مناسب موقع تھا کہ حاضرین تڑپ اُٹھے تھے۔ وہ قوال ہی کیا جسے محل اور موقع کا خیال نہ رہے۔ حال ہی میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں شیدا دلی آگئے تھے۔ انھوں نے مجھے دلی سے لکھا کہ جب میں حضرت سلطان المشایخ کے مزار پر حاضر ہوا تو سنوز خاں قوال کی چوکی گا رہی تھی۔ گانا چھوڑ کر سب گلے ملے۔ اور پھر سنوز خاں نے یہ غزل چھیڑی ؎

ساقیا صحبت دیرینہ جو یاد آتی ہے

(باقی صفحہ ۱۵۴ پر)

www.taemeernews.com

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ شیدؔ سے
قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں

سرسیدؔ۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے بعد یہ اڈا حکیم اجمل خاں کے ہاں منتقل ہو گیا تھا۔ تمام مسلمان لیڈر حکیم صاحب کے سامنے اس طرح بیٹھتے تھے جس طرح شاگرد اُستاد کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ ایک قائدِ اعظم محمد علی جناح کو تو میں نے حکیم صاحب کے ہاں دیکھا نہیں۔ باقی ایک ایک مسلمان لیڈر کو حکیم صاحب سے سبق لیتے دیکھا ہے۔ آجکل کے لیڈروں کا ذکر نہیں کر رہا۔ پچاس

(صفحہ ۱۵۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) منور خاں پُرانے قوالوں میں نہیں ہیں لیکن آپ نے اُن کی موقع شناسی ملاحظہ فرمائی۔ خیر دوسری پُرانی چوکی نھن خاں پیارے خاں کی تھی۔ تیسری نذیر کٹو کی۔ چوتھی صدیق عبدالقادر کی۔ صدیق ابھی زندہ ہیں۔ پانچویں قدرت اللہ خاں کفایت اللہ خاں کی۔ چھٹی عید خاں پھول خاں کی۔ ساتویں ایک قوال تھے مولا بخش۔ یہ تنہا گاتے تھے۔ چوکی نہیں بناتے تھے۔ ہاتھ میں ستار رہتا تھا اور زیادہ تر حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کی درگاہ میں حاضر رہتے تھے۔ مبر ایک سے بھی پُرانے اور قبل کے اُچی خاں کو میں بھول گیا۔ وہ بھی تنہا گاتے تھے اور سارنگی بے مثل بجاتے تھے۔ میرے بچپن میں بوڑھے تھے۔ خوب صورت، خوش پوش اور شریف خصلت قوال تھے۔

لہ سرسید احمد خاں، بانیٔ علی گڑھ کالج۔

www.taemeernews.com

پچپن برس پہلے کے لیڈروں کا ذکر کر رہا ہوں۔ قاید اعظم اُس زمانہ میں کانگریسی تھے اور حکیم صاحب کے کانگریسی ہوتے ہی قاید اعظم کی کانگریس سے چخ گئی۔ بہرحال قاید اعظم کو حکیم اجمل خاں کے دربار میں میں نے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کبھی میری عدم موجودگی میں آئے ہوں۔

حکیم صاحب نے کانگریس میں شرکت کی تو کانگریسی ہندوؤں اور کانگریسی مسلمانوں نے اُنھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ گاندھی جی کا جو قدم اُٹھتا تھا حکیم صاحب کے مشورہ سے اُٹھتا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے کم گوئی کی صفت عطا فرمائی تھی۔ بولنے کا ہَوْکا نہیں تھا۔ مختصر بات کہتے تھے، لیکن باوزن تُرلے پاؤرتی بات۔ حکیم صاحب کی کچی تُلی بات دوسرا کہہ نہیں سکتا تھا۔ گاندھی جی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا ابوالکلام۔ ڈاکٹر انصاری۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ اور مسٹر سی۔ آر۔ داس سب ہی حکیم صاحب کا لحاظ کرتے تھے۔

حکیم صاحب کو غصہ ضرور آتا ہوگا۔ لیکن غصہ سے مغلوب ہوتے اُنھیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ حکیم صاحب کی بیوی میری دُور کی اور میرے عزیزوں خواجہ فضل احمد اور خواجہ محمد احمد کی قریب کی عزیز تھیں۔ اس وقت بھی حکیم صاحب کی پوتی (بنتِ حکیم جمیل خاں) خواجہ محمد احمد کے لڑکے محمود احمد سے منسوب ہیں۔ مجھے حکیم صاحب کے گھریلو حالات کا علم ہے۔ حکیم صاحب گھر میں بھی بُردبار رہتے تھے۔ گھر والوں پر بھی نہیں بگڑتے تھے اور باہر ملازموں پر

www.taemeernews.com

بھی تیوری نہیں چڑھاتے تھے۔

طبیہ کالج کے ایک فیل شدہ طالب علم اور ایک برخاست شدہ انجنیر کے واقعات مجھے یاد آرہے ہیں۔ حکیم صاحب نے کس صبر وضبط سے دونوں کے پاگل پن کو برداشت کیا تھا۔ کام کی زیادتی سے انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ مگر حکیم صاحب کو اپنے اعصاب پر بلا کا قابو تھا۔

ایک دفعہ دودھ پیتے بچے نے حکیم صاحب پر پیشاب کر دیا۔ بچہ ماں کی گود میں تھا اور بچہ کی نبض حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ حکیم صاحب اِس طرح نبض دیکھتے رہے گویا حکیم صاحب کو پیشاب کی خبر نہیں ہوئی۔ نبض دیکھ چکے تو اطمینان سے نسخہ لکھوایا۔ بچہ کی ماں کو ہدایتیں دیں۔ اس کے بعد کھڑے ہو گئے۔ اور گھر میں چلے گئے۔ قالین فوراً بدل دیا گیا اور حکیم صاحب کپڑے بدل کر تشریف لے آئے اور مطب شروع کر دیا۔ یہ قصہ روز کا تھا۔ پھوہڑ مائیں بچوں کو پیشاب کرا کر نہیں لاتی تھیں اور گود میں بھی احتیاط سے نہیں لیتی تھیں۔ حکیم صاحب سب بے عقلیوں کو اور سب پھوہڑپنوں کو برداشت کرتے تھے۔ حکیم صاحب کے گھر میں جانے کے بعد حکیم صاحب کے آدمیوں نے بھی عورت سے کچھ نہیں کہا۔ کہنا حکیم صاحب کے منشاء کے خلاف تھا۔

ایک دفعہ میرا ملازم حکیم صاحب کے نام میرا خط لئے جا رہا تھا۔ حکیم صاحب اُسے کہیں بازار میں نظر آ گئے۔ اُس نے وہیں گاڑی رُکوا کر خط تھما دیا۔

www.taemeernews.com

حکیم صاحب نے کسی دوکاندار سے کاغذ اور قلم دوات منگایا اور جواب لکھا۔ چونکہ کاغذ پر دوکاندار کا نام پتہ چھپا ہوا تھا میرے علم میں اپنے ملازم کی بدتمیزی اور بیہودگی آگئی۔

ایک دفعہ یتیم خانہ انجمن مؤید الاسلام کا جلسہ حکیم صاحب کی زیر صدارت ہو رہا تھا۔ حکیم صاحب انجمن کے صدر رہتے تھے۔ خان بہادر مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی انجمن کے سکریٹری تھے اور خان بہادر نواب غلام محمد حسن خاں، آنریری مجسٹریٹ۔ اور شمس العلماء مولوی سید احمد، امام جامع مسجد وغیرہ حکیم صاحب ہی کے اکثر احباب انجمن کی منتظمہ کمیٹی کے ممبر تھے۔ جلسہ میں ایک صاحب نے یتیم خانہ کے انتظامات پر الٹے سیدھے اعتراضوں کی بوچھاڑ کردی۔ میں جلسہ میں بھی شریک تھا اور رات کو بعد نماز عشاء حکیم صاحب کے ہاں بھی حاضر ہوا۔ رات کو حکیم صاحب نے اپنے خدمت گار ادریس سے فرمایا۔ ادریس: فلاں صاحب گھر پر ہوں تو ذرا بلا لاؤ۔ وہ اعتراض کرنے والے صاحب بلی ماران میں حکیم صاحب کے مکان کے نزدیک رہتے تھے۔ خیر تھوڑی دیر میں وہ صاحب آگئے۔ حکیم صاحب نے تپاک سے بٹھایا۔ مزاج پرسی کی۔ ان کے والد کا حال پوچھا۔ پھر دریافت کیا۔ آجکل آپ کیا کر رہے ہیں؟ انھوں نے کہا۔ کچھ نہیں کر رہا۔ بے کار ہوں۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے سفیروں کی ضرورت ہے۔ کہئے تو صاحب زادہ

www.taemeernews.com

آفتاب احمد خاں کو خط لکھ دوں۔ اُن صاحب نے گردن جھکا کر عرض کیا۔ بڑا کرم ہوگا۔ ضرور لکھ دیجیے۔ حکیم صاحب نے انھیں سفارت دلوا دی۔ اگر بالفرض یہ محض "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کی تعمیل تھی تو بھی کیا بُری تھی۔ حکیم صاحب کے سے ظرف کے انسان ہی مخالفوں کی مخالفت احسان کرکے روکا کرتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ احسان کرنا حکیم صاحب کی عادت میں داخل تھا۔ حکیم صاحب اور شمس العلما مولوی سید احمد، امام جامع مسجد اور شمس العلما خواجہ حسن نظامی، دلّی کے تین حضرات نے خدا معلوم کتنے بیکاروں کو کار سے لگا دیا۔

حکیم صاحب کا سفارش نامہ ہر ضرورتمند لے سکتا تھا۔ امام صاحب ضرورتمندوں کے ساتھ جا جا کر سفارشیں کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کا ٹیلیفون کھڑکتا تھا۔ جس سے سفارش کرنی ہوتی ٹیلیفون اُٹھاتے اور اُس سے فرماتے۔ "کیا حسن نظامی کو آپ کے دفتر میں نوکری مل سکتی ہے؟" گویا جسے نوکری کے واسطے بھیج رہے ہیں اُسے نوکری دینا خواجہ حسن نظامی کو نوکری دینا ہے۔

دولت کی طرح علم اور فن بھی کسی خاندان کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ علم و فن بھی ایک دو نسل چلتا ہے۔

دِلّی کے علما میں شاہ عبدالرحیم کا خاندان ایسا تھا کہ اُن کے بیٹے شاہ ولی اللہ ہوئے اور پوتے شاہ عبدالعزیز۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ عبدالقادر۔ اور پڑپوتے

www.taemeernews.com

شاہ اسمٰعیل شہید۔ چوتھی پشت پر آ کر خاندان کی شان تھی۔ دِلّی کے اطبا میں حکیم محمود خاں کے خاندان کو یہ شرف بخشا گیا تھا۔ حکیم محمود خاں نے اپنے جد حکیم شریف خاں کا نام زندہ کر دیا اور پھر محمود خاں کے بیٹے حکیم عبد المجید خاں، حکیم واصل خاں، حکیم اجمل خاں تھے اور پوتے حکیم محمد احمد خاں اور حکیم محمد ظفر خاں۔ اور نواسے حکیم غلام کبریا خاں، عرف بھورے میاں۔ اِن حضرات کی حذاقت کا سارے مُلک میں بلکہ مُلک سے باہر مسلسل ایک صدی ڈنکہ بجتا رہا اور اِن کی خدمات دنیا صدیوں نہ بھلا سکے گی۔ حکیم اجمل خاں لندن گئے تو شہنشاہ جارج پنجم کچھ بیمار تھے۔ حکیم صاحب نے اُن کی نبض دیکھی اور صرف نبض دیکھ کر مرض بتایا۔ شاہی ڈاکٹر نے کہا۔ آپ نے مرض صحیح تشخیص کیا ہے۔ بغیر آلات کے صرف نبض پر ہاتھ رکھنے سے مرض کیسے معلوم ہو گیا۔

حکیم احمد سعید خاں، حکیم اجمل خاں کے بہنوئی اور حکیم غلام رضا خاں، حکیم احمد سعید خاں کے بڑے بھائی۔ یہ دونوں بھی اعلیٰ درجے کے طبیب تھے اور اِن رشتوں کے علاوہ اِسی خاندان کے افراد تھے۔ یعنی سب شریف خانی تھے۔

بلّی ماران کی شریف منزل اور کبریا منزل اِن حضرات کی وجہ سے مرجعِ خلائق تھیں۔ شریف منزل اور کبریا منزل میں میلہ سا لگا رہتا تھا اور برات سی اُتری معلوم ہوتی تھی۔

شریف منزل میں ایک ایک کے الگ الگ مکان اور دیوانخانے تھے۔

www.taemeernews.com

دیوان خانوں کے صحن میں ہلکا ہلکا چھڑکاؤ کیا جاتا۔ حکیم صاحبان کرسی دار مونڈھوں پر بیٹھتے۔ سامنے دو رویہ مریضوں کے لئے مونڈھے ہوتے اور حکیم صاحبان کے پیچھے نسخہ نویسوں کے تخت بچھتے۔

حکیم محمود خاں نے کچھ ادائیں اور وضعیں طرحیں قائم کردی تھیں۔ سارا خاندان اُن کا نمونہ تھا۔ دو پلڑی ٹوپی۔ انگرکھا۔ چوڑیدار پاجامہ۔ سلیم شاہی کامدار جوتی۔ بہت سردی پڑی تو ہلکا سا اونی چادرہ کندھوں پر ڈال لیا۔ ورنہ سردی گرمی کا ایک لباس[1]۔

---

[1] انگریزیت سے پہلے سب دلّی والوں کا قریباً یہی لباس تھا۔ لیکن حکیم محمود خاں کے خاندان نے اس لباس کو انگریزیت کے بعد بھی کلیجے سے لگائے رکھا۔ یہ لباس انگریزیت سے پہلے مسلمانوں ہی کا نہیں تھا، ہندوؤں کا بھی تھا۔ ہندوؤں کا قدیم لباس چادر۔ دھوتی اور ساری تھا۔ سلا ہوا کپڑا مرد صرف انگا پہنا کرتے تھے اور عورتیں انگیا۔ مسلمان ہندوستان آئے تو ملکوں ملکوں کا لباس لیتے ہوئے آئے اور پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول نے ہندوستان کی دوسری چیزوں کی طرح لباس کو خوب ترقی دی۔ انگیا کی بہن کرتی پیدا ہوئی۔ انگے کی آستینیں کہنیوں سے آگے بڑھیں اور انگے کی لمبائی کمر سے ٹخنوں تک پہنچ گئی۔

دھوتی کی لانگ نیچی کرکے باندھیئے تو شلوار کے مشابہ ہوجاتی ہے۔ دھوتی ہندوستان

(باقی صفحہ ۱۶۱ پر)

www.taemeernews.com

دلی میں یہ حضرات نہیں نہیں پہنتے تھے۔ امیر، غریب، راجہ، نواب کوئی

(صفحہ ۱۶۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) میں آریہ لائے تھے۔ آریوں نے ہندوستان میں دھوتی کو دھوتی ہی رکھا۔ مگر جہاں سے دھوتی چلی تھی وہاں وہ شلوار بن گئی۔ مسلمانوں کے ساتھ دھوتی شلوار کی شکل میں آئی۔ ترقی کرتے کرتے مغلوں کے دور میں ہندو مسلمانوں کا لباس یہ ہو گیا۔ سر پر پگڑی (ہندوؤں نے ننگے سر رہنا چھوڑا۔ مسلمانوں نے عمامہ کو خیرباد کہا۔ عمامہ اور پگڑی کی بندش اور وزن میں فرق ہے)۔ ٹانگوں میں ٹخنے کھلا تنگ مُہری کا پاجامہ۔ بدن پر نیمہ جامہ۔ کمر میں جامہ کے اوپر پٹکا۔ پاؤں میں ایڑی دار جوتی۔ نیمہ کہنیوں تک آستینوں کا ہوتا تھا اور جامہ کے نیچے پہنا جاتا تھا۔ نیمہ کو قمیص یا بنیان سمجھئے اور جامہ کو شیروانی۔

جامہ قبا کی جگہ اختیار کیا گیا تھا۔ جامہ گھٹنوں تک لمبا ہوتا تھا۔ گھیر زیادہ اور گھیر میں چُنٹیں۔ جامہ کی آستینیں بالکل انگرکھے جیسی ہوتی تھیں۔ ڈنڈوں پر کسی ہوئی اور کلائی پر چاک دار۔

جامہ کی تراش بدلتی رہی اور جامہ سے بالابر اور بالابر سے اچکن ہو گئی۔ اچکن مجھ سے کم عمر کے دلی والوں نے بھی پہنی ہے۔ شیروانی تو اب نکلی ہے۔

جوتہ چپل سے موزہ نما بنا۔ پھر چڑھواں۔ جہانگیر کے زمانہ شہزادگی میں جبکہ اس کا نام سلیم تھا۔ سلیم شاہی جوتی ایجاد ہوئی۔

(باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

www.taemeernews.com

دلی کے اندر فیس پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ نسخہ بے حد سستا[1] لکھتے تھے اور مہنگی دوائیں اپنے پاس سے مفت دیتے تھے۔ دلی میں مریضوں کے ہاں اپنی سواریوں میں جاتے تھے۔ لیکن دلی سے باہر کسی کی پانچ سو۔ کسی کی ہزار اور کسی کی دو ہزار روپے روزانہ فیس تھی۔ اور فیس لے کر بھی طنطنہ باقی رہتا تھا۔

(بقیہ نٹ نوٹ صفحہ ۱۶۱) چالیس پچاس برس پہلے تک ٹوپیاں انواع و اقسام کی تھیں۔ پنچ گوشی۔ چوگوشی۔ دو پلڑی۔ گول۔ مغلئی۔ کمر کی۔

ڈھیلے اور بیک برے پاجامے بھی پہنے جاتے تھے۔

دلی اور یو۔ پی کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا مردانہ لباس قطعی ایک ہو گیا تھا نیمہ کی جگہ کرتے نے لے لی تھی۔ ہندو مسلمان ڈھیلا یا تنگ اریواں پاجامہ اور کرتا پہنتے تھے۔ کرتے پر انگرکھا۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ فقط انگرکھے میں ذرا سا فرق تھا۔ مسلمانوں کی چولی بائیں جانب اور ہندوؤں کی چولی دائیں جانب۔

دلی اور یو۔ پی کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا لباس اکبر اعظم کے وقت سے لیکر چالیس پچاس برس پہلے تک برابر یکساں نظر آتا ہے۔ اورنگزیب اور سیوا جی کی تصویریں دیکھ لیجیے۔ فرق نہیں ہے۔ تو دلی کے دوسرے مسلمانوں کی وضع قطع میں کیسے فرق ہو سکتا تھا۔

[1] حکیم محمود خاں کا نسخہ دو پیسے سے زیادہ کا بہت کم ہوتا تھا۔

www.taemeernews.com

حکیم محمود خاں کو مہاراجہ کشمیر نے بُلایا۔ کشمیر پہنچ کر معلوم ہوا کہ مہاراجہ صبح صبح مسلمان کی شکل نہیں دیکھتے۔ تیسرے پہر نبض دکھائیں گے۔ حکیم صاحب نے کہا، اچھا تیسرے پہر سہی۔ تیسرے پہر گئے تو ملازم سلفچی۔ آفتابہ اور تولیے لیے ساتھ تھا۔ مہاراجہ کی نبض دیکھ چکے تو ملازم نے فوراً حکیم صاحب کے ہاتھ دُھلائے۔ صبح صبح مسلمان کی شکل نہ دیکھنے کا خوبصورتی سے جواب دیدیا۔

امیروں سے جھکاؤ نہ کھاتے تھے مگر غریبوں کی خاطر آرام اور تفریحات تک ترک کر دیتے تھے۔ ہوا خوری کے لیے جارہے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ چکے ہیں۔ ایک مہتر ہاتھ جوڑتا گاڑی کے پاس آکھڑا ہوا۔ حکیم صاحب نے پوچھا۔ کیوں۔ مہترانی کیسی ہے۔ مہتر نے عرض کیا۔ حضور! گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوگی۔ ملازم سے فرمایا۔ دواؤں کا صندوقچہ لے آؤ۔ مہتر کو گاڑی میں بٹھایا۔ ہوا خوری کو چھوڑا اور مہتر کے گھر کا راستہ لیا۔

---

[1] طبیب جسمانی کو طبیب روحانی کی طبیعت کا ہونا چاہیئے۔ کسی دور میں تو عموماً اطباء روحانی اطبا جسمانی ہوا کرتے تھے۔ حکیم محمود خاں اور ان کی اولاد میں خدمت خلق کا غیر معمولی جذبہ تھا۔ وہ مریض کے بے قرار دل پر طرح طرح کے مرہم رکھتے تھے۔ مرض دوا سے دس فی صدی جاتا ہے اور طبیب کے برتاؤ سے نوّے فی صدی۔ مرض میں نوّے فی صدی نفسیاتی اثر کے اہل یورپ بھی قایل ہیں۔ لیکن بس قایل ہیں۔ اس کا لحاظ

(باقی صفحہ ۱۶۴ پر)

www.taemeernews.com

روزانہ شام کے وقت گاڑیوں میں ہواخوری کے واسطے نکلنا اور مزارات اولیا پر حاضری دینا شریف خانی اطبا کا معمول تھا۔

حکام رسی اور لیڈری سے بے نیاز تھے۔ دلی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اور دلی سے باہر کون اُن کا حکم ٹال سکتا تھا۔

فقط حکیم اجمل خاں سیاست میں پڑ گئے تھے۔ مگر اس ایک آدھ بات کے سوا خاندان کی خصوصیات اور اداؤں کو انھوں نے بھی نہیں چھوڑا تھا۔ حکیم صاحب کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ کھانا کھانے اور ضروریات سے فارغ ہونے کی فرصت مشکل

(صفحہ ۱۶۳ کا بقیہ فٹ نوٹ) اب ضروری نہیں سمجھتے۔

ایک ڈاکٹر نے ڈاکٹری پیشہ اختیار کرنے والوں سے کبھی کہا تھا کہ تم اگر روپیہ کمانے اور امیر بننے کی غرض لے کر ڈاکٹری پڑھنے آئے ہو تو تم نے غلطی کی ہے۔ میڈیکل کالج سے چلے جاؤ اور کوئی اور پیشہ سیکھو۔ حکیم محمود خاں کے خاندان کا اسی نصیحت کے مطابق عمل تھا۔ حکیم محمود خاں کا خاندان مریضوں کے کپڑے اتارنے کی بجائے قیمتی دوائیں مریضوں کی نذر کرتا تھا اور بعض اوقات مریضوں کی نقدی سے بھی مدد کر دیتا تھا۔

یہ وصف اس وقت تک ہمدرد دواخانہ والوں میں موجود ہے۔ حکیم عبدالحمید اور حکیم محمد سعید ہر مہینے سیکڑوں غربا کے نسخوں پر لکھ دیتے ہیں کہ ان سے قیمت نہ لی جائے۔

www.taemeernews.com

سے ملتی تھی۔ اس قدر مصروفیت پر مریضوں کا اتنا خیال تھا کہ جسے سمجھتے کہ اُس کا حال معلوم کرنا ضروری ہے اور کوئی حال کہنے نہیں آیا ہے تو اُس کے ہاں بے بلائے پہنچ جاتے اور اُس کے گھر کی کُنڈی کھٹکھٹاتے۔ حکیم صاحب کی تشریف آوری سے گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے اور حکیم صاحب کو کافی انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دِلی کی خاص خاص ادائیں دِلی کا امتیاز تھیں۔ دوسرے امتیازات دوسرے شہروں میں دِلی سے بڑھ کر ہیں، مثلاً بمبئی کے سے دولتمند دلی میں نہیں تھے۔ یا تھے تو کم تھے۔ لیکن بعض ادائیں دلی کے ساتھ مخصوص تھیں ۱۹۴۷ء سے پہلے دِلی عبارت اِن اداؤں سے تھی۔ خواص نہیں عوام میں یہ ادائیں پائی جاتی تھیں۔ بلکہ عوام میں زیادہ پائی جاتی تھیں۔

ایک صاحب تھے سید محمد یعقوب۔ اُن کی نشست و برخاست بازاری لوگوں میں تھی۔ سید محمد یعقوب کی بجائے ننّو نام پڑ گیا تھا۔ یہ محمد یعقوب عرف ننّو جگت چچا تھے۔ چھوٹے بڑے۔ اپنے پرائے سب کے چچا ننّو۔ بڑھاپے میں بھی طوائفوں کے ہاں جانا ترک نہیں کیا تھا۔ اونچی اونچی ڈیرہ دارنیاں اُن کا لحاظ اور ادب کرتی تھیں۔ کبھی کسی کی نانی، دادی سے تعلق رہا ہوگا۔ اب تو طوائفوں کے بھی چہیتے تھے۔ گرمی کے موسم میں رات کو دو ڈیڑھ بجے کوئی گانا سننے کی فرمائش کر دیتا تو چچا ننّو بڑھیا سے بڑھیا گانے والی کے ہاں وارد ہو جاتے اور وہ غریب سوتے سوتے اُٹھتی اور گانا سُناتی۔ چچا کیا، طوائفوں کے تو سید محمد یعقوب پیر تھے۔ گانا سیکھنے کے بعد ہر طوائف لڑکی کا

www.taemeernews.com

پہلا گانا سید محمد یعقوب کے ہاں ہوتا تھا[1]۔ روپے کے واسطے نہیں۔ برکت کے واسطے۔ سید محمد یعقوب انتقال کر گئے تو طوائفوں نے برسوں اُن کا عُرس کیا۔

ان سید محمد یعقوب کی ایک ادا تھی کہ یہ خود تو طوائفوں کے کوٹھے آخر عمر تک جھانکتے رہے، مگر اُن کے کنبے یا محلے کے نوجوانوں کی مجال نہیں تھی کہ کسی طوائف کے کوٹھے پر قدم رکھ لیں۔ طوائف کے لئے اتنا جاننا کافی تھا کہ فلاں نوجوان بچا مُنّو کا عزیز یا ہم محلہ ہے۔ پھر اُسے اپنے ہاں نہیں گھسنے دیتی تھی۔ سید محمد یعقوب نے ممکن ہے اپنی زندگی تباہ کی ہو۔ لیکن وہ بے شمار نوجوانوں کی زندگی کو تباہی سے بچا گئے۔

سید محمد یعقوب میرے والد کے ہم عمر تھے اور بہت قریبی رشتہ دار۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ہمارے مکان سے ملی ہوئی ہماری ہی خالی دکان میں اپنی چارپائی لاکر ڈال لی۔ والدہ گھبرائیں۔ اُنھیں فکر ہوئی کہ کہیں کُوٹھی نہ لگا دیں۔ والد کو لکھا۔ کیا کرنا چاہیئے۔ اُنھوں نے جواب دیا "محمد یعقوب جب تک دکان میں رہیں، رہنے دو۔ وہ دُنیا بھر کے لئے بُرے ہوں۔ ہمارے لئے بُرے نہیں ہو سکتے۔"

* * *

---

[1] دلّی کی مشہور و معروف طوائف موتی جان انتاز کو میں نے پہلی مرتبہ اُن ہی کے ہاں دیکھا تھا۔ وہ فن موسیقی کی تکمیل کر کے سید صاحب کے سامنے گانا گانے آئی تھیں۔ موتی جان کا اُستاد کامل الفن تھا۔ اُس نے کوئی راگ گایا تھا جس سے یکایک بادل چھا گئے تھے اور ترشّح ہونے لگا تھا۔

www.taemeernews.com

۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے ایک نہایت معزز دوست لاہور سے دلی تشریف لائے۔ خواجہ صاحب اُس زمانے میں میرے ہاں رہتے تھے۔ ان دوست نے بھی غریب خانہ میں قیام فرمایا۔ ہم دونوں اُن کا استقبال کرنے ریلوے اسٹیشن گئے۔ پلیٹ فارم پر چلتے چلتے اُنھوں نے مسکرا کر کہا: "واحدی صاحب! دلی کی کسی عورت سے شادی کرادیجیے۔ یہاں کے قُلیوں کی زبان اتنی شیریں ہے تو عورتوں کی زبان کیسی ہوگی"۔ ۱۹۱۱ء تک دلی ریلوے اسٹیشن کے تمام قلی دِلی والے تھے۔ میں سمجھا کہ معزز مہمان مذاق کر رہے ہیں۔ لیکن گھر پہنچ کر اس قدر اصرار ہوا کہ خواجہ صاحب کے مشورہ سے میں نے ایک عزیز سے تحریک کی کہ اپنی بھتیجی سے شادی کردیں۔ اُس بھتیجی کے ابا معزز مہمان کا نام سنتے ہی راضی ہوگئے مگر کہا کہ فیصلہ بزرگ ماموں کے ہاتھ میں ہے۔

میں ساتھ تھا، جب عزیز مذکور بزرگ ماموں سے گفتگو کرنے گئے ہیں عزیز کے آثار چڑھاؤ کامیاب رہے۔ بزرگ ماموں بھی منظوری دینے کو تیار تھے کہ عزیز کی زبان سے ایک فقرہ نکل گیا کہ "ایسے شخص سے رشتہ ہو جانا ہمارے خاندان کی عزت کا موجب ہوگا"۔ بس ماموں صاحب کا ناریل چٹخ گیا۔ بولے "واقعی بڑے آدمی ہیں اور بے شک اُن سے رشتہ ہونا ہماری عزت کا موجب ہے۔ لیکن بیٹی دے کر ہم نے عزت میں کبھی اضافہ نہیں کیا"۔ باقی تم جانو اور تمھارے بھائی جانیں۔ قلعہ بنتے بنتے ڈھے گیا۔

ایک واقعہ شمس العلما مولوی سید احمد، امام جامع مسجد سنایا کرتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھک منگے نہ جانے کب سے بیٹھتے ہیں۔ بہر حال واقعہ دلی کے دورِ زوال کا ہے اور میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں دورِ زوال[1] ہی کی بابت لکھ رہا ہوں۔ یہ دورِ اقبال کے حالات نہیں ہیں۔ خیر امام صاحب کا بیان ہے کہ چند سال قبل کوئی فرنگی سیاح جامع مسجد دیکھنے آیا۔ اُس فرنگی نے ٹٹولکھوں کر

---

[1] شاہجہاں اور اورنگزیب کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کے انتہائی اقبال کا زمانہ تھا۔ اورنگزیب کے بعد زوال شروع ہوا اور زوال کے دور نے کافی طویل عمر پائی۔

ابو ظفر بہادر شاہ دورِ زوال کے آخری بادشاہ تھے۔ ظاہر ہے پہلے زوال پذیر بادشاہ اور آخری زوال زدہ بادشاہ میں تفاوت ہوگا۔ کہاں بہادر شاہ اوّل اور کہاں بہادر شاہ ثانی۔ لیکن مسلمانوں کی بادشاہت میں مٹتے مٹتے کوئی ایسی خوبی تھی کہ میں نے بہادر شاہ کے دیکھنے والے ہندوؤں کو بہادر شاہ کے واسطے روتے دیکھا ہے۔

ابو ظفر بہادر شاہ انگریزوں کے تنخواہ دار بادشاہ تھے اور اُن کی ہندوستان کیا، شہر دہلی میں برائے نام بادشاہت تھی۔ "حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم" ضرب المثل ہے۔ تاہم تیمور سے لے کر بہادر شاہ تک گنئے تو، بہادر شاہ کتنی پشتوں کا بادشاہ تھا۔ جو شان اُس میں تھی وہ انگریزوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ بہادر شاہ کی صرف موجودگی ایسی تھی کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے لوگ اُسے یاد کرتے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء سے آگے کے لوگوں کا خیال

(باقی صفحہ ۱۶۹ پر)

بھیک مانگنے والے کو بھیک دی اور جامع مسجد میں چلا گیا اور پھر جامع مسجد کے دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ ہوٹل پہنچا تو بٹوا غایب تھا۔ بٹوہ میں دس بارہ اشرفیاں تھیں۔

دو تین دن گذار کر فرنگی کا جی جامع مسجد کی سیر کو پھر چاہا۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی ایک بھکاری نے آواز دی۔ صاب۔ صاب! یہ تمھارا بٹوہ تو نہیں ہے۔ اُس روز یہاں گر پڑا تھا۔ فرنگی نے بٹوہ لے لیا۔ اشرفیاں گنیں۔ پوری تھیں۔ فرنگی نے دو اشرفیاں بطور انعام بھکاری کو دینی چاہیں۔ بھکاری نے گردن ہلائی اور

(صفحہ ۱۶۰ کا بقیہ نٹ نوٹ) ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ہندوستان کے عوام کو جو سکون حاصل تھا دراصل عہد بہادر شاہ کا بچا کھچا اثر تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں کھانے، کپڑے اور رہنے سہنے کی آسائشیں ایڈورڈ ہفتم، جارج پنجم، ایڈورڈ ہشتم اور جارج ششم کے عہد سے زیادہ تھیں۔ بہادر شاہ کے عہد سے زیادہ نہیں تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ کے بعد بدتری ہی ہوتی گئی۔

انگریز نے جس طرح اپنا اثر چھوڑا ہے اسی طرح مسلمانوں نے اپنا اثر چھوڑا تھا جسے ملکہ وکٹوریہ کا اقبال کہا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے دورِ زوال کی چھینٹیں تھیں۔

بہادر شاہ اور کچھ تھا یا نہ تھا، خلقت اُسے باپ مرشد سمجھتی تھی اور اُس کی شرافت اور خدا ترسی کی قائل تھی۔ مطلق العنان بادشاہ بُرے ہوتے تھے تو بہت بُرے ہوتے تھے اور اچھے ہوتے تھے تو بہت اچھے ہوتے تھے۔

www.taemeernews.com

فرنگی کا ہاتھ روک دیا۔ فرنگی نے پوچھا۔ اور دوں۔ بھکاری نے کہا نہیں۔ اور کسی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ فرنگی تعجب سے بولا۔ تم ایماندار بھی ہو اور مستغنی بھی ہو۔ بھکاری نے کہا۔ اجی ایماندار اور مستغنی تو کیا ہوں۔ بس اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے پیغمبر کا سر تمھارے پیغمبر کے سامنے نیچا ہو جائے۔ تمھارے پیغمبر نے کہیں چھیڑ دیا کہ آپ کے اُمتی نے میرے اُمتی کی اشرفیاں رکھ لیں یا آپ کے اُمتی نے میرے اُمتی سے اشرفیاں واپس کر دینے کا صلہ لے لیا تو میرے پیغمبر کو شرمندگی ہوگی۔ جائیے اشرفیاں لے جائیے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے دورِ زوال کے دِلّی والے بھک منگے کا کیرکٹر۔ آج شریف مسلمانوں کو بھی یہ خیال مشکل سے آتا ہوگا کہ ہماری حرکتیں ہمارے پیغمبر اور پیغمبر کی تعلیمات کی بابت کیا رائے قایم کرا رہی ہیں۔

* * *

دِلّی کی ایک طوائف کا حال بھی پڑھ لیجیے۔ طوائفوں میں بھی اونچ نیچ ہے۔ شریف اور رذیل۔ خاندانی اور غیر خاندانی۔ سب قسم کی طوائفیں ہوتی ہیں۔ اونچے درجے کی طوائفوں کو ڈیرہ دار کہا جاتا ہے۔ لکھنؤ کی ڈیرہ دار طوائفوں سے تو لکھنؤ کے امراء تمیز سیکھا کرتے تھے۔ اُمراء کے لڑکے گھنٹے دو گھنٹے کو روزانہ اُن کے ہاں بھیجے جاتے تھے تاکہ دیکھیں کہ بات چیت کیونکر کی جاتی ہے۔ نشست و برخاست کا کیا طریقہ ہے۔ ادب آداب کس شے کا نام ہے۔ ڈیرہ دار طوائفیں امراء سے کیسا ہی تعلق

رہتی ہوں۔ امرا کے بچوں کے ساتھ ادب و لحاظ کا سلوک برتا کرتی تھیں اور اُنھیں ادب کی
طرح تربیت دیتی تھیں۔ ڈیرہ دار طوائفوں کے شرعی نکاح بے شک نہیں پڑھے جاتے
تھے لیکن ویسے اُن کا واسطہ ہمیشہ ایک ہی مرد سے رہتا تھا اور نکاح کی کمی کے
سوا شریفانہ زندگی گزارتی تھیں۔

موتی جان۔ جن کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اُن کا شمار دلّی کے ایک بڑے
ڈیرہ دار خاندان سے تھا۔ انھیں امرا کے لڑکوں کی تربیت و سرپرستی کرتے تو نہیں
سنا گیا۔ البتہ دلّی کے ہندو مسلمان علما اُن کے درباری تھے۔ عشا کے قریب اُن کی جا
کے یہاں دربار لگتا تھا اور اُس دربار میں دلّی کے ممتاز ترین آدمی شریک ہوتے تھے۔
موتی جان انتہا درجے کی شائستہ اور مہذب خاتون تھیں۔ انداز تخلص تھا۔
شعر بھی کہتی تھیں۔

میں [illegible] سے روز صبح کے وقت ہوا خوری کیا کرتا ہوں۔ موتی جان کو بھی
غالباً کسی طبیب نے یہی نسخہ بتلا دیا تھا۔ میں پیدل پھرتا تھا۔ وہ لینڈو میں نکلتی
تھیں۔ دو آدمی کوچ بکس پر بیٹھ کر گھوڑے سنبھالتے تھے۔ دو پیچھے کھڑے
ہو کر سوار چلا کرتے تھے۔ ایک شام میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں
حاضر تھا کہ موتی جان اُن کے سلام کے لیے آگئیں۔ میں نے اس وقت پہچانا
کہ یہ موتی جان ہیں۔ ورنہ لینڈو کے ٹھاٹھ سے اور موتی جان کے پُروقار
انداز سے گمان ہوتا تھا کہ کوئی رئیس ہندو عورت ہے۔

www.taemeernews.com

ایک مرتبہ موتی جان میرے ہاں بھی گانا گانے تشریف لائیں۔ ہوا یہ کہ سردار دیوان سنگھ مفتون نے ۱۹۱۰ء میں دلّی سے روزنامہ اخبار رعیت جاری کیا تھا۔ اخبار مالی دشواری کے سبب ختم ہونے لگا تو بھتیا احسان الحق نے اُسے اس شرط پر لے لیا کہ میں نقصان روپیہ لگاؤں گا، کام واحدی صاحب اور سردار صاحب کریں گے۔ میں نے اس اخبار کی چیف ایڈیٹری کے لئے جناب نیاز فتحپوری کو بلالیا تھا۔ حاجی ریاض الدین بریلوی وغیرہ رعیت کے معاون ایڈیٹر تھے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے لکھنے کی ابتدا اعزازی طور پر رعیت کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوکر کی تھی۔ تین مہینے بعد بھتیا بھی ہار گئے اور رعیت بند ہوگیا۔ میرے اور نیاز صاحب کے مشترک دوست مولانا عارف ہسوی، صدر دہلی پراونشل کانگریس کمیٹی رعیت کی معتدل پالیسی سے نالاں رہتے تھے۔ انھیں رعیت کے بند ہونے کی ایسی خوشی ہوئی کہ جب اکر موتی جان سے طے کر آئے کہ رعیت بند ہونے کی خوشی میں رعیت کے دفتر میں گانا گائیں گی۔

موتی جان موسیقی کا فن جانتی تھیں۔ اللہ نے گلا بھی بے مثال دیا تھا اور شکل بھی حسین عنایت فرمائی تھی۔ لیکن جو خوبی موتی جان کی نوٹ کرنے کے قابل ہے وہ یہ تھی کہ موتی جان رات بھر صرف ایک بول گاتی رہیں ؎

مورے نین لاگے گوئیاں

اِس ایک بول کو اُنھوں نے نئے نئے سُرتوں سے ادا کیا۔ نرت کرنے میں

www.taemeernews.com

ہاتھ بھی ہلے اور پاؤں بھی ہلے اور سارے جسم کو حرکت ہوئی مگر جسم کا کوئی حصہ سوائے ہاتھوں اور چہرہ کے، کھُلا نہیں۔ جاڑے کا موسم تھا۔ شال اوڑھے ہوئے تھیں۔ شال سر پر سے نہیں سرکا۔

گانے کا پیشہ کرنے اور بغیر نکاح کے کسی ایک مرد کی پابند ہو جانے کی یہ ڈیرہ دارنیاں گناہگار ضرور تھیں لیکن کیا کہوں کہ کن کن سے زیادہ باحیا تھیں۔

موتی جان نے تو تیس اور چالیس سال کی عمر کے درمیان نکاح بھی کر لیا تھا اور عمر کے آخری بیس پچیس سال اُن کے بہو بیٹیوں جیسے بسر ہوئے۔

موتی جان نے اپنی بیٹیوں کو گانا نہیں سکھایا اور سب کو تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بیاہ دیا۔ موتی جان ۱۸۸۰ء کے تیس برس بعد پیدا ہوئی تھیں۔

پلیٔ والوں کی طرف، جامع مسجد کے پھلواری والے چبوترے کے نیچے بڑی پیلی پر جہاں اور کوئی دوکاندار نہیں بیٹھتا تھا، شام کے پانچ چھ بجے ایک کبابی صاحب دوکان لگایا کرتے تھے اور رات کے بارہ ایک بجے تک کباب بیچتے تھے۔ اِن کا نام مجھے معلوم نہیں۔ چچا کبابی کہلاتے تھے۔

چچا کبابی ۱۸۸۰ء کے بیس سال بعد پیدا ہوئے ہوں گے اور سنہ ۱۹۴۰ء سے چند سال قبل انتقال کر گئے۔

دلی کے سیخ کے کباب اور گولے کے کباب مشہور ہیں۔ چچا کبابی دلی کے

ممتاز کبابی تھے۔ کباب بنانے کے اعتبار سے بھی اور انوکھی طبیعت کے اعتبار سے بھی۔ کباب بنانے کے کمال پر انھیں گھمنڈ تھا اور طبیعت کا انوکھا پن تو

لوہیخ کے کباب دلّی میں سب سے اچھے گھمّی بناتا تھا۔ چچا کبابی انہی کے بیٹے یا بھتیجے تھے۔ گھمّی ہی کے خاندان کے ایک کبابی شرنو ہیں جو دلّی کے محلّہ کٹّہ والان میں دُکان کرتے تھے۔ اب کراچی میں ہیں۔ پھاٹک حبش خاں میں بھی ایک بُرج کی مسجد کے پاس اچھے کباب بنتے تھے۔

مچھلی کے کباب جامع مسجد کی سیڑھیوں کے بے مثل ہوتے تھے۔ قیمہ کی گولیاں بنڈت کے کوچہ کی۔ نہاری گھنٹہ گھر والے گنجے کی اور فراشخانہ والے فضل کی۔ کھیر حوض قاضی، طوائف والی سنگ سرخ کی مسجد کی دکان کی۔ قلاقند گھنٹے والے کا سنہری مسجد کے پاس۔ جلیبیاں بھنگی کے کٹڑہ کی۔ حلوہ سوہن گھنٹہ گھر کے عبدالغفور کا۔ کراچی میں عبدالخالق کی دُکان اسی خاندان کی ہے۔ روے کا حلوہ انگھنا حلوائی کا (جسے دلّی والے کراچی میں یاد کرتے ہیں) پیر لٹے اور ربڑی قطب صاحب کی۔ برف کی قفلیاں نواب برف والے کی۔ ریوڑیاں اور گجک (گزک) چاوڑی بازار کوچہ میر عاشق کے پاس والی دوکان کی۔ بھُنی ہوئی مونگ پھلیاں اور بھُنے ہوئے چنے فتحپوری کے۔ سنگھاڑے قطب صاحب شمسی تالاب کے۔ کھجریاں اور کھرنیاں بھی قطب صاحب کی۔ کھجوریں شیدی گھیر کے باغ کی۔ بیدانہ گلابی باغ کا۔ سرولی کے آم

(باقی صفحہ ۱۷۵ پر)

اِس سے عیاں ہے کہ اپنے لیئے وہ جگہ انتخاب کی تھی، جہاں گاہک کو آنا ہو تو جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کی طرف کے دسیوں کبابیوں کو چھوڑ کر آئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۴) بیگم کے باغ کے۔ خربوزے شیخ یعقوب کی فالیز کے۔

کھانے کی یہ وہ سوغاتیں ہیں، جنہیں دلی سے ہر کس و ناکس لے جایا کرتا تھا۔ سو دو سو میل تک نہاری بھی پہنچ جاتی تھی۔ اُن کھانوں کو میں نے اپنے زمانہ کی دلی میں نہیں پایا جن کے تنا کی صرف روٹیوں کے نام بے شمار تھے۔ چپاتیاں۔ پھلکے۔ پراٹھے۔ روغنی روٹی۔ بری روٹی۔ خمیری روٹی۔ بیسنی روٹی۔ نان۔ شیرمال۔ گاؤدیدہ۔ تافتان۔ گاؤزبان۔ کلچہ باقرخانی۔ غوصی روٹی۔ گاجر کی روٹی۔ مصری کی روٹی۔ نانِ پنبہ (یعنی بنولوں کی روٹی) نانِ گلزار۔ نان تماش۔ نان تنکی اور جن میں صرف پلاؤ اتنی قسم کے تھے۔ یخنی پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ نور محلی پلاؤ۔ نکتی پلاؤ۔ آبی پلاؤ۔ فالسائی پلاؤ۔ سنہری پلاؤ۔ روپہلی پلاؤ۔ بیضہ پلاؤ۔ اناناس پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ بریانی پلاؤ۔ مزعفر پلاؤ۔ بونٹ پلاؤ۔ کشمش پلاؤ۔ نرگسی پلاؤ۔ زمردی پلاؤ۔ لال پلاؤ۔ زعفرانی پلاؤ۔ بسنتیہ پلاؤ۔ مرغ پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ سالم بکرے کا پلاؤ۔

دلی کے تھوڑے سے قدیم کھانے میں نے سکندرآباد دکن میں کھائے ہیں۔ میں ایک دفعہ حیدرآباد گیا تھا۔ تین چار وقت خواجہ صاحب کے ساتھ مہاراجہ سرکشن پرشاد (وزیراعظم ریاست حیدرآباد) کا مہمان رہا۔ پھر ایک دو دن تنہا مولوی غلام یزدانی

(باقی صفحہ ۱۷۶ پر)

www.taemeernews.com

ایک گیارہ برس کی لڑکی، آگ کا تاؤ قائم رکھنے کی غرض سے ہر وقت پنکھا ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہتی تھی۔ غالباً اُن کی بیٹی تھی۔ ذرا تاؤ کم و بیش ہوا اور چچا کبابی کا پارہ چڑھا۔ غصّہ ناک پر رکھا رہتا تھا۔ لیکن کیا مجال جو زبان سے بیہودہ لفظ نکل جائے۔

(صفحہ ۱۷۵ کا بقیہ فٹ نوٹ) دہلوی (ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثار قدیمہ ریاست حیدرآباد) کے ہاں ٹھیرا۔ اس کے بعد ہم دونوں سکندرآباد چلے گئے۔ سکندرآباد میں سیٹھ محمد موسیٰ ہمارے میزبان تھے۔ سیٹھ صاحب نے کسی طرح حضور نظام کے خان ساماں کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اکیس کھانے دوپہر کو اور اکیس کھانے شام کو دسترخوان پر چن دیتا تھا۔ روز نئے کھانے ہوتے تھے۔ ہفتہ بھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو دو سو، پونے دو سو کھانے خان ساماں نے پکائے۔ جن میں چپاتیوں کے سوا کوئی چیز دوبارہ نہیں آئی۔

میر عثمان علی خاں، نظام دکن کھانے کے شوق سے پاک ہیں۔ لیکن چونکہ کبھی کبھی سرکاری دعوتیں کرنی پڑتی تھیں میر عثمان علی خاں کو بھی اعلیٰ کھانے پکانے والوں کا انتظام رکھنا لازمی تھا۔

دِلی کے قدیم کھانے ریاستوں میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن میرے زمانے کی دِلی کے کھانوں کے بھی کیا کہنے ہیں۔ وہ کھانے مولوی غلام یزدانی نے کھلائے۔ اُمرا کے کھانے دلی میں ختم ہو چکے تھے۔ مگر شرفا کے کھانے ۱۹۴۷ء تک موجود تھے۔

www.taemeernews.com

گاہکوں کو باری باری کرکے کباب دیتے تھے۔ آپ اگر اُن کے ہاں اوّل مرتبہ تشریف لائے ہیں اور اُن کی طبیعت سے واقف نہیں ہیں اور دوسرے گاہکوں کی نسبت آپ کی حیثیت بلند ہے۔ صاف ستھرا لباس پہنے ہیں تانگہ یا موٹر روک کر کباب خریدنے اُتر پڑے ہیں۔ آپ نے خیال کیا کہ مجھے ترجیح دی جانی چاہیئے۔ ہاتھ بڑھایا۔ روپے تھمائے اور فرمایا: ڈیڑھ روپے کے کباب۔ ذرا جلدی۔" جلدی کا لفظ سنتے ہی چچا کبابی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ روپے واپس کریں گے اور کہیں گے۔" حضور جلدی ہے تو اور سے لے لیجیے۔"

ایک روز ایک زندہ دل شخص چچا کبابی سے اُلجھ گئے۔ اُنھوں نے چچا کبابی کے اِس فقرہ پر فقرہ جڑ دیا کہ "اچھا بھائی اور ہی سے لے لیں گے۔ اللہ نے تمھارے کبابوں سے بچایا۔ نہ جانے ہضم ہوتے یا کوئی آفت ڈھاتے۔" چچا کبابی تلملا اُٹھے۔ کہنے لگے۔ "حضور، کبابوں میں وہ مسالہ ڈالتا ہوں، جسے مست ہاتھی پر چھیڑ دوں تو گل کر گر پڑے۔ میرے کبابوں سے آپ کو تکلیف پہنچ جائے تو ہسپتال تک کا خرچ دوں گا۔ لیکن کباب جلدی نہیں دے سکتا۔ جلدی میں کباب یا کچّے رہ جاتے ہیں یا جل جاتے ہیں۔ اور دوسرے گاہکوں کا حق بھی ترتا ہے۔ جو پہلے آیا ہے کباب اُسے پہلے ملنے چاہئیں۔"

چچا کبابی دھونس نہیں برداشت کرتے تھے اور اپنے اصول کے سامنے تعلقات کو بھول جاتے تھے۔ عزیز اور دوست بھی اُن سے بغیر باری کے کباب

www.taemeernews.com

نہیں دے سکتے تھے۔

آپ جائیے۔ اُنھیں سلام کیجیے۔ جواب دیں گے۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ پانوں کی ڈبیہ سامنے رکھ دیجیے بے تکلف پان کھالیں گے۔ زردہ خود مانگیں گے۔ لیکن ناممکن ہے کہ سلام سے یا پان سے چچا کبابی پگھل جائیں۔ کباب باری آنے پر ہی دیں گے۔

ایک دفعہ میری موجودگی میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا آیا۔ اور بولا" چار پیسے کے کباب دیدو" چچا کبابی نے کہا۔" نہیں بھائی! میں تجھے کباب نہیں دوں گا" اب وہ لڑکا سر ہو رہا ہے اور خوشامدیں کر رہا ہے اور چچا کبابی انکار پر انکار کیے جاتے ہیں۔ جب بہت دیر اس حجت بازی میں گذر گئی تو کسی نے ہمت کر کے پوچھ لیا" چچا کیا بات ہے۔ اسے کباب کیوں نہیں دے رہے" کہنے لگے۔" میاں! یہ پیسے چُرا کر لاتا ہے۔ گھر سے لاتا ہو یا کہیں اور سے۔ روز چار پیسے کے کباب کھاجاتا ہے یہیں بیٹھ کر۔ دیکھو نا اِس کی صورت۔ جا بیٹا جا۔ عادت کہیں اور جا کر بگاڑ۔ میں چار پیسے کی خاطر تجھے تباہی کے راستہ پر نہیں لگاؤں گا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تیرے ماں باپ چار پیسے روز تجھے کباب کھانے کے واسطے دیتے ہوں گے۔

جو لوگ اُن کی دکان پر تازے اور گرم گرم کباب کھالیتے تھے، اُن سے خوش ہوتے تھے۔ پیسے تھمایئے اور بتا دیجیے کہ اوپر جامع مسجد کے دالان میں انتظار کر رہا ہوں۔ کباب بھیج دینا۔ یا آواز دے لینا۔ ایسے لوگوں کے کباب گھی سے بگھارتے۔ کبابوں

www.taemeernews.com

میں بھجوا دیتے۔ پیاز، پودینہ اور ہری مرچیں چیڑ کتے اور اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوا دیتے۔

اللہ بخشے مولانا ارشد الخیری کو چچا کبابی کے ہاتھ کے کباب اُنھیں بھی مرغوب تھے۔ وہ میرے ساتھ ہوتے تو میں بھی جامع مسجد میں بیٹھ کر کباب منگاتا تھا۔ تازے کبابوں کی بات کچھ اور ہوتی تھی۔

پتنگ باز

دلّی کے مشاہیر سے تو آپ تھوڑے بہت واقف ہیں۔ میں ساتھ کے ساتھ دلّی کے دو چار غیر معروف آدمیوں کا حال بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔

بنگش کے کمرہ کے قریب ایک بڑے میاں کی پتنگوں اور تکلوں[1] کی دوکان تھی۔ یہ بڑے میاں پتنگیں اور تکلیں صرف بیچتے ہی نہ تھے، بناتے بھی تھے۔ اور اُڑاتے بھی تھے۔ اور اُڑانا سکھاتے بھی تھے۔ اِن ہی کاموں پر گذر اوقات تھی۔ اکیلا دم تھا۔ چار مہینے جاڑے کے بنگش کے کمرہ کی دوکان میں گزارتے۔ چار مہینے گرمی کے اجمیر شریف میں اور چار مہینے برسات کے قطب صاحب رہبرولی۔ دِلّی ہیں۔ جہاں جاتے یہی پتنگیں اور تکلیں بناتے۔ بیچتے، اُڑاتے، اور اُڑانا سکھاتے۔ دوسرا شغل

---

[1] پتنگ اور تکل کے علاوہ اُڑائی جانے والی چیزیں اور بھی ہوتی تھیں :-
اھی۔ دو پلکا۔ دو باز۔ گلامہ۔ دو پتا۔ کلیجہ جلی۔ کل ہرا۔ چڑا۔ کن کوا۔ بھیڑیا وغیرہ وغیرہ ساخت کے اعتبار سے سب پتنگ کی اقسام ہیں۔

www.taemeernews.com

اور شوق شعر کہنے اور شعر سننے کا تھا۔ بالکل بے پڑھے لکھے تھے۔ شعر کہتے اور کسی راہ چلتے سے فرماتے۔ میاں! ذرا لینا یہ قلم، دوات، کاغذ۔ ایک شعر گھسیٹتے جاؤ۔ دوسرا شعر ہو گیا تو دوسرے سے لکھوا لیا۔ تیسرا شعر ہو گیا تو تیسرے سے لکھوا لیا۔ غزل پوری کرالی تو حفاظت سے رکھ دی۔ بہت سی غزلیں شعر نقل کرنے والے اپنی بنا بیٹھے۔ پھر بھی سنا ہے مرتے وقت خاصا ضخیم دیوان تیار تھا۔ کام ہی دو تھے۔ پتنگیں بنانا اور غزلیں کہنا۔

بے پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ توتلے بھی تھے اور پوپلے بھی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی پیدائش۔ لوگ ان کا اس لئے لحاظ کرتے تھے کہ ان کا شجرۂ نسب، اکبر ثانی، یعنی ابو ظفر بہادر شاہ کے والد سے ملتا تھا۔ مشاعروں میں جاتے تو انھیں اچھی جگہ دی جاتی اور شعر پڑھتے تو تتلانے اور پوپلانے پر کوئی نہ ہنستا۔ کسی کے چہرہ پر مسکراہٹ بھی دیکھ لیتے تو تیموری خون جوش کھا جاتا۔ نام یاد نہیں۔ عرف مرزا فخرو تھا، جسے وہ خود مرزا فرڈو کہا کرتے تھے۔ لیکن عام طور سے مرزا چپاتی کہلاتے تھے۔ نہ جانے کیوں۔ غالباً اس طرح یہ نام پڑ گیا ہوگا جس طرح ایک صاحب کا نام گوشت روٹی تھا۔ دلی میونسپل کمیٹی زیادہ عمر کے بوڑھوں اور بوڑھیوں کو تین تین روپے مہینہ وظیفہ دیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایسے بوڑھوں بوڑھیوں کی پڑتال ہو رہی تھی۔ ان صاحب کے ہاں بھی میونسپل کمیٹی کا کلرک پہنچا۔ انھوں نے کہا۔ مجھے امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے بچے کماتے ہیں اور میں اللہ کے فضل

گوشت روٹی کھاتا ہوں۔ محلے کے لڑکے جو اُس وقت وہاں کھڑے تھے انھوں نے بڑے میاں کا نام گوشت روٹی رکھ دیا اور نام کو شہرت دیدی۔

خیر میں حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیا اور حضرت امیر خسروؒ کے عرسوں میں بچپن سے حاضر ہوتا تھا۔ یہ وہی عرس ہیں جو بڑی سترھویں اور چھوٹی سترھویں کہلاتے ہیں٭۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ سے کچھ فاصلے پر ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ سترھویں کا میلہ درگاہ شریف سے مقبرہ تک پھیل جاتا تھا۔ مقبرہ کی بغل میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ ہے۔ گویا اُس جگہ سے لے کر جہاں حضرت بعد وصال آرام فرما ہیں، اُس جگہ تک جہاں زندگی میں رہتے تھے عرس کا میلہ لگتا ہے۔ اسی خانقاہ کے ایک حجرہ میں جو کبھی حضرت کا کتب خانہ تھا، ایک سترھویں کے موقع پر، آج سے پچاس، پچپن سال پہلے مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میں بھی پھرتا پھراتا وہاں جا نکلا۔ اُس وقت مرزا چپاتی غزل پڑھ رہے تھے۔ غزل تو کیا یاد رہتی لیکن غزل کا ایک شعر ایسا تھا کہ بھلائے نہیں بھولتا۔ مجھے یہ شعر اتنا پسند ہے کہ میں نے دلّی میں منشی حامد مرزا عہ کو دیا تھا کہ میری قبر کا کتبہ میری زندگی میں بنوا دو اور اُس پر یہ شعر کندہ کرا دو۔ خیر شعر سُن لیجیے۔ شاید آپ کو بھی

٭ اب تیسری سترھویں خواجہ حسن نظامیؒ کی بھی ہونے لگی ہے۔ اُن کے عرس میں بھی بے شمار آدمی آتے ہیں۔

عہ منشی حامد مرزا دلّی کے مشہور خوشنویس تھے۔ نیز ایک منشی عبدالغنی ابن منشی ممتاز علی مہاجر مکی مالک مطبع مجتبائی۔ مولوی عبدالاحد نے مطبع مجتبائی منشی ممتاز علی سے

(باقی صفحہ ۱۸۲ پر)

www.taemeernews.com

پسند آئے۔ فرماتے ہیں ؂

میں سر جھکا کے سوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آگیا مرے پروردگار کو

امّو جان اور محمد مرزا خاں

کوچہ چیلان میں میرے مکان کے قریب دو حضرات رہتے تھے۔ ایک کا نام مرزا امّو جان تھا۔ دوسرے کا محمد مرزا خاں۔

محمد مرزا خاں اتنے بوڑھے تھے کہ لوگ انھیں نوح کہنے لگے تھے۔ مرزا امّو جان ان سے بھی ایک دو برس بڑے ہوں گے۔ مرزا امّو جان نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو دیکھا تھا۔ اس حساب سے میرے اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے درمیان صرف

(صفحہ ۱۸۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) خریدا تھا، نمبر ۲ منشی محمد دین۔ منشی عبدالغنی صرف نسخ لکھتے تھے، مگر بے مثل لکھتے تھے۔ منشی محمد دین کو نسخ و نستعلیق دونوں میں مہارت تھی۔ منشی محمد دین کی بیٹی فاطمۃ الکبریٰ نے بھی نسخ میں کمال پیدا کیا تھا اور منشی محمد دین کے بیٹے منشی محمد یوسف کا تو اس وقت غالباً دنیا میں جواب نہیں ہے۔ کراچی کے کامیاب ترین خوشنویس منشی عبدالمجید منشی محمد یوسف ہی کے شاگرد ہیں۔

منشی عبدالغنی اور منشی محمد دین کے بعد منشی حامد مرزا اور منشی محمد احمد تھے۔ پھر منشی فردوس۔ منشی محمد جان۔ منشی انور خاں۔ منشی ابرار احمد۔ منشی سعید احمد (اس کتاب کے کاتب) حافظ محمد تقی، حکیم نعمان ادیب

www.taemeernews.com

ایک واسطہ ہے اور مرزا اتّو جان کے طفیل مجھے حضرت شاہ ولی اللہؒ سے دو اور اورنگزیب عالمگیر سے تین واسطے رکھنے کا فخر حاصل ہو گیا ہے۔ اسلامی علم و فضل کا عروج تو ہندوستان میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے زمانہ تک رہا۔ لیکن مجھ سے تین نسل پہلے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت بھی انتہائی مضبوط تھی۔ بلکہ اورنگزیب کی حکومت تو مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی، اسلامی حکومت تھی۔

خیر، یہ دونوں صاحبان، مرزا اتّو جان اور محمد مرزا خاں، ۱۸۵۷ء میں کڑیل جوان تھے۔ ان کے ایک ہندو دوست لالہ کشن چند کی، ۱۸۵۷ء میں شادی ہوئی۔ بارات بازار سے گزر رہی تھی کہ غدر پڑ گیا اور ایسی بھگدڑ مچی کہ براتی دولہن کا ڈولہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ صرف دولہا اور مرزا اتّو جان اور محمد مرزا خان نے اوسان قایم رکھے اور دُلہن کا ڈولہ گھر پہنچایا۔

پھر ان ہی لالہ کشن چند کو ایک امتحان اور پیش آیا۔ وہ کسی قتل کے مقدمے میں پھنس گئے۔ لالہ کشن چند وکیل تھے۔ انھوں نے مرزا اتّو جان سے کہا۔ تم یہ بیان دے کر اگر میری جگہ جیل میں آ بیٹھو تو میں تمھیں نکال لوں گا۔ لیکن میں پھنسا رہا تو میری رہائی مشکل ہے۔ مرزا اتّو جان نے بیان دے کر اپنے آپ کو گرفتار کرا دیا اور لالہ کشن چند نے آزاد ہو کر اُن کی پیروی کی اور واقعی نکال لیا ؎

بلندی کا اُس کی بھلا کیا ٹھکانا
بلا دوسرے کی جو سر اپنے لے لے

www.taemeernews.com

میرے زمانہ تک دِلّی کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے تعلقات بگڑے ہیں۔ مرزا اَمّو جان، جن کا ذکر ہو رہا ہے اُن کے بیٹے ایّوب جان ہندوؤں کو ہندی پڑھاتے تھے اور بہی کھاتہ سکھاتے تھے۔ شاہزادہ مرزا ثریا جاہ کے ہندو کارندے اور رائے بہادر لالہ مادھو پرشاد کے مسلمان کارندے میں نے دیکھے ہیں۔

ابتداءً ہندو، مسلمان اور عیسائی طلبا کے لئے انگریزی کے الگ الگ مختص القوم مدرسے نہیں تھے۔ سب مِل جُل کر پڑھتے تھے۔ اس لئے باہمی یگانگت قائم تھی۔ قدیم دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے بالکل شیر و شکر تھے۔ مسلمان رام لیلا کے جلوس کی رونق بڑھاتے تھے اور ہندو تعزیوں کے ساتھ جاتے تھے۔ سبیلیں لگاتے تھے۔ مرثیئے سنتے تھے اور تعزیوں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو کے عرسوں میں ہندوؤں کا ہجوم مسلمانوں سے کم نہیں ہوتا تھا۔

پھول والوں کی سیر ہندو مسلم اتحاد کا ایک نمونہ پیش کرتی تھی۔ پھر اُو میلہ کے وقت مینا بازار (مہرولی) میں ہندو مسلمانوں کا کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

میری ابتداءِ عمر تک دِلّی کے ہندو مسلمانوں کا طرزِ رہائش یکساں تھا۔ ہندو مسلمانوں کا لباس یکساں تھا۔ ہندو مسلمان دونوں چُغے پہنتے تھے۔

www.taemeernews.com

ہندو اس نوع کی اُردو بولتے تھے۔

جام حیات لبریز ہے چھلکنے کی دیر ہے:

ایک ہندو مہترانی اپنی بہو سے لڑ رہی تھی۔ لڑتے لڑتے کہنے لگی۔

چُپ ہوتی ہے یا حلق میں جھاڑو ٹھونس دوں۔ معلوم ہوگا دُم دار تارہ نکل آیا۔

۱۲- ۱۹۱۱ء میں ماسٹر چمن لال ایک پرائمری اسکول ٹیچر تھے۔ اُنھوں نے اپنے دوست ماسٹر حیدر حسن کے بیٹے نہیں، بھتیجے ڈاکٹر اظہر علی (پروفیسر سینٹ اسٹیفنز کالج۔ دلّی) کو ام۔ اے کرایا۔

ماشاءاللہ کیا بھلے لوگ تھے اور کیا بھلے دن تھے۔ انگریز قوم کا میں مدّاح ہوں۔ لیکن انگریز کی پالیسی (Devide And Rule) "افتراق ڈالو اور حکومت کرو" نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ ہندو مسلمان متحد رہتے تو انگریز کیا امریکنوں اور روسیوں سے آج ہم فائق ہوتے۔

لالہ کشن چند بعد میں اندھے ہوگئے تھے اور اندھے پن میں وکالت کرتے تھے۔ اندھے پن ہی میں اُنھوں نے گنیش فلور مل کی بنیاد ڈالی تھی۔

مرزا اچھو جان نے لالہ کشن چند کی جیسی خدمتیں کی تھیں، لالہ کشن چند نے اُن کی ویسی ہی قدر کی۔ میرے مکان کی پُشت پر بہت لمبی چوڑی زمین لالہ کشن چند کی ملکیت تھی۔ اس میں لالہ کشن چند نے مرزا اچھو جان کے رہنے کے واسطے مکان بنوایا

www.taemeernews.com

اور ساری زمین اُن کے نام کر دی۔

مرزا اُتھو جان کے تمام اخراجات لالہ کشن چند اٹھاتے تھے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ مرزا اُتھو جان آجکل کے سیاسی مسلمانوں سے زیادہ پکے مسلمان تھے اور لالہ کشن چند آجکل کے سیاسی ہندوؤں سے زیادہ پکے ہندو تھے۔ مگر دونوں میں وہ میل تھا کہ ویسا میل دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ لالہ کشن چند دولت و ثروت و کر دفر ہو جانے کے باوجود مرزا اُتھو جان کے ہاں پھیرے پر پھیرے کرتے تھے۔

ترکمان دروازے کی طرف ایک خاندان نتھوا گدھے والے کا تھا اور ایک خاندان تھا نوا تیلی کا۔ نتھوا کے متعلق روایت ہے کہ جنگل سے مٹی لاتا تھا اور بیچتا پھرتا تھا۔ اتفاقاً مٹی کھودتے میں اُسے خزانہ مل گیا اور وہ مالدار ہو گیا۔ لیکن بس مالدار ہو گیا۔ اُس کے خاندان کا کوئی آدمی قابلِ ذکر نہیں ہے۔

نوا نے تیل اور عطر کی تجارت میں بڑی ترقی کی۔ گلاب گندی (ہندو) اور نوا تیلی (مسلمان)، دلی کے دو ہی مشہور تاجر عطر تھے۔ گلاب گندی کی دوکان دریبہ کلاں میں اب بھی ہے۔

حافظ رحیم الدین

نوا تیلی کے پوتے حافظ رحیم الدین نے دلی میں امتیاز حاصل کیا۔ شکل صورت اور عادات و خصایل سے تیلی نہیں، شریفوں کے شریف معلوم ہوتے تھے۔ لمبے تڑنگے۔

گٹھیلا جسم۔ اچھا ناک نقشہ۔ شام کو گول ٹوپی۔ تن زیب کا انگرکھا۔ تنگ مُہری کا پاجامہ اور کامدار سلیم شاہی جوتی پہن کر باہر نکلتے تو نگاہیں اُٹھنے لگتیں۔

کچھ پڑھا لکھا بھی تھا مگر ذہانت وطباعی کی وجہ سے زیادہ علمیت کا گمان کیا جاتا تھا۔ لوگ وعظ کہنے اور انجمنیں تقریر کرنے کے لئے بلاتی تھیں۔ عمایدِ شہر کی مجلسوں میں پہنچ تھی۔ علمِ مجلسی سے واقف اور طلیق اللسان تھے۔ عمایدِ شہر عزت کرتے تھے۔ مگر اُنھوں نے اپنے تئیں ہمیشہ تیلی ہی سمجھا اور تیلی ہی کہا۔ تیلی نام کا جزو تھا۔ حافظ رحیم الدین تیلی کہلاتے تھے۔

ایک صاحب تھے بابو کرامت علی۔ فراشخانے میں رہتے تھے۔ وہیں نواب اکبر علی خاں اور نواب محمد علی خاں، دونوں بھائیوں کی بھی حویلیاں تھیں۔ نواب اکبر علی خاں کے سب سے چھوٹے لڑکے شوکت علی خاں کا اور میرا اسکول کا ساتھ تھا۔ ایک دن شوکت علی خاں مجھے اور ضیاء الدین احمد برنی[1] کو اپنے گھر لے گئے۔ ہم اُن کے ہاں بیٹھے تھے کہ بابو کرامت علی تہ بند باندھے اور کرتا کندھے پر ڈالے اور دوسرے کندھے پر بلوتی کے بیٹے کو بٹھائے تشریف لائے۔ میں اور ضیاء الدین اُنھیں نہیں جانتے تھے۔ شوکت علی خاں نے تعارف کرایا کہ "یہ بابو کرامت علی ہیں۔ انڈنٹ رائٹری (تجارتی خط وکتابت) ان کا پیشہ ہے۔ نمبر اوّل کے انڈنٹ رائٹر ہیں۔ لیکن ہمیں انڈنٹ رائٹری سے کیا کام۔ ہم تو بابو جی کے دوسرے کمال کے قائل

---

[1] برنی صاحب بھی میرے ہم جماعت رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

ہیں۔ ہاں بابو جی! بتاؤ تو دونوں کے اگلے پچھلے حالات؟ یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ میں نے اور ضیاء الدین نے انٹرنس کا امتحان دے رکھا تھا۔ بابو جی فوراً بولے۔ ضیاء الدین پاس ہو جائیں گے اور بی۔ اے تک پہنچیں گے۔ مجھ سے کہا۔ تم فیل ہو گے اور پڑھنا چھوڑ دو گے۔ مگر پھر ساری عمر پڑھتے ہی رہو گے اور تمھارا شمار اہل علم میں ہونے لگے گا۔

اِس کے بعد بابو کرامت علی نے بادامی کاغذ کا تختہ اُٹھایا اور پنسل سے اُس کے چاروں صفحے بھر دیئے اور میرے اگلے پچھلے تمام حالات لکھ ڈالے۔ وہ نہ ہاتھ دیکھتے تھے اور نہ زائچہ بناتے تھے۔ بس پیشانی کو گھورتے تھے اور لکھتے چلے جاتے تھے۔ چاروں صفحے بھر گئے تو مجھے تھما دیئے۔ میں نے دیکھا کہ گذشتہ حالات صحیح ہیں۔

۱۹۰۹ء میں نظام المشائخ نکلا اور اُسے نکلے ہوئے کئی سال گذر چکے۔ یکایک کسی نے سندیسا سُنایا کہ آج بابو کرامت علی ملے تھے۔ اب کے جمعہ کو جامع مسجد سے سیدھے آپ کے پاس آئیں گے۔ بابو جی کی درمیان میں شکل نہیں دیکھی تھی۔

بابو کرامت علی نے نظام المشائخ کے اجرا سے چار سال قبل، جبکہ شان گمان بھی نہ تھا، پیشین گوئی کی تھی کہ تم صحافت کا پیشہ اختیار کرو گے اور متعدد ماہوار، ہفتہ وار اور روزانہ پرچے جاری کرو گے۔ بابو کرامت علی جمعہ کو آئے اور آتے ہی پوچھا۔ کیوں ہماری پیشین گوئیاں سچّی ثابت ہو رہی ہیں نا۔ آئندہ ہر سال ہم اِسی ماہ اکتوبر کے

www.taemeernews.com

پہلے جمعہ کو آیا کریں گے اور پوچھتے رہیں گے کہ سال بھر میں ہماری کتنی پیشین گوئیاں سچی ثابت ہوئیں۔ چنانچہ تادمِ مرگ بابو کرامت علی نے یہ وضع نباہی۔ اس ایک جمعہ کے سوا اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اکتوبر کے پہلے جمعہ کا سالانہ پھیرا اُنھوں نے ناغہ نہیں کیا۔ پہلے اطلاع کر لیتے تھے کہ وہ جمعہ اگلا ہے۔ پھر وہی جامع مسجد سیدھا آنا اور آدھا دن ساتھ گزارنا اور سال بھر کے لیے غایب ہو جانا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے یہ سلسلہ بیس برس چلا۔

خاکسارِ عالم

ایک صاحب تھے غلام نظام الدین۔ اُنھوں نے اپنا عُرف "خاکسارِ عالم" رکھا تھا۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھیں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی ہونہاری کا سب سے پہلے احساس ہوا۔ خواجہ صاحب کو اُنہی نے گنگوہ (حضرت مولانا رشید احمد) کے مدرسے میں داخل کرایا تھا۔ خواجہ صاحب اُنھیں اپنا محسن اور سرپرست کہا کرتے تھے اور اُن کی جھڑکیاں سُن لیتے تھے۔

خاکسار صاحب کی چاندنی چوک میں کتابوں کی دوکان تھی۔ پھر دریبہ آ گئے تھے۔ خواجہ صاحب کا معمول تھا کہ چوتھے پانچویں اُن کی دُکان پر جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کی جو بات اُن کے نزدیک نازیبا ہوتی تھی اُس پر وہ خواجہ صاحب سے بگڑتے تھے، لیکن تنہائی میں، یا بس میری اور بھتیا احسان کی موجودگی میں، ورنہ جب خاکسار صاحب خواجہ صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے تو خواجہ صاحب اُن کی

www.taemeernews.com

تو تنہائی کا کام کیا تھا، ہمہ وقت خلقت جمع رہتی تھی، اُس مجمع میں خاکسار صاحب دُور بیٹھتے تھے، قریباً جوتیوں میں۔ خواجہ صاحب قریب بلاتے تو ہاتھ جوڑ کر کہہ دیتے تھے۔ "نہیں سرکار۔ نہیں غریب نواز۔ یہیں ٹھیک ہوں۔" آگے نہیں آتے تھے۔ خواجہ صاحب سے انھوں نے اپنی عزت نہیں بڑھوائی۔ نہ اپنے بچوں کو نوکریاں دلوائیں۔ بے لوث۔ بے نیاز اور مخلص انسان تھے۔

وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ایک دوست کے گھر ہفتہ میں دو بار جایا کرتے تھے۔ جس کے گھر بھی جاتے تھے پان ضرور لے جاتے تھے۔ اُن دوست کے لئے گرم گرم دودھ کا شکینا بھی ہوتا تھا۔ ستر بہتر برس قبل کا واقعہ ہے۔ دلی کے ہندو مسلمانوں میں محرم کے موقع پر اتفاقاً فساد ہو گیا۔ ہندو محلوں میں سے مسلمانوں نے گزرنا بند کر دیا اور مسلمان محلوں سے ہندوؤں نے نکلنا چھوڑ دیا۔ اُن دوست کے پاس جانے کے لئے ہندوؤں کا محلہ بیچ میں پڑتا تھا۔ خاکسار صاحب نے دوست کے پاس جانا نہیں ترک کیا۔ پان اور دودھ سمیت برابر پہنچا کئے۔

دلی کے کانگریسی لیڈر سید حیدر رضا نے دِلی والوں سے ٹرام کا بائیکاٹ کرایا۔ ٹرام دلی میں نئی نئی چلی تھی۔ خاکسار صاحب بھی حیدر رضا کے ہم خیال ہو گئے۔ پھر حیدر رضا نے تو انگلستان جا کر کسی انگریز عورت سے شادی کر لی لیکن خاکسار صاحب بائیکاٹ کے بعد تیس سال جئے، تیس سال ٹرام میں نہیں بیٹھے۔

میرے ایک عزیز میر سلطان علی پوسٹ مین تھے۔ خواجہ صاحب نے اُن کی لڑکی سے خاکسار صاحب کے لڑکے بابو محمد دین ملنسار کی شادی کرانی چاہی۔ میں متفق تھا اور لڑکی کے باپ بھی رضامند تھے۔ مگر خاکسار صاحب نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ "ناصاحب! مجھے گنہگار مت کرو۔ میری مجال ہے کہ سیّد کی بیٹی لاؤں۔ آلِ رسولؐ کی بیٹی۔"

مطبوعات نظام المشائخ خریدتے تو دکانداروں کی طرح کمیشن پر جھگڑتے لیکن مجھے یا خواجہ صاحب کو ضرورت پڑ جاتی تو اُن کا سارا روپیہ گویا ہمارا تھا۔

میں نے مٹتی ہوئی دلّی کے لاتعداد وضعدار دیکھے ہیں۔ ہز ہائی نس سر امیر الدین احمد خاں والیٔ لوہارو اور اُن کے اعزا نواب احمد سعید خاں طالب، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل، سب بڑے رکھ رکھاؤ کے لوگ تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں۔ حکیم واصل خاں، حکیم اجمل خاں، منشی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ نواب فیض احمد خاں۔ نواب کرم اللہ خاں عرف ننّھے خاں سب ہیرے تھے۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا راشد الخیری اور مولانا محمد نذیر فراق کا بھی جواب پیدا نہیں ہوگا۔ یہ مختلف طبقوں کے حضرات تھے۔ جس طبقے سے خاکسار صاحب کا تعلق تھا اُس میں وہ یکتا تھے۔

اپنے ہم عمروں میں خاکسار صاحب جیسا جان پر کھیلنے والا وضعدار مجھے صرف ایک نظر آیا۔ اشتیاق احمد چشتی۔ چشتی صاحب کا لالہ شمبھوناتھ، مالکِ دِلّی پرنٹنگ ورکس سے دوستانہ تھا۔ اُنھوں نے شمبھوناتھ جی کے ہاں اُس وقت جانا نہیں

چھوڑا جبکہ ہندو مسلمانوں کا بگاڑ ۱۹۴۷ء کے بگاڑ سے دو تین ہی ڈگری کم رہ گیا تھا

میر سلطان علی کے بڑے بھائی میر سید علی بھی لائق ذکر ہیں۔ میر سید علی احمدی بیگم کے گاؤں حمید پور کے کارندے تھے۔ اُن کا دماغ مقدمہ بازی میں خوب لڑتا تھا۔ بڑے بڑے چلتے پرزے وکیل اور بیرسٹر اُنھیں استاد کہا کرتے تھے۔ فرید آباد کے کسی صاحب سے میر صاحب کا مقدمہ چل پڑا۔ مقدمے سے قبل فرید آبادی صاحب دلّی آتے تھے تو میر صاحب کے مہمان ہوتے تھے۔ مقدمے کے زمانے میں بھی میر صاحب نے مجبور کیا کہ ٹھہرو میرے ہی ہاں۔ چنانچہ مقدمہ کی تاریخوں پر تشریف لاتے اور میر صاحب کے ہاں ٹھہرتے۔ کھاتے، پیتے اور پورا آرام اُٹھاتے حتیٰ کہ پیشی کے دن عدالت میر صاحب کی سواری میں جاتے۔ مخالفت عدالت کے کمرے تک محدود رکھتے۔ وہاں دشمنوں کی طرح مقابلہ کرتے۔ عدالت کے کمرے سے باہر نکلے اور پھر یار کے یار۔

احمدی بیگم کے خاندان کے میر صاحب بے حد حساب وفادار تھے اور احمدی بیگم کے نواسے سید اقبال حسین (سابق سپرنٹنڈنٹ پولس، ٹریبونل پاکستان) اور نواس داماد ڈاکٹر اظہر علی (پروفیسر سینٹ سٹیفنز مشن کالج، دہلی) کا برتاؤ بھی میر صاحب کے ساتھ یہ تھا کہ اپنے اعلیٰ عہدوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ چلیں پھر پھر کر میر صاحب کو بلاتے تھے۔

www.taemeernews.com

میر باقر علی داستان گو

وضع داری کے لفظ سے میر باقر علی یاد آگئے۔ میر باقر علی داستان گو۔ میر صاحب کا شمار بھی باوضع دلی والوں میں تھا۔

میر صاحب کو ریاست پٹیالہ میں کسی رئیس نے داستان کہنے کے لیے بُلایا۔ میر صاحب نے سوچا کہ ایک کے ہاں تو داستان کہوں گا ہی، کیوں نہ یہاں اور دو چار امیروں سے بھی فایدہ اُٹھاوں۔ دو چار داستانیں اور ہو جائیں تو اچھی رقم اِس شہر سے مل جائے گی۔ چنانچہ داستان شروع کرنے سے پہلے اور داستان کہنے کے درمیان جو ذرا بھی کھاد انسان مجلس میں قدم رکھتا، میر صاحب اُس سے ایسا تپاک کرتے کہ وہ اُن کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ آنے والوں میں ایک صاحب بہت ہی شاندار آئے۔ لمبے ترنگے۔ وجیہہ۔ قیمتی کپڑے کا اوورکوٹ زیب تن کئے ہوئے۔ نہایت اُجلی شلوار۔ خوشنما پگڑی۔ میر صاحب نے اُن کا زیادہ تپاک سے استقبال کیا۔ اُن حضرت نے بھی پوری توجہ سے استقبال کا جواب دیا۔ میر صاحب سمجھے یہ شخص امیر ہی نہیں ہے، خلیق بھی ہے۔ میر صاحب نے انھیں مسند پر بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ مگر وہ میر صاحب کے قریب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے انکسار کی نعمت بھی عطا کی ہے۔

غرض میر صاحب دورانِ داستان میں اُن صاحب کی طرف غیر معمولی التفات کرتے رہے اور انھوں نے بھی میر صاحب پر اتنی نظرِ کرم رکھی کہ میر صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ امیر میرا بڑا قدر دان نکلا۔

www.taemeernews.com

داستان ہو چکی تو میر صاحب نے اُن سے ادب کے ساتھ دریافت کیا کہ جناب والا کا یہاں کس جگہ قیام ہے۔ اُنھوں نے کہا۔ "جی۔ قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ میں وہاں پٹواری ہوں۔" میر صاحب ششدر رہ گئے اور اُس دن سے میر صاحب نے گرہ باندھ لی کہ آیندہ کبھی لالچ کر کے ذلیل نہیں ہوں گا۔

ہندوستان کہانی، قصّے اور ڈرامے کا مُلک ہے۔ کہانی قصّے اور ڈرامے سے ہندوستان کو پُرانا تعلق ہے۔ ہندو مذہب کی بقا کہانی، قصّے اور ڈرامے کی وجہ سے ہے۔ ہندوؤں کو مجتمع رکھنے والی اکثر باتیں کہانیوں، قصّوں اور ڈراموں کی شکل میں ہیں۔ جنھیں معمولی ہندو بھی دل چسپی سے پڑھتا اور سنتا ہے اور ڈراما ہو تو آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اثر لیتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات قصّے کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں اور قرآن میں دوسرے پیغمبروں کے قصّے بھی موجود ہیں اور قرآن نے اِن واقعات کو قصص ہی کہا ہے۔ اور مُسلمان بادشاہوں نے تو اپنے عروج کے زمانے میں جھوٹے سچّے قصّوں کو ایسا اپنا لیا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ قصّے کہانیوں کا جتنا شوق اُنھیں رہا اور کسی کو نہیں رہا۔ مشہور عربی کتاب "الف لیلہ" جس کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اُن طویل اور مسلسل قصّوں کا مجموعہ ہے جو ہزار راتوں میں خلیفہ ہارون الرشید کو سُنائے گئے تھے۔ داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش رُبا کی ضخیم مجلدات بھی مسلمان بادشاہوں اور اُن کے درباریوں کے شوق کا نتیجہ ہیں۔

www.taemeernews.com

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد بھی اسی زنجیر کی کڑی ہے۔

قصے لکھے بھی جاتے تھے اور زبانی بھی سنائے جاتے تھے۔ زبانی قصے سنانے والوں کی آخری دہلوی یادگار کا نام میر باقر علی تھا۔ میر باقر علی کے باپ دادا شاہانِ مغلیہ کو داستانیں سنایا کرتے تھے۔

میرا لڑکپن تھا اور میر باقر علی ادھیڑ تھے، جب میں نے انھیں سید جالب کی صحبت میں دیکھا۔ پھر میں ادھیڑ ہو گیا اور میر باقر علی پر بڑھاپا چھا گیا۔ اتنے عرصے مجھے اُن سے اور انھیں مجھ سے ملنے کا اکثر و بیشتر اتفاق ہوا اور میں نے سیکڑوں داستانیں اُن کی زبان سے سنیں۔

میر باقر علی منحنی آدمی تھے۔ دُبلے پتلے دھان پان۔ قد بھی معمولی بیکن داستان میں کسی بادشاہ کا ذکر آجاتا کہ اُس نے یہ حکم دیا، تو حکم کو اس شان سے اور ایسے لہجے میں ادا کرتے کہ گمان ہونے لگتا تھا کہ ہمارے روبرو کوئی منحنی، دُبلا پتلا داستان گو داستان نہیں کہہ رہا، بلکہ ہم ایک جیتا جاگتا بادشاہ کے دربار میں میں اور اُسے بولتا دیکھ رہے ہیں۔ علی ہذا اگر کسی ڈاکو کی نقل کرتے تو اُن میں اور ڈاکو میں فرق نہ نظر آتا۔ اگر کسی شریف معمر عورت کا قول دوہراتے تو معلوم ہوتا کہ دادی اماں گفتگو فرما رہی ہیں۔ دانت ہوتے ساتے بے دانتوں کے بن جاتے۔ سرائے کی بھٹیاری کا خاکہ اُڑاتے تو سرائے کا سماں بندھ جاتا۔

داستان کے دوران میں لوگ داد دیتے تھے، مگر میر صاحب مشین کی طرح

داستان کہے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ داد کو انھوں نے سُنا ہی نہیں، البتہ جب داستان کہہ لیتے تو داد کا نہایت مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرتے۔

میر صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی معلومات کو تادمِ مرگ ترقی دیتے رہے۔ اُن کی تعلیم باضابطہ کچھ نہیں تھی۔ لیکن ذاتی مطالعہ سے اُنھوں نے اتنا علم تحصیل کر لیا تھا کہ اہلِ علم سے دباؤ نہیں کھاتے تھے۔ کم از کم گفتگو میں تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اُنھیں ہر علم و فن پر عبور ہے۔ داستانوں میں طب جسمانی و روحانی۔ علم الارض۔ علم الافلاک اور طبیعیات وغیرہ کے نکات عجب دلچسپ طریقہ سے شامل کرتے چلے جاتے تھے۔

میر صاحب لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ یہ نہیں تھا کہ چند داستانیں یاد تھیں۔ اُن کو دوہرا دیتے ہوں، بلکہ میر صاحب کی داستانیں طبع زاد ہوا کرتی تھیں۔ میں نے خود مختصر عنوان دیئے اور داستانیں لکھوائیں۔

راجہ نوشاد علی خان، تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ) دِلّی آتے تھے تو خواجہ حسن نظامی کے رین بسیرے میں، یا میرے ہاں کوچہ چیلان میں، یا ہمایوں کے مقبرہ میں میر باقر علی کی داستان ایک دو بار ضرور سنتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ داستان گوئی میر صاحب پر ختم ہو گئی۔

میر صاحب کھرے سیّد تھے۔ نسلی اعتبار سے بھی شریف اور ذاتی اعتبار سے بھی شریف۔ کوئی اُن کی شرافت کو ٹھیس نہیں لگا سکتا تھا۔ راجہ، نوابوں، اور

www.taemeernews.com

بڑے بڑے رئیسوں کے ہاں جاتے تھے اور بہ حیثیت داستان گو جاتے تھے۔ لیکن یہ واقعہ ایسا نہیں ہے کہ اُنھوں نے خودداری کو ہاتھ سے دیا ہو۔ وہ فرقِ مراتب کا لحاظ بے شک رکھتے تھے اور غریب، امیر سب سے مناسب برتاؤ کرتے تھے۔ مگر کوئی نو بڑھیا۔ یا طور طریقوں سے ناواقف رئیس ذرا جامے سے باہر نکلتا تو داستان داستان میں اُس کی خبریں ڈالتے تھے اور بغیر پیسہ لئے اُس کے ہاں سے چلے آتے تھے۔ اُنھیں اپنی شرافت اور کمال کا احساس تھا۔ لیئے دیئے رہتے تھے۔ جب پیسہ پاس نہ ہوتا تھا تو دو ایک دستکاریوں سے واقف تھے۔ اُن کے ذریعہ پیٹ پال لیتے تھے۔ ضرورت مندی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ چھالیہ ایسی کترتے تھے کہ اب ویسی شاید ہی کوئی کتر سکتا ہو۔ لباس ہمیشہ اُجلا پہنتے تھے۔ خندہ پیشانی تھے، با اخلاق تھے۔ ملنے جُلنے اور ہر معاملہ میں وضع کے پابند تھے۔

جب چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تو اپنے گھر پر جمعے کے جمعہ داستان کہنے لگے تھے۔ آٹھ آنے یا روپیہ فی کس ٹکٹ مقرر کر دیا تھا۔ لوگ جوق جوق اُن کے گھر پہنچتے تھے اور داستان سُنتے تھے۔

داستان کہنے کے مقابلے میں میر صاحب کی تحریر کمزور تھی۔ تاہم نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ ذرا دیکھئے کیسے لکھتے نئی بیاہی ہوئی لڑکیوں کو سمجھاتے ہیں:۔

شرم اس لئے ہے کہ تم خاموش رہ کر دیکھو کہ سسرال کا طریقہ کیا ہے۔
سسرال والوں کے مزاج کس قسم کے ہیں، عام عادتیں کیسی ہیں۔ جب

www.taemeernews.com

تمھیں تمام باتوں کا علم ہو جائے تو اس وقت اپنی زندگی کا فیصلہ کرو۔

یہ ذہن نشین کر لو کہ اب تم ماں باپ کے گھر میں نہیں ہو۔ یہاں کے لوگ تم سے محبت اس طرح نہیں کریں گے جس طرح تمھارے ماں باپ کرتے تھے۔ یہاں مبادلہ ہوگا۔ تم دوسرے کو آرام دو گی، دوسرا تمھیں آرام دے گا۔ آدمی کا آرام اور تکلیف سب اس کے ہاتھ میں ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے کیا خوب کہا ہے:۔

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
مہمان کر تو اور کو تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے، پانی پلا پانی ملے

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے، آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے

کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

خاوند کی ذات کا بڑا خیال رکھو۔ جب اسے یہ ثابت ہو جائے گا کہ میرا آرام اس عورت

www.taemeernews.com

وابستہ ہے تو پھر وہ اپنے آرام کے واسطے تم کو آرام دے گا۔ خوبی تمھاری یہ ہے کہ اپنی عقل سے ہر بات معلوم کرو۔ خاوند کی جملہ چیزیں احتیاط سے رکھو۔ ہر چیز کے واسطے جگہ مقرر کرو تاکہ رات میں بھی ضرورت پڑے تو فوراً لے آؤ۔

سسرال میں بے وجہ کوئی سخت سست کہے تو یہ سمجھو کہ آدمی کا کام آدمیت ہے اُس نے آدمیت کے خلاف حرکت کی ہے تو وہ آدمیت سے گرا ہوا ہے۔ تم نے بھی اُسے ویسا ہی جواب دیا تو تم بھی آدمیت سے گر جاؤ گی۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ غصہ کی ابتدا جنون اور انتہا پشیمانی ہے۔ حضرت ذوق بہادر شاہ بادشاہ کے استاد تھے۔ کسی نے اُن کی ہجو لکھی۔ ایک شاگرد نے کہا۔ آپ بھی جواب لکھئے۔ اُنھوں نے فرمایا۔ میاں! جس زبان سے میں اللہ کا نام لیتا ہوں اُس سے گالی نہیں نکل سکتی۔ اللہ نے زبان اچھے لفظ بولنے کے لئے دی ہے ؎

قدرت کو ناپسند ہے سختی زبان میں
پیدا ہوئی نہ اس لئے ہڈی زبان میں

اللہ تعالیٰ جس بندہ پر عنایت کرتا ہے اُسے منیار و زر نہیں بھیجتا۔ بلکہ اُس کے خیالات درست کر دیتا ہے۔ عقلمند کی زبان سے آگے عقل ہوتی ہے، اور بیوقوف کی عقل کے آگے زبان۔ تم ہمیشہ عقل سے کام لو۔

بات جب تک تمھارے منہ میں ہے تمھاری غلام ہے، اور جب منہ سے نکل گئی

www.taemeernews.com

تو تم اُس کی غلام ہو گئیں۔ اپنی زندگی بیبیو! غلامی میں نہ گزارو۔ آقا بن کر جیو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سسرال میں کمینہ عورتیں میٹھی میٹھی باتیں کر کے دل کا حال دریافت کر لیتی ہیں اور پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر ذلت کا باعث ہو جاتی ہیں۔ تم اُن سے نہ ملنا۔

چھوٹوں سے ہر دو محبت سے پیش آؤ۔ لیکن انھیں بھی سہیلی نہ بناؤ کہ وہ تمھارا مقابلہ کرنے لگیں۔ ایک حکیم سے کسی نے پوچھا ہم اپنے چھوٹوں سے کیسا برتاؤ کریں۔ اُس نے جواب دیا جیسا تم اپنے بڑوں سے چاہتے ہو۔

بڑی بوڑھیوں کا ادب ملحوظ رکھو۔ جب بات کرو اُن کی آواز سے بلند آواز نہ نکالو۔ برابر والیوں سے مساوات کا برتاؤ کرو۔

خوش نصیب ہے وہ جو نصیحت سُنے اور اُس پر عمل کرے۔

جس بات کو نہ جانو۔ کہہ دو ہم نہیں جانتے۔ اگر واقف بھی ہو تو اس کی صحت کے متعلق اطمینان کر لو۔ دوسروں سے دریافت کر لو۔ دریافت کرنا عیب نہیں ہے۔ مشورے کا عادی شرمندہ نہیں ہوتا۔

خاوند کے آنے کے وقت کو کبھی نہ بھولو۔ خاوند کے گھر میں آنے سے پہلے گھر کے تمام کاموں سے فارغ ہو جاؤ۔ جس وقت خاوند آئے چہرہ بشاش رکھو، تاکہ خاوند سمجھے کہ میرے آنے سے بیوی خوش ہوئی۔ اس سے اُس کی

www.taemeernews.com

دل چسپی کی باتیں کرو۔ سب سے پہلے اُس کے مزاج کا اندازہ لگاؤ کہ خوش خوش آیا ہے یا پریشان ہے۔

میں حیران ہوں کہ لوگ زمانہ کو بُرا کہتے ہیں، حالانکہ بُرائی تو خود ہم میں ہے۔ زمانہ تو یکساں چل رہا ہے۔ دُنیا میں جمع کی ہوئی یا کسی صورت سے ہاتھ آئی ہوئی دولت فخر اور ناز کے قابل نہیں۔ دولت تو چنچل ہے۔ ایک جگہ کہاں رہتی ہے۔ آج آئی اور کل گئی۔ لیکن عقل۔ علم اور صحت۔ یہ اللہ کی دی ہوئی دولتیں ہیں۔ ان کی تم حفاظت کرو۔ یہ تمھاری سچی ہمدرد اور ہر وقت کی خادم ہیں۔

دنیا میں اس طرح رہو کہ کبھی کوئی تم پر اعتراض نہ کرے۔ جب ثابت ہوگیا کہ ہمارے تمام کام اور معاملات بات ہی کرنے پر موقوف ہیں تو پھر سب سے پہلے باتیں کرنے اور باتیں سننے کا سلیقہ سیکھو۔

بات سننے کا سلیقہ یہ ہے کہ بات کو غور سے اور دل لگا کر سنو اور جب تک بات کرنے والا چپ نہ ہو جائے تم کچھ نہ کہو۔ بات سنتے وقت چہرہ بشاش رکھو، اور جو جواب تمھارے ذہن میں آئے اس کے کل پہلو جانچ لو۔ جو لفظ زبان سے نکلے اُس کے زیر زبر پیش کا دھیان رکھو۔ اور اتنی جلدی مت بولو کہ دوسرے کی سمجھ میں نہ آئے:

ایک مختصر سی داستان میر باقر علی کی مولانا حکیم ابو الکمال حمید اللہ ماہر دہلوی کو یاد تھی، وہ اُنھوں نے لکھوا کر دی ہے۔ مولانا ماہر پیدائشی نابینا ہیں، اس لئے

www.taemeernews.com

حافظے کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ اسی حافظے کی بدولت اُنھیں علمِ دین حاصل ہوا، اور اسی حافظے کی بدولت طبیب بنے۔ آنکھیں نہیں دیکھتیں لیکن کوئی اور قوت ہے کہ سب کچھ دکھا دیتی ہے۔ بڑے اچھے شاعر ہیں۔ بعض نظموں میں مناظر کی تصویر کھینچی ہے۔ آنکھوں والے حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ منظر ہمیں نہیں سوجھا اور مولانا کو سوجھ گیا۔ میر باقر علی کی داستان کا لفظ بلفظ یاد رکھنا بھی مولانا کا کمال ہے وہ جو سن لیتے ہیں نقش ہو جاتا ہے۔

خرابِ داستان ملاحظہ فرمائیے:۔

ایک شہر میں دو بھائی رہتے ہیں۔ چھوٹا بھائی لائق ہے۔ اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ بڑا بھائی دیوانہ ہے مگر بزعم خود فرزانہ۔

اتفاق سے چھوٹے بھائی کی نئی نویلی دُلہن میکے سدھاری ہوئی ہے۔

جب چھوٹے بھائی کو یہ بات محسوس ہوئی کہ دُلہن کو بلانا چاہیئے تو ایک دن اُس نے بڑے بھائی سے کہا کہ بھائی! تم جاکر اپنی بھاوج کو لے آؤ مگر دیکھنا میں تم سے ڈرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم وہاں جاکر بھی دیوانہ پن بگھارو۔ دیکھو جو کچھ وہ لوگ تم سے پوچھیں اُس کا جواب "ہاں" دینا یا "نہیں"۔ مہربانی کرکے ان دو باتوں کے علاوہ کچھ نہ کہنا۔ بڑے بھائی نے کہا۔ واہ بھائی! تم نے خوب تدبیر بتائی۔ مگر کیا آپ مجھے اتنا دیوانہ خیال فرماتے ہیں جو ایسی باتیں بناتے ہیں۔

www.taemeernews.com

غرض تو اُن کے بھائی بھائی سے رخصت ہو کر سردیوں کے کپڑے پہن، برسات کا زمانہ، یہ نہ خیال کیا کہ سفر میں تکلیف ہو گی، ٹٹو پر سوار ہو روانہ ہوئے۔

کئی روز کے بعد ایک دن یہ ایسے جنگل میں پہنچے ہیں کہ جہاں کوئی قریہ۔ قصبہ۔ جھانوڑا۔ کریہ۔ نگرہ۔ زماد۔ سرائے۔ ماجرہ۔ تکیہ۔ چوپالا۔ پن چوکی۔ بیگھہ۔ گاؤں۔ گمراؤں۔ کھیت۔ گڑھی۔ آتارا۔ گھر گرہی۔ پڑاؤ کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ کف دست میدان سُنسان۔ بیابان، مگر ابر کچھ بلند ہو چکا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بھیگے بھیگے درختوں کے پتے۔ جگہ جگہ تالابوں میں لگجا لگجا برساتی پانی بھرا ہوا۔ غرض عجیب عالم ہے ؎

بہار آئی ہے ۔: وہ رنگ رلیوں کا زمانہ ہے
زباں پر بلبلوں کی شادیِ گل کا ترانہ ہے
چمک دیتے ہیں کیا پانی کے قطرے سبزۂ گلشن میں
ٹکی ہیں موتیوں کی جھالریں صحرا کے دامن میں
مزیّن گل زمین و کوہ فرشِ مخملی سے ہے
صدا آتی مبارکباد کی ہر ہر کلی سے ہے

دیوانے نے جو یہ عالم دیکھا، بند قبا کھول دیئے۔ خوش خوش آگے

www.taemeernews.com

بڑھے کہ سامنے درختوں میں انھیں دھواں اُٹھتا نظر آیا۔ اب جو یہ پہنچے ہیں اُن درختوں کے قریب تو دیکھا اُنھوں نے کہ سرائے ہے۔

سرائے کا کچّا دروازہ۔ بانسوں کے کواڑ۔ اندر سرائے کے کچھ کالی کالی کیچڑ، کچھ گوبر، کچھ بھوسہ ملا ہوا پانی بہہ رہا ہے۔ صحن میں سرائے کے ایک چھکڑا، جس پر بھیگے ہوئے دو لڑے۔ گلی ہوئی چھپّیاں ۔۔۔ چھپّر تو ایسا کہ جگہ جگہ سے ڈھاپنچ۔ چھپّر کا آگ لگا ہوا دھواں دکھائی دیتا ہے۔ بیچ میں ایک مسافر ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک طرف ایک بھٹیاری۔ کالا رنگ اُبلا سا چہرہ۔ چنیاں سی آنکھیں۔ چپٹی ناک۔ نیلی سوسی کا پاجامہ۔ ادھوڑی کا جوتا۔ لال کرتی گلے میں۔ چُندری اُس کے سر پر سے ڈھلکی ہوئی۔ ایک پیڑھی پر بیٹھی ہے، ہاتھ میں آٹے کا پیڑا ہے۔ سامنے کچھ مسافر بیٹھے ہیں کہ یہ پہنچے۔ اِنھوں نے بھٹیاری سے کہا۔ بی بھٹیاری! ہم رات کو ٹھیریں گے۔ بھٹیاری نے کہا۔ میں صدقے۔ وہ سامنے بنگلہ ہے۔ بسم اللہ ٹھیریے۔ اب جو یہ پہنچے اُس کوٹھری کے قریب، تو واہ واہ، دو کڑیاں اُس کی چٹخی ہوئی، پانی جگہ جگہ سے ٹپک رہا ہے۔ چونکہ کوٹھڑی بھیگی ہوئی ہے اور اُس میں بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے ہیں، جب بوند پڑتی ہے تو دیواروں تک چھینٹیں اُڑتی ہیں۔ اُنھوں نے بھٹیارے سے کہا۔ بھائی! یہ کوٹھڑی ہمیں نہیں بھائی۔ یہ تو جگہ جگہ سے ٹپکتی ہے۔

بھٹیارے نے کہا۔ پیر و مرشد! برسات کا زمانہ ہے۔ آجکل تو بڑے بڑے اسٹیشن ٹپک رہے ہیں۔

خیر انھوں نے کہا۔ اچھا بھائی چارپائی لاؤ۔ چنانچہ بھٹیارا چارپائی لایا، تو چارپائی کے بھی کان نکلے ہوئے۔ انھوں نے ناک کی سیدھ میں دیکھ کر کہا کہ بھائی! یہ تو گیلی ہے۔ اس نے کہا: سو رہیے اسی پر۔ غرض یہ کہ یہ لیٹے۔ رات کو روٹی پکوائی انھوں نے۔ کچھ آم کا اچار تھا۔ روٹی بچ گئی تو روٹی اور آم کا اچار اپنے منڈاسے میں لپیٹ سرہانے رکھ سو رہے۔ اب جو آنکھ لگی تو کتا روٹی کی بو سے ان کا منڈاسا بھی لے گیا۔ صبح اٹھے تو ننگے سر۔ گھبرا کر بھٹیارے سے کہا۔ بھائی! دیکھنا۔ کیا چیز ہماری جاتی رہی۔ بھٹیارے نے حیران ہو کر کہا۔ جناب، بہ اسباب ظاہر تو کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

خیر تو انھوں نے کہا۔ لو بھیا۔ اب ہم جاتے ہیں۔ چنانچہ ننگے سر روانہ ہوئے۔ بعد راستہ طے کرنے کے ایک دن، تیسرے پہر کے وقت یہ اس شہر میں پہنچے جہاں ان کی بھاوج رہتی تھیں۔ شہر کی فصیل مضبوط اور چوڑی۔ بارہ دروازے۔ چوراسی کھڑکیاں۔ ہر دروازے پر دو دو توپیں۔ توپچی ان کے قریب ہمیشہ بتی لئے ٹہل رہے ہیں۔ یہ ایک دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ شہر

www.taemeernews.com

نہایت آراستہ پیراستہ۔ چوڑی چوڑی سڑکیں۔ اُن پر چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ کٹورا کھنک رہا ہے۔ گرم بازاری ہو رہی ہے۔ دکانوں پر دُکاندار اُجلے پوش، سامان فروخت کرنے کا جوش۔ صراف۔ بزاز قصاب۔ کنجڑے۔ حلوائی۔ نانبائی اپنی اپنی دکانوں پر کاروبار میں مصروف ہیں اور شہر کے لوگ لباس اور پوشاک بدلے اِدھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ غرض یہ راستہ طے کرتے اور شہر کا تماشہ دیکھتے وہاں پہنچے۔ جہاں اِن کے بھائی کی سسرال ہے۔

اِن کے بھائی کے خُسر ایک پنشن یافتہ آدمی، گورا رنگ، اُنچی ڈاڑھی اونچی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، عینک لگی ہوئی۔ صحن میں کچھ مونڈھے بچھے ہوئے ہیں۔ دس پانچ دوست اُن کے موجود ہیں کہ یہ پہنچے۔

اُنھوں نے داماد کے بھائی کو ننگے سر آتے دیکھا، گھبرا کر پوچھا۔ خیر تو ہے۔ دیوانے نے سوچا۔ بھائی نے کہا تھا کہ "نہیں کہنا یا ہاں"۔ تو بھائی نے پہلے "نہیں" کہا تھا۔ تو بھی نہیں کہہ۔ دیوانے نے "خیر تو ہے" کا جواب دیا۔ "نہیں" اُنھوں نے کہا۔ بھئی تمھارے بھائی کیا کچھ بیمار ہیں۔ اِنھوں نے جواب دیا۔ "ہاں" اُنھوں نے کہا۔ بھئی کچھ علاج بھی ہو رہا ہے۔ اِنھوں نے جواب دیا۔ "نہیں" اُنھوں نے کہا۔ تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ مر گئے۔ اِنھوں نے جواب دیا "ہاں"

www.taemeernews.com

بس یہ سنتے ہی وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ زار زار رونے لگے۔ اِن کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ وہاں جو اِن کے بھائی کی ساس نے میاں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، گھبرا کر کہا۔ اجی خدا کے لئے جلدی بولو۔ کیا ہوا۔ میاں نے کہا۔ لڑکا اللہ کے ہاں سدھار گیا۔ خیر اللہ کی مرضی۔

اِن کی بھاوج مسند پر بیٹھی ہیں۔ گورے گورے ہاتھ پاؤں۔ چاند سا مکھڑا۔ گھونگٹ چہرے پر۔ زانو پر سر۔ گوری گوری باہوں میں ریت کی چوڑیاں۔ اُنھوں نے جو سُنا کہ خاوند کا انتقال ہو گیا، بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا۔ کیوں اے فلک کج رفتار! کیا ہم ہی اِس قابل تھے کہ ہمیں یہ صدمہ پہنچے۔ خیر ؎

دُنیا میں تمہیں زور تو محشر میں ستمگر
اللہ کے آگے تیری فریاد کریں گے

غرض اندر باہر کہرام مچ گیا۔ محلّے کے لوگ جمع ہو گئے۔ درود فاتحہ کی گئی۔ جب سب کچھ ہو چکا تو دو چار دن کے بعد دیوانے نے بھائی کے خُسر سے کہا۔ جناب! بھاوج کو میرے ساتھ کیجیے۔ اُنھوں نے کہا۔ بھئی وہ تو رانڈ ہو گئی۔ دیوانے نے کہا۔ بجا فرمایا اور یہ ناکام خستہ گام بھائی کے پاس پہنچے۔ بھائی نے پوچھا بھئی! بھاوج کو نہیں

لائے۔ انھوں نے کہا۔ اجی جناب! بھاوج کو کیا لاتا، وہ تو رانڈ ہوگئیں۔ بھائی نے کہا۔ اے تیرا ستیاناس، میں جیتا بیٹھا ہوں اور وہ رانڈ ہوگئیں۔ انھوں نے کہا۔ آپ کا کیا ہے۔ پھوپی اماں رانڈ ہوئیں آپ بیٹھے رہے۔ دادی صاحبہ رانڈ ہوئیں آپ بیٹھے رہے۔ اماں جان رانڈ ہوئیں، آپ بیٹھے رہے۔ آپ کا کیا ہے، آپ تو بیٹھے ہی رہیں گے۔

اب میں میر محمد حسین کا ذکر کرتا ہوں۔ میر محمد حسین دلّی کے ممتاز لوگوں میں تھے۔ میر تفضّل حسین کے حقیقی پوتے، جنھیں ۱۸۵۷ء کا باغی قرار دے کر انگریزوں نے دار پر چڑھایا تھا۔ تفضّل حسین کی کھڑکی دلّی کا ایک محلّہ ہے۔ یہاں میر تفضّل حسین کی حویلی تھی۔ اب صرف کھڑکی باقی رہ گئی ہے۔

کلاں محل کے بھی میر تفضّل حسین مالک تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب اُن کی جائیداد نیلام ہوئی تو اس محل کو بیس روپے میں چُنّا مل کے نام چھوڑ دیا گیا تھا۔

میر محمد حسین محکمہ نمک میں انسپکٹر تھے۔ تحریک عدم تعاون نے نوکری چھڑوا دی اور دوکان کرا دی۔ چاندنی چوک میں میر محمد حسین فاؤنٹن پینوں اور سائیکلوں کی تجارت کرنے لگے۔

دوکان خاصی چل رہی تھی کہ حکیم اجمل خاں وغیرہ نے انھیں میونسپل کمیٹی کی

www.taemeernews.com

ممبری کے لئے کھڑا کر دیا اور کانگریس کا ٹکٹ دیدیا اور میر صاحب کمیٹی میں جا بیٹھے۔

مگر میر محمد حسین ضمیر کے تابعدار تھے۔ ڈو دی رائٹ (Do The Right) اُن کا تکیہ کلام تھا۔ غلط بات کا وہ کانگریس کی ساتھ نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کانگریس نے دوسری دفعہ اُن کے سر پہ ہاتھ نہیں دھرا اور حکومت نے اُنھیں نامزد کر دیا۔

حکومت کی نمایندگی کے دوران میں بھی میر محمد حسین حق کی حمایت کے عادی رہے۔ حکومت نے انھیں خاصا نباہا۔ کانگریس نے تین برس میں ہٹا دیا تھا حکومت نے نو برس میں ہٹایا۔ پبلک کی طرف سے انتخابات ہو چکتے تھے تب حکومت اپنی طرف سے نمایندے نامزد کیا کرتی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں میرے پہلے انتخاب کے بعد ایک دن دوپہر کو میر محمد حسین تشریف لائے اور کہنے لگے۔ "یہیے ہمارا تو پتہ کٹ گیا" میں نے پوچھا۔ "کیا مطلب" بولے۔ "آج مجھے چیف کمشنر نے ٹٹولا تھا کہ نئی کمیٹی غالباً سرکاری صدر (ڈپٹی کمشنر) کے خلاف تجویز پیش کرے گی۔ آپ کی اِس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک میونسپل کمیٹی کا صدر غیر سرکاری ہونا چاہیئے" میں نے سوال کیا۔ "پھر چیف کمشنر نے کیا کہہ دیا ہے کہ آپ کو نامزد نہیں کروں گا" بولے۔ "انگریز زبان سے نہیں کہتے۔ عمل کیا کرتے ہیں"

میر صاحب کا اندازہ صحیح تھا۔ میر صاحب نامزد نہیں ہوئے۔ اور اتفاق ملاحظہ فرمایئے، سرکاری صدر کے خلاف تجویز پیش کرنے کا شرف فال مجھ فقیر

www.taemeernews.com

کے نام پڑا[1]۔ میری ممبری کی پہلی تجویز اور پہلی تقریر اسی مسئلہ کی بابت ہوئی تھی جس کے تصور سے میر محمد حسین کو کمیٹی بدر کیا گیا تھا۔ اس تقریر نے کمیٹی میں میرے قدم جما دیئے۔

میر صاحب حقیقتاً اس قسم کے آدمی تھے جس قسم کے آدمیوں سے ملک اور قوم کو کام لینا چاہیئے تھا۔ انگریز کمیٹی سے ہٹا دینے کے باوجود انھیں مانتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی حق گوئی کا انگریزوں پر اچھا اثر تھا۔ میر صاحب کے کھرے پن سے انگریزوں نے نقصان اٹھانا تو گوارا نہیں کیا لیکن میر صاحب کے کھرے پن کی انگریزوں نے قدر کی۔ وہ کوئی بات تنہا کہہ دیتے تھے تو انگریز اُسے قبول کر لیتے تھے اور دس دس خان بہادروں اور رائے بہادروں کے وفد جاتے تھے اور میر محمد حسین کی بات کے خلاف کہتے تھے تو انگریز اُسے قبول نہیں

---

[1] تجویز مسٹر آصف علی پیش کرنے والے تھے۔ انھیں اسی زمانے میں کراچی کا ایک بہت بڑا مقدمہ مل گیا۔ دوسرا کوئی ممبر یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا کہ پہلی دفعہ کلمۂ کفر زبان سے نکالے۔ بڑی حضرات چاہتے تھے کہ تجویز ضرور سامنے آجائے۔ لالہ ہریشچندر ایم۔ اے، ایڈوکیٹ نے (جو کانگریس کی مدد سے میونسپل کمیٹی کے سینیئر وایس پریسیڈنٹ بنے تھے) کہا کہ میں تجویز کی تائید کر دوں گا۔ مگر تجویز پیش نہیں کر سکتا۔ میں کمیٹی کا بالکل نیا ممبر دور کھڑا اب تماشے دیکھ رہا تھا کہ لالہ دیش بندھو کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔ اچھا تجویز داعدی صاحب پیش کریں گے (لالہ دیش بندھو خود اس وقت تک کمیٹی کے ممبر نہیں تھے) غرض اس طرح قرعہ میرے نام پڑ گیا۔

www.taemeernews.com

رہتے تھے۔

میر محمد حسین کے کیرکٹر کا ان چند مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میری مبری کی عمر سات آٹھ برس ہو چکی تھی۔ میونسپل کمیٹی کے مشہور چپراسی اللہ مہر ے مجھ سے کہا۔ "چیٹرجی صاحب کے نام سفارش کا خط دید یجیے۔" ریورنڈ چیٹرجی اب تو ہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، اُس وقت صوبہ دہلی اور مارواڑ کے ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ تھے اور اسی عہدہ کی بنا پر میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے۔ میں نے عذر کیا کہ میرے چیٹرجی سے راسم نہیں ہیں۔ تم کہو تو میر محمد حسین کو لکھے دیتا ہوں وہ سفارش کر دیں گے۔

میر محمد حسین میرے دوست تھے اور روز میرے پاس آکر گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھتے تھے۔ دوسرے دن حسب معمول تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ "واحدی صاحب! میں آپ کی بات نیچی نہیں کر سکتا، لیکن آپ مجھ سے کام لیا کیجیے تو اُسے ٹھونک بجا لیا کیجیے۔" ل میں چپراسی کے ساتھ خود چلا گیا تھا۔ مگر جب مسٹر چیٹرجی نے تفصیل سنائی، تو معلوم ہوا کہ معاملہ سفارش کے لائق نہیں تھا۔"

ایک دفعہ ایک صاحب الہ آباد سے میرے پاس آئے اور بولے۔ "آپ سے میرا تعارف نہیں ہے۔ لیکن کچھ توقع لے کر تکلیف دینے پہنچ گیا ہوں۔ میری لڑکی نے مسلم یونیورسٹی سے ایف۔ ایس۔ سی کیا ہے۔ اُسے لیڈی ہارڈنگ کالج میں داخل کرانا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسز آصف علی کی سفارش سے لڑکی داخل ہو سکتی ہے۔"

میں نے مسز آصف علی کی بجائے انھیں میر محمد حسین کے گھر کا پتہ بتا دیا اور کہا کہ نتیجہ

www.taemeernews.com

چڑھ کر پکار دیجیے گا۔ میر محمد حسین موٹے جھوٹے کپڑے پہنے، سامنے آکھڑے ہوں گے۔ اُن کی ظاہری حالت سے یہ نہ خیال کیجیے گا کہ ان کے بس کا کام نہیں ہے۔ کام کہیئے گا اور میرا حوالہ دیدیجیے گا۔ میر محمد حسین بھی مسز آصف علی کی طرح لیڈی ہارڈنگ کالج کی گورننگ باڈی میں ہیں:

میر محمد حسین میونسپل کمشنر نہ رہنے کے بعد بھی بہت سے اداروں کے ممبر، سکریٹری اور صدر رہے، اینگلو عربک ہائی اسکول انٹرمیجیٹ کالج اُن ہی کی سکریٹری شپ میں بنا تھا۔

خیر میر محمد حسین شیروانی بہن الہ آبادی صاحب کے ساتھ ہو لیے اور لڑکی کو داخل کرا آئے اور دوسرے دن میرا شکریہ ادا کیا کہ یہ کام آپ نے ٹھیک لیا ہے۔ ایسے کام لیا کیجیے۔

ایک مرتبہ میر محمد حسین نے مجھ سے فرمایا کہ فلاں لڑکا میرا عزیز ہے۔ اُسے میونسپل کمیٹی میں میٹر ریڈر کرا دو۔ میں نے میونسپل انجینیر سے کہہ دیا۔ مہینہ سوا مہینے کے بعد میر صاحب نے پوچھا۔ "آپ سے اُس لڑکے کی سفارش کرائی تھی۔ کیا نتیجہ رہا؟" میں نے کہا۔ "وہ نوکر ہو گیا۔" بولے۔ "اچھا۔ مگر تعجب ہے، اُس نے اطلاع نہیں دی۔" میں نے کہا۔ "اسی لئے میرا گمان ہے کہ نوکر ہو گیا۔ نوکر نہ ہوا ہوتا تو میرا اور آپ کا پیچھا نہ چھوڑتا۔" بولے۔ "اُسے ضرور آنا چاہیئے تھا۔" میں نے کہا۔ "نوجوان نہیں سوچا کرتے کہ دوبارہ کام پڑے گا۔" میر محمد حسین فوراً اُٹھے اور کوچہ چیلان سے قرول باغ

ین ساڑھے تین میل۔ لڑکے کے گھر پیدل گئے اور واپس آ کر کہا کہ • کہ ایک بات آپ ے مجھے اور یاد ہے۔ آپ نے کہا تھا۔ جسے نا آتا ہو اُسے اُس ہی کے کام میں کا تھوڑا سا ام بتا دو کہ بھائی! اتنا تو کرلا۔ باقی میں کردوں گا۔ پھر انشاءاللہ وہ نہیں پلٹے گا۔ وسری بات آپ نے آج سکھائی۔ میں دونوں باتیں گرہ میں باندھ لوں گا:

میر محمد حسین نے میری دو تین باتیں گرہ میں باندھی تھیں۔ میں نے خدا معلوم ن کی کتنی باتیں گرہ میں باندھ رکھی ہیں۔

ویسے تو میرے زمانہ کے ممبران میونسپل کمیٹی آجکل کے مقابلہ میں کُل کے کُل فرشتے تھے، لیکن میر محمد حسین کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ میر محمد حسین کی قسم کے لوگ اب عنقا یں۔ انھیں مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم۔ بھارت کے وزیر خوراک، سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ یا میر مشتاق احمد دلی کے موجودہ سوشلسٹ لیڈر میں میر محمد حسین جیسے آثار پائے لتے ہیں۔ میر مشتاق احمد صوبہ دلی کی اسمبلی کے ممبر ہیں اور میر محمد حسین کی طرح نہایت ادہ، مستعد اور خدمت گزار شخص ہیں۔ ہر کس و ناکس کے کام آنے والے۔

ایک مرتبہ میلاد کی محفلوں کا غیر معمولی زور بندھا۔ غربا تو یہ محفلیں کرتے ہی رہتے ہیں لیکن اُمرا، رؤسا اور خطاب یافتہ مسلمان بھی محفلیں کرنے لگے۔ اسلامی انجمنوں اور مسلم یونیورسٹی میں محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ اِس کا عوام پر بڑا اثر پڑا۔ انھوں نے گھروں اور مسجدوں سے لے کر سڑکوں تک میلاد کی محفلوں کو پھیلا دیا۔ میں نے میر محمد حسین سے پوچھا۔ "میر صاحب! لوگوں نے کیا دنیا جاتی دیکھ لی ہے؟" میر محمد حسین نے

www.taemeernews.com

فرمایا: انگریزوں کی عنایت ہے۔ مسلمان انگریزوں کی مخالفت میں ہندوؤں کے دوش بہ دوش آ چلے تھے۔ انگریزوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ اُدھر پھیر دی جدھر آسانی سے پھیری جا سکتی تھی۔ میں نے کہا............... میر صاحب! بات گلے نہیں اُترتی؛ بولے: "جناب! میں تو بلا تشبیہ "ہمہ از اوست" کا قائل ہوں۔ آجکل دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، انگریز کے اشارے سے ہوتا ہے۔ میری بات آج گلے نہیں اُترتی نہ اُترے۔ کل اُتر جائے گی۔"

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب انگریز ہی انگریز تھے۔ امریکہ برطانیہ پر نہیں چھایا تھا۔ اور روس نے مقابلہ کے لئے خم نہیں ٹھونکے تھے۔

میر محمد حسین انگریزی داں بھی تھے اور انگریز داں بھی۔

میر صاحب ۲۴ ۱۹ء کے بعد میونسپل کمیٹی کے ممبر پھر کبھی نہیں ہوئے، لیکن میں اُن سے کمیٹی کے معاملات میں مشورے برابر کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے تھے کہ ضمیر کا کہنا کرو۔ (Do The Right)۔ اُن جیسا ایماندار قومی کارکُن میری نظر سے نہیں گزرا۔

لالہ مدن موہن لال

سر شری رام اور سر شنکر لال کے والد اور مُرلی دھر شاد کے دادا۔ لالہ مدن موہن لال قدیم وضع کے ہندو تھے۔ مکتب اور پاٹھ شالے کے پڑھے ہوئے۔ انگریزی سے ضرورت کے لائق واقف۔

www.taemeernews.com

میں اپنے والد کے انتقال کے بعد تیرہ چودہ سال کی عمر میں اپنے ایک بوڑھے عزیز سید آغا میر کے ہمراہ حصّوں کا منافع لینے دلّی کلاتھ مل جایا کرتا تھا۔ اُس وقت لالہ مدن موہن لال دلّی کلاتھ مل کے مالک نہیں تھے، ملازم تھے اور غالباً منافع بانٹنے پر مامور تھے۔

ایک بڑا سا تخت تھا جس پر سفید بُراق چاندنی بچھی ہوتی تھی، اُس پر لالہ مدن موہن گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ میں پہنچتا تو بزرگانہ محبت سے پیش آتے۔ شربت پلاتے اور دال جی کھلاتے۔

لالہ مدن موہن لال میرے والد کے تو نہیں ہم عمر غالباً نہیں تھے لیکن میں اُن کے بڑے بیٹے سر شری رام سے دو چار برس چھوٹا ہوں۔

پھر اُنھوں نے دلّی کلاتھ مل کے اتنے حصے خرید لئے کہ مل کی ڈائرکٹری کے لئے کھڑے ہونے لگے۔ اس سلسلے میں ووٹ لینے میرے گھر بھی آتے تھے۔ میرا اُن کا تعلق نہیں ٹوٹا۔ یہاں تک کہ میں ۱۹۴۴ء میں میونسپل کمیٹی دلّی کا ممبر منتخب ہو کر اُن کے برابر جا بیٹھا۔ لالہ جی نہ جانے کب سے ممبر تھے۔ وہاں بھی اُن کا رویہ سرپرستانہ رہا۔

آج کا مقابلہ تو خیر کیا ہو سکتا ہے، اُس زمانہ میں انگریز کا انکس موجود تھا۔ لیکن کمیٹی کے دولتمند ممبر (ہندو بنیے اور مسلمان بنیے) اُس زمانے میں بھی سودے بازیاں کیا کرتے تھے اور دوسرے ممبروں کو دعوتیں کھلا کر یا ہندو مسلمان کا سوال

www.taemeernews.com

اُٹھا کر ہمنوا بنا لیتے تھے۔ میں یہ باتیں سمجھتا تھا اور بہ ملاان باتوں کی مخالفت کرتا تھا۔ سر شری رام اور سر شنکر لال بھی کمیٹی کے ممبر تھے۔ سر شری رام مجھ سے خفا کی رہتے تھے اور سر شنکر لال نے تو میرا نام شمشیر برہنہ رکھ دیا تھا مگر لالہ مدن موہن لال نے مطلق رویّہ نہیں بدلا۔ اُن کی تیوری پر بل نہیں آیا۔

لالہ مدن موہن لال اصل باشندے بازار سیتارام کے تھے۔ نئی دلّی میں کوٹھی تیار ہو گئی تو وہاں جا رہے تھے۔ لیکن بلا ناغہ علی الصباح دلّی آتے تھے اور ایڈورڈ پارک میں بیٹھتے تھے۔ کوٹھی سے چلتے تو موگرا کے پھول رومال میں باندھ لیتے اور جتنے دوست ایڈورڈ پارک میں جمع ہو جاتے اُنھیں وہ پھول بانٹ دیتے۔

میری اُن کی ملاقات صبح راستے میں ہو جاتی تھی۔ میں روز ٹہلنے نکلتا تھا۔ جب اُن کی موٹر میرے قریب سے گزرتی تو موٹر روک کر دو پھول مجھے بھی دیا کرتے تھے۔

رام کشور

رائے بہادر مسٹر رام کشور ال۔ ڈی کو بھی میں بارہ تیرہ برس کی عمر سے جانتا تھا۔ وہ اُس وقت سترہ اٹھارہ برس کے ہوں گے۔ جامع مسجد کے سامنے جہاں اب ایڈورڈ پارک ہے وہاں چٹیل میدان میں ایک کرکٹ کلب کھیلا کرتی تھی۔ رام کشور کلب کے ممبر تھے۔ میں اپنے عزیز خواجہ فضل احمد شفیق کے ساتھ

www.taemeernews.com

کھیل دیکھنے جاتا رہتا تھا۔ شیدا صاحب کھیلتے تھے یں دوڑ دوڑ کر دور پھینکی ہوئی گیند لاتا تھا۔ رام کشور نے وکالت پاس کرلی۔ رائے بہادر کا خطاب پایا۔ دلّی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ میں نے اُنھیں یاد رکھا۔ اُنھیں میں یاد نہیں رہا۔ میری اُن کی اکثر مواقع پر ملاقات ہوتی تھی۔ مگر میں جتاتا نہ تھا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے جتانا پڑا۔

جامع مسجد کی منتظمہ کمیٹی میں امام صاحب، شمس العلما مولوی سید احمد اور خان بہادر نواب ابوالحسن خاں کے درمیان کچھ اختلاف تھا، جسے سُلجھانے کے لئے مسٹر فصیح الدین احمد، سکریٹری ہارڈنگ لائبریری نے دونوں کو اپنے ہاں جمع کیا اور مجھ سے اور رائے بہادر رام کشور سے کہا کہ آپ آئیے اور مصالحت کرانے میں مدد دیجیے۔ رائے بہادر اس قسم کے ہندو تھے کہ جب صبح مندر جانے لگتے تھے تو ننگے پیر موٹر میں بیٹھتے تھے۔ جوتیاں پہن کر مندر نہیں جاتے تھے اور وکیل اتنے اونچے تھے کہ صرف بات کرنے کی فیس پانچ سو روپے لیتے تھے، لیکن اُنھوں نے جامع مسجد کے معاملے کے لئے اس قدر دل سوزی سے دو گھنٹے صرف کئے کہ میں حیران رہ گیا۔ نہ صرف دو گھنٹے مفت دیئے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ جامع مسجد کمیٹی کی ابتری اور دو مسلمانوں کی لڑائی سے بے چین ہیں۔ اسے میں نے سراہا اور باتوں باتوں میں کلب کا ذکر کر دیا۔ کلب کا ذکر سُن کر پھڑک اُٹھے اور نام بنام ساتھیوں کو پوچھنے لگے۔ ساتھی سب مسلمان تھے۔ ایک کھلاڑی کا نام خاص طور سے لیا میں نے

کہا۔ "پان چھالیہ کی چھوٹی سی دکان لئے بیٹھے ہیں اور تکلیف کی زندگی گزارتے ہیں"

بولے۔ "بھئی! اُن سے فرمایئے کبھی کبھی ملا کریں"

رام کشور، دلّی کی زینت اور سجاوٹ تھے۔

مولانا محمد اسحاق

میرے زمانے کے ایک قابل ذکر بزرگ مولانا محمد اسحاق ہیں۔ اُن کی پیدائش تو ریاست رامپور کی تھی۔ لیکن بیس سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حکیم مومن خاں مومن سے ملنے دلّی آئے تھے۔ والد واپس رامپور چلے گئے اور مولانا دِلّی ٹھیر گئے اور ایسے ٹھیرے کہ دلّی کے ہو گئے۔

کوچہ چیلان میں، گلی مومن خاں کی مسجد کے اندر قیام تھا۔ کسی نے کہا۔ "نواب شرف الدین آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ ناگوار خاطر نہ ہو تو ذرا تشریف لے چلئے" نواب شرف الدین کی حویلی گلی مومن خاں کے بالمقابل ہے۔ مولانا تشریف لائے۔ نواب صاحب اُس وقت کہیں باہر جارہے تھے۔ پھاٹک میں آچکے تھے۔ وہیں کھڑے ہو کر بات کرنے لگے۔ اور بات بھی اس طرح کہ کبھی مولانا سے مخاطب ہوتے تھے اور کبھی دوسروں سے۔ مولانا نے نواب صاحب کے سامنے ہی ساتھ لانے والے شخص سے کہا۔ "میاں کس کے پاس لے آئے۔ یہ تو آداب ملاقات سے بھی واقف نہیں ہیں" نواب صاحب علم دوست اور مردم شناس رئیس تھے۔ اُنھوں نے مولانا سے معذرت کی۔ باہر جانا ملتوی کر دیا۔ مولانا کو کمرہ میں بٹھایا اور مدارات کے بعد کہا۔ "میری

www.taemeernews.com

خواہش ہے کہ میرے بچوں کی تعلیم و تربیت آپ فرمائیں۔ ملاقات کا کمرہ حویلی کے پھاٹک پر تھا۔ اُس میں نواب صاحب نے نایاب قلمی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ کمرہ مولانا کو دیدیا گیا اور مولانا نواب صاحب کے بچوں کو پڑھانے لگے۔

نواب شرف الدین خاں سر سید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی تھے۔ جسٹس سید محمود کے خسر اور سر راس مسعود کے نانا۔ مسعود صاحب کی والدہ اور ماموؤں (نواب فخر الدین اور نواب مصلح الدین) نے تعلیم و تربیت مولانا محمد اسحاق سے پائی تھی۔

نواب شرف الدین کے والد نواب زین العابدین خاں اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں وزیر اعظم تھے۔ میرے مکان کے قریب ایک صدسالہ بوڑھا ہندو، سکھ مل، دودھ دہی بیچتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ نواب زین العابدین خاں کی حویلی کی رونق میں نے دیکھی ہے۔ ڈیوڑھی پر ہاتھی جھومتے تھے۔

مولانا محمد اسحاق نواب شرف الدین خاں کے بچوں کے علاوہ خاتم المحدثین سید میاں نذیر حسین کے مدرسہ میں بھی درس دیتے تھے۔

مولانا محمد اسحاق قریب نوے سال جئے۔ شادی نہیں کی۔ عمر بھر آزاد رہے۔ جس کمرے میں اوّل دن آکر بیٹھے تھے اور جس پلنگ پر اوّل رات سوئے تھے اُس کمرے سے ایسی حالت میں بھی نہ ہٹے کہ کمرہ کی آدھی چھت غائب ہو گئی تھی اور پلنگ تو مرتے مرتے اُن کے نیچے رہا۔

سر سید احمد خاں کے مذہبی خیالات مولانا پسند نہیں کرتے تھے۔ سر سید نے

www.taemeernews.com

بزاز: رڈلوایا کہ پانچ منٹ کے واسطے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دے دیجیے۔ مولانا نے اجازت نہیں دی۔

دِلّی کے پنجابی سوداگروں میں ایک صاحب تھے جن سے مولانا محمد اسحاق انس رکھتے تھے۔ اُن کی خاطر سے ۱۹۱۰ء میں تفسیر کبیر کا ترجمہ شروع کیا۔ ترجمہ ہوتا جاتا تھا اور چھپتا جاتا تھا۔ ڈھائی سو صفحے بڑی تقطیع کے تیار تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ سوداگر صاحب بہر حال سوداگر تھے، مولانا سے کہیں پوچھ بیٹھے کہ ترجمہ امیر صاحب کے نام معنوَن کر دیا جائے تو کیسا ہے۔ مولانا ترجمہ املا کرا رہے تھے۔ بولتے بولتے، ایک دم رُک گئے۔ جو فقرہ زبان پر تھا اُسے بھی پورا نہیں کیا۔ اَدھورا چھوڑ دیا۔ اور فرمایا:۔

"محمد اسحاق اور تفسیر کبیر دونوں کی تم نے بھلی قدر کی۔ میاں! اب یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا"

میں نے مولانا محمد اسحاق سے پڑھنے کی متعدد بار کوشش کی۔ کتاب لے لیکر مہینوں گیا۔ لیکن مجھے خاک نہ آیا۔ گھر پر پڑھنے والا غالباً کوئی شاگرد اُن سے فیضیاب نہیں ہوتا تھا۔ سوائے ایک صاحب کے جو میرے بعد مولانا محمد اسحاق کے پاس آئے۔ اُن کا نام مولانا محمد ایوب ہے۔ خیر مولانا محمد ایوب کا ذکر آگے کروں گا۔ یہاں تو مولانا محمد اسحاق ہی کا تذکرہ رہنا چاہیئے۔ مولانا محمد اسحاق کی رحلت سے آدھ گھنٹے پہلے مولانا محمد ایوب نے پوچھا۔ طبیعت تو نہیں گھبرا رہی۔ بولے۔ "اجی واہ: اِس سے آگے

www.taemeernews.com

زبان نے ساتھ نہ دیا۔" اجی واہ" کا مطلب یہ تھا کہ میں اور مرنے سے گھبراؤں گا۔

عجیب طبیعت کے اور حد درجہ مضبوط طبیعت کے انسان تھے۔

مولانا محمد اسحاق کے علم و فضل کے متعلق رائے لگانے کا میں اہل نہیں ہوں۔ البتہ یہ آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی ذکاء اللہ جیسے ریاضی داں اپنے بیٹے مسٹر عنایت اللہ (انجنیر) کو مولانا کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے کہ اس سوال کو مولانا حل کریں گے۔ اور مولانا کبھی منشی ذکاء اللہ کے گھر آجاتے تھے تو منشی ذکاء اللہ کھانا بھی کھاتے ہوتے تھے تو اُن کے استقبال کو نکل آتے تھے۔ اُن کے شاگرد مولانا محمد ایوب کی قابلیت سے اُن کی قابلیت کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ ریاضی میں منشی ذکاء اللہ لوہا مانتے تھے تو دینی علوم میں تو وہ واقعی بے مثال ہوں گے۔

دلّی کے ہر محلّے میں میر محلّہ ہوا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ و ۱۹۴۲ء کی جنگ کے موقع پر انگریز حکومت نے بھی بہت سے لوگوں کو میر محلّہ بنایا تھا، لیکن میں جن میر محلاؤں کا ذکر کر رہا ہوں اُنھیں محلّہ، میر محلّہ بناتا تھا۔ وہ خدمت گزاری اور کارکردگی کی وجہ سے یہ عزت پاتے تھے۔ محلوں میں اُن کے برابر علما و مشائخ اور لیڈروں کی نہیں چلتی تھی۔ حکومت کو اُن کی نظریں دیکھنی پڑتی تھیں۔

محلّہ سوئی والان میں ایک صاحب تھے۔ نام معلوم نہیں۔ ہمیشہ میر للّن[1] ہی سُنا۔ میر صاحب کے اشارے پر سارا محلّہ ایک ہو جاتا تھا۔ سوئی والان سے باہر اپنے

---

[1] میری بڑی بہو، بھتیجے واحدی کی بیوی میر للّن کی سگی پرنواسی ہیں۔

www.taemeernews.com

آس پاس کے دوسرے محلوں میں بھی اُن کا اثر تھا۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی کی جنگ چھڑی تو اُنھوں نے اُسے رو کنے کے لئے دن رات ایک کر دیا۔

حاجی انعام اللہ بیگ

ہمارے کوچہ چیلان اور فیض بازار کے میر محلہ حاجی انعام اللہ بیگ تھے۔ مگر خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی کے جھگڑے سے پہلے اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُن کی جگہ پھر کوئی نہ لے سکا۔

حاجی عبدالغفار

خیر اسی طرح ہر محلے میں میر محلہ ہوا کرتا تھا۔ مگر ایک صاحب میر محلہ نہیں میر شہر تھے۔ اُن کا نام حاجی عبدالغفار تھا، جو علی جان والے عبدالغفار کہلاتے تھے۔

حاجی صاحب کو پورا شہر مانتا تھا۔ علی جان والوں کی دیانت اور امانت ضرب المثل تھی۔ کسی کی دیانت اور امانت کی تعریف کرنی ہوتی تو کہا جاتا تھا۔ میاں! وہ تو گویا علی جان ہیں۔

علی جان والوں کا دلی اور مکہ معظمہ دو جگہ کاروبار تھا[1]۔ لوگ حج کرنے کو جانے لگتے تو روپیہ دلی کی کوٹھی علی جان میں دے دیتے اور مکہ معظمہ پہنچ کر وہاں کی دوکان علی جان سے لے لیتے۔ اس امداد حسنہ کے علاوہ شہر کے قضیئے جو میر محلاؤں سے نہیں سلجھتے تھے حاجی عبدالغفار کے سامنے لائے جاتے تھے اور حاجی صاحب چٹکیوں میں سلجھا دیتے تھے۔

---

[1] اب بھی ہے۔ دلی میں حاجی عبدالغفار کے صاحبزادے حاجی محمد صالح نے کاروبار کو سنبھال رکھا ہے۔

حاجی عبدالغفار کے ہاں کی شام کی نشست بھی مشہور ہے۔ نواب ضمیر مرزا۔ خواجہ عبدالمجید اور شیخ عبدالرزاق جیسے حضرات روزانہ تشریف لاتے تھے۔

شیخ عبدالرزاق

شیخ عبدالرزاق دہلی کی پنجابی سوداگر برادری کے ممتاز رکن تھے۔ اُن کے بیٹوں شیخ عبدالخالق۔ شیخ محمد شفیق اور شیخ محمد عبداللہ کی کراچی میں نہایت اونچی حیثیت ہے۔ خصوصًا عبدالخالق عبدالرزاق کو تو یہاں ہر شخص جانتا ہے۔

خواجہ عبدالمجید

خواجہ عبدالمجید دہلی کے رؤسا میں تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، سینٹ سٹیفنز کالج کے پروفیسر۔ ادیب الملک خواجہ محمد شفیع اُن ہی کے فرزند ہیں۔

نواب ضمیر مرزا

نواب ضمیر مرزا۔ نواب سرامیرالدین احمد فرخ مرزا، والی ریاست لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ پورے مولوی۔ مولویت نوابی پر غالب، لیکن مولویت پیشہ نہیں۔

بے اولاد تھے۔ ریاست لوہارو نے پچہتر روپے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ اسی میں میاں بیوی قناعت کی زندگی گزارتے تھے۔

لوہارو چھوٹی سی ریاست تھی۔ محض نواب سرامیرالدین کی وجہ سے اُس کا وقار بڑھ گیا تھا۔ ایک دفعہ ریاست کی مالی حالت اتنی بگڑی کہ نواب سرامیرالدین کی بہنوں کا وظیفہ تو بالکل بند کر دیا گیا اور بھائیوں کے پچیس پچیس روپے کم ہو گئے۔ بہنیں بھی چیخ پڑیں اور بھائی بھی بلبلا اُٹھے۔

نواب ضمیر مرزا کے چھوٹے بھانجے سید ابو تمیم فرید آبادی کا بیان ہے کہ

www.taemeernews.com

"منجھلے ماموں جان نے خود مجھ سے دُکھ بھری آواز میں فرمایا۔ بیٹیا دیکھا آپ نے غضب کیا بیٹھے بٹھائے قہر ٹوٹتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نواب رام پور تین سو روپے ماہوار دیتے ہیں۔ مکان مفت کا ہے۔ گھوڑا گاڑی بھی ملی ہوئی ہے۔ خادم سرکاری ہے۔ گھوڑا گاڑی اور خادم کا خرچ میرے ذمّے نہیں، مگر بیٹیا پچیس تو پچیس ہی ہوتے ہیں۔ یوں اللہ کا شکر ہے بیوی بچّے خودکار مختار اور آسودہ ہیں۔ مجھ پر کسی کا بار نہیں۔ ایک ریاست سے سّتر روپے اور ایک ریاست سے اسّی پنشن کے اور آجاتے ہیں، مگر بیٹیا پچیس بھی کیوں گھٹیں۔ آمدنی گھٹتی جاتی ہے اور خرچ بڑھتے جاتے ہیں"۔

یہ تقریر سننے کے بعد ابو تمیم صاحب رام پور سے دلّی تشریف لائے اور چھوٹے ماموں جان، نواب ضمیر مرزا کی خدمت میں پہنچے۔ اُن کا خیال تھا کہ منجھلے ماموں جان چھ سو روپے وصول کر کے پچیس روپوں کے لئے اتنے غم زدہ ہیں تو چھوٹے ماموں جان کی تو کُل کائنات ایک سو پانچ روپے ماہانہ تھی۔ پچیس روپوں کی کمی کا اُنھیں کہیں زیادہ ملال ہوگا۔ خیر ابو تمیم صاحب فرماتے ہیں:۔

"میں سوگوار صورت بنا کر اور تعزیت ادا کرنے کے طرز میں بیٹھ گیا اور فرضی آہ بھر کر بولا۔ اِس ضعیفی میں کیا سخت وقت پڑا ہے کہ تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

چھوٹے ماموں جان نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔ بیٹا! خیر تو ہے۔ کیسا

www.taemeernews.com

سخت وقت۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ جی ریاست نے جو کُلہاڑا چلایا ہے۔ تمام خاندان بلبلا رہا ہے۔ اور آپ کا تو......"

بات کاٹی اور نرمی سے کہا۔ مجھے تو اللہ کا شکر ہے کوئی تکلیف نہیں پچیس روپے کی کمی کا علاج: بیٹا! ہم نے تو یہ کیا کہ ڈیوڑھی کے دو نوکروں میں سے ایک کم کر دیا۔ اُسے ہم پچیس ہی دیتے تھے۔ ویسے ہماری آمدنی اور ہمارا خرچ جوں کا توں رہا۔ اللہ کا احسان ہے اب بھی تمھاری ماتی یہی پوچھتی ہیں کہ کیا کھاؤ گے' یہ نہیں کہتیں کہ کہاں سے کھاؤ گے۔ نہیں بیٹا! اللہ تعالیٰ کا فضل برقرار ہے:

نواب منیر مرزا عجیب طبیعت کے نواب زادے تھے۔ نواب سر امیر الدین کی بجائے کہیں لوہارو کی ریاست انھیں مل جاتی تو شاید حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سی حکومت کرتے۔

لوہارو والوں کا سارا خاندان مستقل طور سے دلّی (گلی قاسم جان) میں رہتا تھا اور دلّی کے اعلیٰ ترین خاندانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

گلی قاسم جان کے ذکر پر محمد خضر تحصیلدار یاد آ گئے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ بڑے عابد زاہد۔ اللہ نے دنیا بھی دی تھی اور دین بھی دیا تھا۔ گلی قاسم جان ہی میں رہتے تھے۔ ان کے ایک بھائی تھے جن کی نواسی رؤف علی بیرسٹر سے بیاہی گئی تھیں۔ نام یاد نہیں رہا۔ وہ بھی وضعدار انسان تھے۔ ہمیشہ خاص لباس اور اجمیری دروازے کے موچیوں کے ہاتھ کی جوتی پہنے

www.taemeernews.com

دیکھا۔ جوتی کو ایڑی کی طرف سے بٹھا لیتے تھے اور سلیپر جیسا بنا لیتے تھے۔

میں زیادہ تر پُرانے دِلّی والوں کے حالات لکھ رہا ہوں۔ اب تک دو ایک ہی شخص ایسے آئے ہیں جن کے والدین دِلّی کے نہیں تھے۔ ورنہ عموماً سب پشت ہا پشت کے دلّی والے ہیں۔ لیکن میری کتاب کا نام "میرے زمانے کی دلّی" ہے۔ یعنی میں نے اپنے زمانہ کی دلّی میں کس کس کو دیکھا اور کیا کیا دیکھا۔ لہٰذا اس کتاب میں اُن کا ذکر قطعی کرسکتا ہوں، جنھوں نے میرے زمانہ میں دِلّی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور جنھیں دِلّی میں رہتے ایک عرصہ گذر گیا تھا۔ مثلاً حکیم نابینا اور اُن کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر انصاری۔ ان دونوں کا وطن ثانی دلّی ہے۔ آج بھی اِن دونوں کی اولادیں دِلّی میں ہیں۔ اور کیا کیا دیکھا۔ میں تو بڑی گنجائش ہے۔ دلّی سے باہر میں نے کیا کیا دیکھا، وہ اس کتاب میں نہیں لکھا جاسکتا۔ لیکن دِلّی کے اندر جو کچھ دیکھا وہ اس کتاب میں لکھا جاسکتا ہے۔ خیر اب میں حکیم نابینا کا تذکرہ لکھتا ہوں۔

حکیم صاحب دِلّی میں حیدر آباد دکن سے تشریف لائے تھے۔ وہ باشندے بہار اور یوپی کی سرحد کے تھے۔ مگر اُن کی زندگی کا طویل حصّہ ریاست حیدر آباد میں گزرا تھا۔ حیدر آباد کی زندگی سے حکیم صاحب کی میں واقف نہیں، لیکن دِلّی میں میں نے اُنھیں خاصا قریب سے دیکھا۔

حکیم صاحب کا نام عبدالوہاب انصاری تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے

ب سے بڑے بھائی تھے۔ ڈاکٹر انصاری کو تعلیم اُنہی نے دلوائی تھی اور اُن ہی
ج سے نواب محبوب علی خاں، نظام دکن نے ڈاکٹر انصاری کو یورپ کی تعلیم
خرچ دیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری حکیم صاحب کو بھائی نہیں، باپ سمجھتے تھے۔

حکیم صاحب جب دلّی تشریف لائے ہیں اُس وقت میرا ایک لڑکا سخت بیمار
۔ اُس کے بچنے کی اُمید نہیں رہی تھی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے فرمایا حکیم نابینا آ
یا مطب کریں گے۔ لڑکے کو انھیں دکھاؤ۔ خواجہ صاحب کے اور حکیم صاحب کے
ے سے تعلقات تھے۔ میں لڑکے کو لے کر خواجہ صاحب کے ساتھ حکیم صاحب کی
مت میں حاضر ہوا۔

حکیم صاحب مریضوں کی نبضیں دیکھتے جاتے تھے اور خواجہ صاحب سے باتیں
تے جاتے تھے۔ مریضوں میں مولانا سید ظہور احمد وحشی بھی تھے۔ خواجہ صاحب نے وحشی
احب کا تعارف کرایا۔ حکیم صاحب اُن کی نبض پر اُنگلی رکھ کر بھی خواجہ صاحب سے
یں کرتے رہے۔

میں حیران تھا کہ حکیم صاحب مرض کیسے سمجھیں گے۔ مو صیان توباتوں کی طرف
ہے۔ حکیم صاحب نے وحشی صاحب کی دوسری نبض پر ہاتھ رکھا تو وحشی صاحب کی ریسٹ
پر اُنگلیوں سے ذرا سر کائی اور پھر وحشی صاحب کا حال کہنا شروع کر دیا۔ یہاں تک
اُن کا رنگ تک بتا دیا کہ رنگ سیاہ پڑ گیا ہے۔ حال پوچھا نہیں، سب کچھ اُنگلیوں
ے دیکھ لیا۔ حکیم نابینا کی اُنگلیوں میں آنکھیں تھیں۔

www.taemeernews.com

وحشی صاحب کے بعد حکیم صاحب نے میرے لڑکے کا معائنہ فرمایا اور کھا کے لئے دوا عنایت کی۔ دوا کا اثر کیا بتاؤں۔ لڑکا چوبیس گھنٹے میں آدھ پاؤ دودھ نہیں پی رہا تھا۔ دوا استعمال کرتے ہی پہلے دن اُس نے آدھ سیر دودھ پیا اور تین چار دن بعد ڈیڑھ سیر دودھ روزانہ پینے لگا اور اچھا ہونے لگا۔

حکیم صاحب کی نباضی کا یہ حال تھا کہ سوتے آدمی کو جگانا ہوتا تو نبض سے پہچان لیتے تھے کہ کسے جگانا ہے۔ جس مریض کو مہینوں پہلے دیکھا ہوتا اُس کی صرف نبض پر اُنگلی رکھ کر کہہ دیتے کہ آپ فلاں صاحب ہیں۔

نابینا عموماً ذہین و طباع ہوتے ہیں اور اُن کا حافظہ آنکھوں والوں سے ہمیشہ فائق ہوتا ہے لیکن حکیم نابینا کے حافظہ اور ذہانت و طباعی کو کوئی دوسرا نابینا بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

حکیم صاحب پیدائشی نابینا تھے۔ نابینائی میں اُنھوں نے عربی، فارسی پڑھی اور علوم دین کی تکمیل کی۔ اور نابینائی میں فن طب سیکھا۔ حافظ قرآن تھے تصوف سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ تصوف کی کتابوں پر عبور رکھتا ـــ ایک نعمت سے محروم کر کے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں بے شمار نعمتیں دیدی تھیں۔ تادمِ آخر تندرست رہے۔ عمر طبعی پائی۔ پوری عمر آسائش سے بسر کی۔ روپیہ اُن کے پاس آتا نہیں تھا اُن پر برستا تھا۔

شہر میں مریضوں کے گھر نہیں جاتے تھے اور کہیں گئے بھی تو فیس کا قصہ نہیں

www.taemeernews.com

ما شہر سے باہر کی فیس ایک ہزار روپے روزانہ لیتے تھے۔ دس دن آنے جانے
تمام میں صرف ہوئے، دس ہزار روپے مل گئے۔

یہ تو حکیم نابینا کی دنیا تھی۔ دین کا یہ رنگ تھا کہ دنیا کا کوئی عمل دین کے خلاف
تھا۔ جتنا وقت مطب سے بچتا وہ اللہ اللہ کرنے میں کٹتا تھا۔ عبادت گذاری اور
بزرگوں پر حاضری کے سوا اور کسی چیز سے رغبت نہیں تھی، صوفی ہونے کے باوجود
ہابیت کا غلبہ تھا۔ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔

دلّی میونسپل کمیٹی نے تجویز پاس کی کہ ڈاکٹر انصاری کا بُت نصب کیا جائے۔
نے کہا کہ حکیم نابینا سے بھی پوچھ لیا ہے۔ وہ یہ تجویز غالباً پسند نہیں کریں گے۔
ی یادگار قایم کرنے سے کیا فائدہ جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بڑے بھائی اور
پ کو تکلیف دے۔ طے پایا کہ لالہ دیش بندھو میرے ہمراہ جاکر حکیم صاحب سے
یں گے۔ چنانچہ ہم دونوں کمیٹی کا جلسہ ختم ہوتے ہی حکیم صاحب کے ہاں پہنچے۔
یش بندھو نے حکیم صاحب کو شیشے میں اُتارنے کی بڑی کوشش کی، مگر وہ
و میں نہیں آئے اور فرمایا۔ "تم بُت بنوالو۔ میں اُسے توڑ دوں گا۔"

حکیم نابینا کا چراغ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی موجودگی میں جلتا تھا۔
ہوں نے نہ جانے کتنے علاج معرکے کے کئے۔ جن میں لالہ لاجپت رائے اور علامہ
قبال کے علاج کا تو سارے ملک میں چرچا ہو گیا تھا۔

لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر انصاری کے زیر علاج تھے۔ مرض کسی طرح قابو میں

www.taemeernews.com

نہ آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حکیم صاحب کو دکھایا۔ حکیم صاحب کے علاج سے لالہ جی صحتیاب ہو گئے۔

علامہ اقبال کے گردہ میں یا مثانہ میں پتھری تھی۔ سر سکندر حیات نے جو ان دنوں پنجاب کے قائم مقام گورنر تھے، علامہ اقبال کو پنجاب کے سب سے بڑے انگریز سرجن کے نام خط لکھ کر دیا اور کہا کہ یہ سرجن آجکل سرینگر (کشمیر) میں ہے وہاں جائیے اور آپریشن کرائیے۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ اپریشن کے بغیر تکلیف نہیں جائے گی۔

علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو خط بھیجا تو اس میں اِس کا ذکر بھی کر دیا کہ سرینگر جا رہا ہوں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ ذرا حکیم نابینا کو دکھاتے جائیے۔ علامہ اقبال اپریشن سے گھبراتے تھے۔ سہارا ملا تو فوراً دلی آ گئے۔ ناقابل بیان تکلیف تھی۔ خواجہ صاحب نے انھیں ریلوے اسٹیشن کے قریب کے ہوٹل میں ٹھیرایا اور حکیم نابینا کو لے جا کر دکھایا۔ دوا کی پہلی خوراک سے علامہ اقبال کی تکلیف میں کمی ہو گئی اور دس دن کے اندر تکلیف بالکل جاتی رہی۔ افسوس میں دوا کا نام بھول گیا۔ مفرد تھی، جس سے حکیم صاحب نے بفضلہ تعالیٰ پتھری گھلا کر نکال دی تھی۔

دس دن بعد حکیم صاحب نے علامہ اقبال سے کہا۔ "اب آپ لاہور تشریف لیجائیے۔ ڈیڑھ دو مہینے علامہ اقبال حکیم صاحب کی دوائیں اور استعمال کرتے رہے۔ دوائیں میں حکیم صاحب سے لے کر لاہور روانہ کیا کرتا تھا۔ وہ دوائیں مرکب ہوتی

www.taemeernews.com

ہوتی تھیں۔ علامہ اقبال کو پتھری کی تکلیف سے دوبارہ سابقہ نہیں پڑا۔

حکیم نابینا کا طریقۂ علاج بھی عام اطبا سے مختلف تھا اور وہ پرہیز بھی عجیب قسم کے کراتے تھے۔ کوئی نسخہ ایسا نہیں لکھتے تھے جو عطار سے بندھوانا پڑے۔ تمام دوائیں اپنے پاس سے دیتے تھے۔ مرکبات بھی اور مفردات بھی۔ مفردات اصلی شکل میں نہیں دیتے تھے۔ پرہیز اُن کے ہاں دن کے گیارہ بجے سے شروع ہوتا تھا۔ گیارہ سے پہلے ورمِ جگر کے مریض کو پراٹھے اور مرغن قورمہ کھانے کی اجازت تھی۔ حالانکہ دوسرے اطبا ورمِ جگر میں چکنائی کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ گیارہ بجے کے بعد چاول اور مٹھاس، حتیٰ کہ میٹھا پھل بھی کھانے کی ممانعت تھی۔

حکیم نابینا خود گیارہ بجے کے بعد نمکین غذا بھی نہیں کھاتے تھے۔ اُن کا دسترخوان چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت صبح مطب شروع کرنے سے پہلے بچھتا تھا۔

حکیم نابینا اُمرا سے دواؤں کی قیمت بھر مُٹھی لیتے تھے اور غُربا کو دوائیں مفت دیتے تھے۔ ایک دفعہ نواب میر محبوب علی خاں نظام دکن کے لئے اُنھوں نے کوئی دوا تجویز کی اور کہا کہ اِس کی میں ایک لاکھ گولیاں بناؤں گا۔ باربار بنانا مشکل ہے۔ آپ کے طفیل غُربا کے کام آجائیں گی۔ ایک لاکھ گولیوں کی لاگت ایک لاکھ روپے تھی۔ نظام نے ایک لاکھ روپے دے دیئے۔ اِن گولیوں کا ذخیرہ میں نے دیکھا تھا اور حکیم صاحب کی زبانی یہ واقعہ سُنا تھا۔

www.taemeernews.com

حکیم صاحب نبض دیکھتے دیکھتے اور باتیں کرتے کرتے سمجھ لیتے تھے کہ مریض غریب ہے یا امیر۔ اور امیر ہے تو کس درجہ کا ہے۔ امیر سے اُس کی حیثیت کے مطابق قیمت وصول کرتے تھے۔

نواب بُدّھن

حکیم نابینا کے تذکرہ کے بعد نواب بُدّھن کا تذکرہ ناموزوں نہ ہوگا۔ نواب بُدّھن کا پورا نام غلام نصیر الدین تھا۔ بُدّھن عرف ہے۔ نواب صاحب شیخ پورہ، برناوہ ضلع میرٹھ کے جاگیردار تھے مگر اپنے والد کے زمانہ سے زیادہ تر دلی میں رہتے تھے۔ محلہ حویلی اعظم خاں کی بغل میں اُن کی محل سرا تھی اور محل سرا کا مردانہ حصہ نواب بُدّھن کا کمرہ کہلاتا تھا۔ نواب بُدّھن اُس شان کے رئیس تھے جو تواضع و مدارات کی افراط سے تباہ ہو جاتے ہیں۔

میں نے نواب بُدّھن کی خوش حالی کا دور نہیں دیکھا۔ لیکن میرے سامنے بھی اُن کی یہ حالت تھی کہ برتن بیچ بیچ کر مہمانداریاں کرتے تھے۔

دورِ خوش حالی کے قصے سُنے ہیں۔ نواب صاحب اپنے استعمال کی چیزیں دوسروں کو استعمال نہیں کرنے دیتے تھے۔ اُن کے پاخانے کے لوٹے سے کوئی شخص وضو نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن زرِ کثیر خرچ کر کے اُنھوں نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مثلاً نواب صاحب حُقّہ پیتے تھے۔ تو جس حیثیت کا اُن کا حُقّہ تھا اُسی حیثیت کے اُنھوں نے سَو حُقّے بنوا رکھے تھے تاکہ اُن کی

www.taemeernews.com

مجلس میں بہ یک وقت سو خوشے پینے والے آ جائیں تو نواب صاحب کا حقہ نواب صاحب کے سامنے رہے اور سو حقے سو آدمیوں کے سامنے الگ الگ رکھ دیئے جائیں۔

نواب بڈھن ایک دفعہ سلطان المشایخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ سے فاتحہ پڑھ کر ہاتھی کے اوپر سوار دلی آ رہے تھے۔ راستے میں ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا دکھائی دیا۔ لڑکا بھولا بھولا اور شریف صورت تھا۔ شریف کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ نواب صاحب نے ہاتھی رکوا کر اس سے پوچھا۔ "میاں! آپ کون ہیں؟" اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ "میں صاحبزادہ ہوں" درگاہوں کے متوسلین کو صاحبزادہ کہا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے فرمایا۔ آیئے۔ ہمارے ساتھ بیٹھ جایئے۔ ہم آپ کو دلی پہنچا دیں۔

لڑکے کے پیر خاک آلود تھے۔ نواب صاحب نے خاک رومال سے نہیں ہاتھوں سے صاف کی اور ہاتھ چہرہ اور ڈاڑھی پر مل لئے، اور محل سرا پہنچ کر لڑکے سے کہا، صاحبزادہ صاحب! ہاتھی آپ کی نذر ہے۔ مہاوت کو حکم دیا کہ صاحبزادہ صاحب جہاں جہاں جائیں وہاں لے جاؤ اور پھر انہیں مع ہاتھی کے درگاہ شریف چھوڑ آؤ۔

یہ صاحبزادہ صاحب آپ جانتے ہیں کون تھے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی۔

پھر خواجہ صاحب سے نواب صاحب کا مدت العمر تعلق رہا۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد خواجہ صاحب نے انہیں اس چبوترہ پر جگہ دی جہاں اب سر آصف علی

www.taemeernews.com

بھی مدفون ہیں۔

خواجہ صاحب جوان اور ہوشیار ہو گئے تو نواب صاحب کی محل سرا اُن کی تحویل میں رہنے لگی۔ نواب صاحب شیخ پورہ بزنادہ جاتے تھے تو محل سرا خواجہ صاحب کے سپرد کر جاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اور میں نے جب نظام المشائخ جاری کیا ہے تو چھ مہینے نظام المشائخ کا دفتر نواب بدھن کے کمرہ ہی میں رہا تھا۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے دسمبر ۱۹۰۹ء تک۔

ایک دفعہ بعض خانگی وجوہ سے نواب صاحب نے فرضی طور پر محل سرا خواجہ صاحب کے نام بیع کر دی تھی۔ جب وہ وجہیں ختم ہو گئیں تو خواجہ صاحب نے محل سرا کو نواب صاحب کے نام کر دیا۔ اس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ نواب صاحب کو خواجہ صاحب پر بڑا اعتماد تھا وہیں خواجہ صاحب کے کیرکٹر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خواجہ صاحب کے افلاس کے زمانہ کی باتیں ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کی نیت افلاس کے زمانہ میں نہیں ڈگمگائی۔

سر سید احمد خاں۔ مولانا حالی۔ مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ کا بحیثیت ادیب اور مصنف پیچھے ذکر آ چکا ہے۔ دلی کے یہ چاروں حضرات میرے لڑکپن اور نوجوانی میں مسلمانوں کے آل انڈیا لیڈر بھی تھے۔ مسلمانوں کو انگریزی پڑھوانے اور حالات زمانہ کے مطابق چلانے کا بیڑا سر سید احمد خاں نے اُٹھایا تھا۔ باقی چاروں

www.taemeernews.com

حضرات اس تحریک کے خاص حامی تھے۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک سے پہلے کے حامی۔

دلی کے ایک اور بڑے شخص بھی سرسید احمد خاں کے ساتھ تھے۔ نواب سمیع اللہ خاں، سی۔ ایم۔ جی، حمید اللہ خاں سربلند جنگ کے والد، جن کی حویلی "حمید منزل" ڈاک خانہ دریا گنج سے متصل تھی۔ حمید اللہ خاں کے فرزند حلیم اللہ خاں (حلیم جنگ) غالباً اب نئی دلی میں ہیں۔ حمید منزل انھوں نے فروخت کردی اور سُنا ہے حمید منزل کی جگہ سنیما کھڑا ہو گیا ہے۔

سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقا سے زیادہ بااثر ہندوستان میں کوئی اور مسلمان نہیں تھا۔ لیکن سرسید احمد خاں۔ مولانا حالی۔ مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ کا دلی میں زیادہ اثر نہیں تھا۔ لوکل لیڈر دلی کے میں نے سب سے پہلے یہ دیکھے۔ مرزا سلیمان جاہ۔ مرزا ثریا جاہ۔ ڈپٹی الٰہی بخش۔ ڈپٹی ہادی حسین خاں۔ نواب سلطان مرزا۔ حکیم عبد المجید خاں۔ رائے بہادر لالہ سری کرشن داس گُڑ والے اور رائے بہادر لالہ رام کشن داس چھنا مل والے۔

مرزا سلیمان جاہ اور مرزا ثریا جاہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ مرزا الٰہی بخش (آخری مغل بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کے سمدھی) کے بیٹے۔

انگریزوں نے بہادر شاہ کو رنگون بھیج کر مرزا الٰہی بخش کا بیس ہزار روپے

غ

www.taemeernews.com

ماہوار وظیفہ مقرر کیا تھا۔ مرزا الٰہی بخش مر گئے تو وظیفہ آدھا رہ گیا۔ مرزا سلیمان جاہ اور مرزا ثریا جاہ کو پانچ پانچ ہزار روپے ملنے لگے۔ پھر وظیفہ اور گھٹا۔ مرزا ثریا جاہ کے نواسے اور جانشین پرنس خیر الدین خورشید جاہ ۱۹۴۶ء میں سترہ سو یا اٹھارہ سو روپے ماہوار پاتے تھے۔ مرزا سلیمان جاہ کی نسل میں اتنا بھی کسی کو نہیں دیا گیا۔ یہ اللہ کی شان ہے کہ مرزا الٰہی بخش کی وفاداریٔ برطانیہ کا صلہ حکومت برطانیہ کے ہاتھوں مرزا الٰہی بخش کی نسل سے نکل کر اُسے پہنچ گیا جس کے پردادا نے ۱۸۵۷ء میں بجرم بغاوت برطانیہ پھانسی پائی تھی۔ پرنس خیر الدین مرزا ثریا جاہ کے پوتے نہیں ہیں، نواسے ہیں۔ پرنس خیر الدین کے پردادا شاہزادہ عزیز الدین تھے۔ اُنھیں پھانسی ہوئی تھی۔

الٰہی بخش اور ہادی حسین خاں

ڈپٹی الٰہی بخش اور ڈپٹی ہادی حسین خاں دونوں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ڈپٹی کلکٹری اُس زمانہ میں ہندوستانیوں کے لئے اہم عہدہ تھا۔ ڈپٹی الٰہی بخش کے بیٹے محمد رفیق ہائی کورٹ کی ججی تک پہنچے۔

نواب سلطان مرزا

نواب سلطان مرزا، نواب میر فضل علی خاں (وزیر اودھ) کے نواسے تھے۔ اجمیری دروازہ کا مدرسہ جو بعد میں اینگلو عربک ہائی اسکول اور اینگلو عربک کالج بنا اور اب دلّی کالج کہلاتا ہے نواب میر فضل علی خاں نے پونے دو لاکھ روپے دے کر جاری کرایا تھا۔

میر فضل علی خاں میرے ہم خاندان تھے۔ یعنی فوجدار خانی۔ لکھنؤ کی

www.taemeernews.com

وزارت نے اُنھیں شیعیت کی طرف مایل کر دیا تھا۔ اُن کی اولاد سب شیعہ ہے۔ لیکن یہ شیعہ اپنے سُنّی عزیزوں سے بے تعلق نہیں ہوئے۔

حکیم عبدالمجید خاں حکیم محمود خاں کے بڑے بیٹے اور حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی تھے اب شہر پر نمبر ایک کا اثر اِن کا تھا۔ یہ دِلّی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ انگریزوں سے حکیم عبدالمجید خاں کا خلا ملا نہیں تھا۔ مگر انگریز جانتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

اُس زمانہ میں انگریزوں سے اختلاف کھیل نہیں تھا۔ لیکن حکیم صاحب انگریزوں سے ٹکرا جاتے تھے اور پھر حکیم صاحب ہی کی چلتی تھی، انگریزوں کی نہیں چلتی تھی۔ حکیم صاحب کا ہندو مسلمان پبلک پر غیر معمولی اثر تھا۔ حکیم صاحب ہندو مسلمان لیڈروں کے لیڈر تھے۔

حکیم عبدالمجید خاں کے سامنے ایک دفعہ دلّی میں طاعون پھیلا۔ انگریزوں نے حکم دیا جسے طاعون ہو وہ شہر سے باہر کیمپ میں منتقل ہو جائے۔ حکیم صاحب نے فرمایا باہر کوئی نہیں جائے گا۔ میں علاج کا شہر کے اندر ہی بندوبست کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے جس طرح ۱۹۱۸ء میں حکیم اجمل خاں نے وبائی انفلوئنزا کے علاج کے لئے طبیبوں کا جال بچھا دیا تھا اُسی طرح حکیم عبدالمجید خاں نے طاعون کا علاج اپنے مدرسہ طبیہ کے طالب علموں سے کرایا اور جس طرح انفلوئنزا میں یونانی علاج کامیاب رہا تھا اُسی طرح طاعون میں کامیاب رہا اور انگریز

www.taemeernews.com

حکام مُنہ دیکھتے رہ گئے۔

رام کشن داس چھنا مل والے کا خاندان دولت کے اعتبار سے ممتاز تھا اور سری کرشن داس گڑ والے کا خاندان قدامت کے اعتبار سے۔ مسلمانوں میں بھی کوئی اتنا پرانا امیر خاندان باقی نہیں تھا۔ اس خاندان میں امارت شاہجہاں کے وقت سے ۱۹۱۱ء تک مسلسل رہی۔ سری کرشن داس دِلّی کے واحد رئیس تھے جنھیں انگریزوں نے چوکڑی (چار گھوڑوں کی بگھی) میں نکلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں اُن سے ایک لغزش ہو گئی۔ اس نے اُنھیں اور ان کے خاندان کو ختم کر دیا۔

رام کشن داس اور سری کرشن داس

۱۹۱۱ء کے دربار میں سری کرشن داس نے ملک بھر کی منتخب گانے والیوں کو جمع کیا تھا تاکہ دربار کے آنے والوں کو گانا سنوا کر روپیہ کمائیں۔ اب تو کوئی اونچا خاندان ایسا ہے جس کا ایک نہ ایک لڑکا یا جس کی ایک نہ ایک لڑکی فلم انڈسٹری سے منسلک نہ ہو، لیکن ۱۹۱۱ء تک "قدریں" بدلی نہیں تھیں۔ بلکہ "قدروں" کے لفظ کا اُردو میں اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۱۱ء کے ہندو مسلمان اہالیانِ دہلی نے سری کرشن داس کو نظروں سے گرا دیا اور خلقت کی نظروں سے گرتے ہی خالق کے ہاں اُن کا نام دولتمندوں کی فہرست سے کٹ گیا اور آپ جانتے ہیں لیڈری اور دولتمندی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یا پھر سرسید احمد خاں یا گاندھی جی جیسا دماغ ہونا چاہیے۔ سری کرشن داس نے دولت کی غرض میں دولت بھی کھو دی

www.taemeernews.com

اور عزت بھی کھو دی ؎

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

ہیم اُن کے بیٹے لالہ ست نرائن گڑوالے نے اپنے آپ کو آج بھی خاصا سنبھال رکھا ہے۔

رام کشن داس کا خاندان اگرچہ نودولتا تھا لیکن چھنّا مل اور اُن کے بیٹوں پوتوں کے بہت سے ایسے حالات مجھے معلوم ہیں جن کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ لوگ باعتبار نسل ہمیشہ کے شریف تھے۔ اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ اس خاندان کی ذات کا شرف ایک قصہ سن لیجیے۔

۱۸۵۷ء میں جب ہنگامہ برپا ہوا ہے اُس وقت دلی کے کوتوال سوتی حیت کے کوئی صاحب تھے۔ میر فیض الحسن اُن کا نام تھا۔ چھنّا مل آٹے دال کے معمولی دکاندار تھے جن کی دکان کوتوالی کے قریب اُس جگہ تھی جہاں اب ڈاکٹر ہیم چندر سین بینا کا دوا خانہ ہے۔ چھنّا مل کی دکان سے میر صاحب کے ہاں سودا آیا کرتا تھا۔ ہنگامے کے بعد مسلمانوں کی جائدادیں نیلام ہونے لگیں تو وہ کسی نہ کسی کے نام تو ہوتیں۔ میر صاحب نے زیادہ سے زیادہ جائدادیں چھنّا مل کو دلوا دیں۔ جائدادیں کوڑیوں کے مول نیلام کی گئی تھیں، چھنّا مل مالا مال ہو گئے۔ اِس کا اُنھوں نے گُن مانا۔

میر فیض الحسن مر گئے اور اُن کے خاندان کا اُتار ہوا اور چھنّا مل کے

www.taemeernews.com

خاندان کا چڑھاوا۔ مگر چھُنّامل کے بیٹے رائے بہادر رام کشن داس اور پوتے رائے بہادر شیو پرشاد، سی۔ آئی۔ ای میر صاحب کے خاندان سے برابر ملتے رہے۔ اور کس طرح ملتے رہے۔ میر صاحب کے ہاں کی تقریبات کے لئے چھُنّامل رقمیں مقرر کر گئے تھے۔ شیو پرشاد جی کے زمانے تک رقم جاتے میں نے دیکھی ہے۔ میر فیض الحسن کے پوتے میر سراج الحسن میرے خاندان میں بیاہے تھے۔

میر صاحب کے خاندان میں بچہ پیدا ہوتا تھا تو سوئی پت سے اطلاع آتی تھی اور چھُنّامل والوں کی کوٹھی سے پیدائش پر بھی رقم جاتی تھی اور رقم کے ساتھ کوٹھی کی طرف سے بچے کا نام بھیجا جاتا تھا۔ ایک نام ماں باپ رکھتے تھے، ایک نام چھنّامل والے رکھتے تھے۔ میر فیض الحسن کے بڑے پوتے میر سراج الحسن کا چھُنّامَلی نام موتی تھا اور چھوٹے پوتے میر شمس الحسن کا چھُنّامَلی نام پنّا۔ گھر والے چھُنّامَلی ناموں کو پیار کا نام قرار دے لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا اخلاص تھا اور پھر یہ اخلاص کیسا مٹا ہے، العظمۃ للّٰہ۔

دلی کے آل انڈیا مسلم لیڈر

دلی کے اُن لوکل لیڈروں کا ذکر شروع کرنے سے قبل، جنھوں نے مندرجہ بالا لوکل لیڈروں کی جگہ لی، میں چاہتا ہوں کہ دلی کے آل انڈیا مسلم لیڈروں کی بابت چند باتیں اور عرض کر دوں۔ دلی کا کوئی ہندو میرے لڑکپن اور میری نوجوانی میں آل انڈیا لیڈر نہیں تھا۔ ویسے ہندوستان میں ہندو لیڈر مسلمان لیڈروں سے کہیں زیادہ تھے۔

www.taemeernews.com

دلی کے آل انڈیا مسلم لیڈر پانچوں کے پانچوں مولوی تھے۔ سمیع اللہ خاں سر نواب مولوی سمیع اللہ خاں کہلائے۔ مولانا حالی مولانا کہتے ہی۔ مولوی نذیر احمد جید مولوی تھے۔ مولویت کا پیشہ اختیار کر لیتے تو دوسرے مولوی نذیر حسین بن جاتے۔ بجنور سے دلی آئے علم دین پڑھنے کے لئے تھے۔ پھر دلی میں رہ گئے۔

سر سید احمد خاں بانیٔ علی گڑھ کالج اور مولانا محمد قاسم بانیٔ مدرسہ دیوبند ایک استاد (مولوی مملوک العلی) کے شاگرد تھے۔

منشی ذکاء اللہ نے بھی قدیم نصاب کے سوا اور کچھ نہیں پڑھا تھا۔ مگر منشی ذکاء اللہ پورے مولوی نہیں تھے۔ اِن حضرات کے زمانہ تک مولوی وہی کہلاتا تھا جو پورا مولوی ہوتا تھا۔ ذرا سی کسر رہ جاتی تھی تو اُسے منشی کہتے تھے۔ منشی سے مطلب اُردو کا کلرک (محرر) مت سمجھئے گا۔ منشی کے معنی ہیں انشا پرداز۔ صاحب قلم[1]۔ منشی ذکاء اللہ نے اتنی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں کہ اتنی کتابیں آجکل کے لوگ اطمینان قلب کے ساتھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اور مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی نے تو اُردو نثر و نظم میں انقلاب عظیم رونما کر دیا ہے۔

مولوی نذیر احمد اور سر سید احمد خاں کی تصنیفات بیشتر دینی ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔ سر سید احمد خاں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔

سر سید احمد خاں اور مولانا حالی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مولوی نذیر احمد

---

[1] ابو الفضل جیسے فاضل کو اہل ایران منشی ہند لکھا کرتے تھے۔

www.taemeernews.com

اور منشی ذکاء اللہ نے بڑھاپے میں خاصی سیکھ لی تھی۔

منشی ذکاء اللہ بغیر چُغے اور عمامے کے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ چُغے کے نیچے انگرکھا ہوتا تھا۔ جاڑے میں روئی دار انگرکھا اور روئی دار پاجامہ اور کشمیری شال کا چُغہ۔

مولوی نذیر احمد عمامہ بھی باندھتے تھے اور ترکی ٹوپی بھی اوڑھ لیتے تھے۔ خالی شیروانی پہنے بھی دیکھا اور شیروانی پر چُغہ بھی دیکھا۔

منشی ذکاء اللہ کی جوتی ہمیشہ دیسی ہوتی تھی۔ لال نری کی۔ مولوی نذیر احمد مُنڈا (شوز) بھی کبھی کبھار پہن لیتے تھے۔ مولانا حالی کو چُغہ پہنے میں نے نہیں دیکھا۔ غالباً چُغہ نہیں پہنتے تھے۔ صرف شیروانی ہی پہنتے تھے۔ سر پر اونی کپڑے کی خانہ نما گول سی ٹوپی۔ پیر میں لال نری کی دیسی جوتی۔ گلے میں رومال ضرور لپٹا رہتا تھا۔

سر سید احمد خاں نے البتہ لباس بدل ڈالا تھا۔ جو یونیفارم کالج کے طلبا کی تھی وہی اُن کا لباس تھا۔ ترکش کیپ۔ ترکش کوٹ۔ سیدھی تراش کا پتلون نما پاجامہ یا پتلون۔ پیر میں انگریزی شوز۔

ڈاڑھیاں سب کی تھیں۔ سید احمد خاں کی ڈاڑھی خوب گھنی تھی۔

چونکہ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مایل کیا تھا اور اُن کی تفسیر القرآن علماء کی رائے کے خلاف تھی، انھیں بے دین کہا جاتا تھا لیکن مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد فتووں کی زد میں نہیں آئے۔ مولوی نذیر احمد پر

www.taemeernews.com

پرورش تھوڑی سی جب ہوئی تھی جب اُنھوں نے کتاب اُمہات الاُمہ لکھی تھی۔ یہ بعد کی بات ہے۔ سرسید احمد خاں کے زمانہ کی بات نہیں ہے اور سرسید احمد خاں کے سلسلہ کی بات نہیں ہے۔

منشی ذکاء اللہ بھی فتووں سے محفوظ رہے۔

سرسید احمد خاں کی نسبت سُنا ہے کہ طلبائے علی گڑھ کالج کرکٹ کا میچ کھیلتے ہوتے تھے تو سرسید احمد خاں جانماز بچھا کر بیٹھ جاتے تھے اور رو رو کر دعا مانگتے تھے کہ الہٰی! میرے بچوں کی لاج تیرے ہاتھ ہے۔

کالج کی جامع مسجد زیر تعمیر تھی۔ کسی طوائف نے بھی چندہ بھیجا۔ سرسید احمد خاں نے چندہ قبول کرلیا اور اُس رقم سے مسجد کا پیشاب خانہ بنوادیا۔

ایک دفعہ کالج میں پچاس ہزار روپے کا غبن ہوگیا۔ کالج کا کلرک پچاس ہزار روپے لے بھاگا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے بیٹے سید محمود سے کہا کہ ہائی کورٹ کی ججی چھوڑ دو اور وکالت کرکے پچاس ہزار روپے فراہم کرو۔ روپے کسی نے کھائے ہوں، مجھے کالج کو روپیہ دینا ہے۔ کالج اتنا نقصان نہیں برداشت کرسکتا۔ چنانچہ سید محمود نے تعمیل حکم کی۔

ایک صاحب نے کہیں نوکری کے لئے درخواست بھیجی۔ درخواست میں لکھ دیا کہ میں سرسید احمد خاں کا داماد ہوں۔ سرسید احمد خاں کے صرف دو بیٹے تھے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ اِسے جاننے والے جانتے تھے۔ درخواست پر شبہ کیا گیا۔

www.taemeernews.com

لیکن جب سرسید احمد خاں کے پاس تحقیقات پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا کہ ہاں یہ میرے داماد ہیں اور پھر اُن زبردستی کے داماد کی بیوی کو واقعی بیٹی بنا لیا۔ اُس سے عمر بھر بیٹیوں کا سا سلوک کرتے رہے۔

اِن واقعات سے آپ سرسید احمد خاں کے کیرکٹر کی بابت رائے قایم کر سکتے ہیں۔ چاروں پانچوں حضرات کا بچپن، شباب اور بڑھاپا بے داغ تھا۔ چاروں پانچوں نے بے پردگی کو اپنے گھروں میں نہیں گھسنے دیا۔ سرسید احمد خاں کی بہوئیں کپتان سید حامد اور جسٹس سید محمود کی بیویاں پردہ کرتی تھیں۔ مولوی نذیر احمد مولانا حالی اور منشی ذکا راللہ کے ہاں بھی سخت پردہ تھا۔

سرسید احمد خاں کی کوشش رہتی تھی کہ کالج میں ایسے لڑکے لئے جائیں جن پر انگریزی تعلیم کا بُرا اثر نہ پڑے۔ جن کے باپ دادا ذی علم۔ مہذب اور شائستہ ہوں۔ جنھیں احساس ہو کہ ہمارے باپ دادا بینے نہیں ہیں۔ جو بقول اکبر الٰہ آبادی باپ دادا کو خبطی نہ سمجھنے لگیں۔

سرسید احمد خان کا انگریز حکام میں بڑا رسوخ تھا۔ لیکن وہ انگریزوں سے ذاتی اور انفرادی فایدے نہیں اُٹھاتے تھے۔

محلہ بلی ماران میں شریف منزل کے قریب شیخ جمال الدین اور میر فیض الحسن دو عطاروں کی دُکانیں تھیں۔ جمال الدین کا پورا خاندان عطار کہلاتا تھا لیکن فیض الحسن سرسید احمد خاں کے عزیز تھے۔ سرسید احمد خاں نے اُنھیں ملازمت نہیں دلوائی تو

www.taemeernews.com

انھوں نے جل کر دوکان کرلی تاکہ سید احمد خاں جلیں۔ دلی کے شرفا دوکانداری کو معیوب سمجھتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی۔ سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کے نواسے سید محمد علی بی اے پاس کر کے مدتوں علی گڑھ میں سر سید احمد خاں کے ہاں پڑے رہے کہ سفارش ہو جائے گی مگر انھوں نے سفارش کر کے نہ دی۔

سر سید احمد خاں چاہتے تھے کہ لڑکے خود ہاتھ پاؤں ہلائیں۔ دوسروں سے بھیک نہ منگوائیں۔ سید محمد علی بطور خود پراونشل سروس میں پہنچ گئے تھے۔ عرصہ دراز تک سشن جج رہے اور آخر میں جوڈیشل کمشنر ہوئے۔ انتقال سے پہلے علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔ نواب کا خطاب ملا تھا۔

مولوی بشیر الدین، بانی اٹاوہ کالج کا حال میں انتقال ہوا ہے۔ وہ سر سید احمد خاں کے ایسے ساتھی تھے؛ جو اب تک زندہ تھے۔ وہ اب کہا کرتے تھے کہ سر سید احمد خاں کا منشا ہرگز ایسی قوم بنانے کا نہیں تھا جیسی قوم بن گئی ہے۔

منشی ذکاء اللہ خاں کا ایک واقعہ سر سید احمد خاں کے واقعات پر بھی بائق ہے۔

ﮦ سید محمد علی کے والد کا نام میر ببر علی تھا اور چچا کا نام میر سید حسین۔ ببر علی تحصیلدار تھے اور سید حسین دردہ کاری میں سپرنٹنڈنٹ۔ حسین میرے پھوپا تھے اور خسر بھی۔

www.taemeernews.com

ذکاء اللہ کا ایک واقعہ

منشی ذکاء اللہ کے چھوٹے بیٹے فرحت اللہ نے آٹھویں جماعت، یعنی مڈل کا امتحان دیا۔ ۱۹۰۷ء تک مڈل کا امتحان یونیورسٹیاں لیا کرتی تھیں۔ منشی ذکاء اللہ ممتحنوں میں تھے۔ مڈل کا ایک پرچہ اُن کے پاس تھا۔ پرچے نمبر دینے کے واسطے آئے تو فرحت اللہ نے پرچوں کا سربمہر بکس کھول کر اپنا پرچہ بدل دیا اور بکس اس صفائی سے بند کیا کہ منشی ذکاء اللہ نہیں پہچانے۔ مگر جب فرحت اللہ کا پرچہ دیکھا تو تاڑ گئے، کیونکہ فرحت اللہ کا پرچہ سو میں سے سو نمبروں کا تھا۔

منشی ذکاء اللہ نے فرحت اللہ سے جرم کا اقرار کرایا اور یونیورسٹی کو رپورٹ بھیج دی۔ فرحت اللہ تین سال کے واسطے امتحان کی شرکت سے محروم کر دیئے گئے اور اُن کا مستقبل تباہ ہو گیا۔ پھر پڑھ نہیں سکے۔

فرحت اللہ بڑے ذہین اور تیز شخص تھے۔ مشہور ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُن اپنے ہم نام پر ایک مضمون لکھا تھا اور اُن کی ذہانت اور تیزی کی بڑی تعریف کی تھی۔ یہ فرحت اللہ پڑھ جاتے تو مرزا فرحت اللہ بیگ سے بڑھ جاتے۔ خیر فرحت اللہ اور مرزا فرحت اللہ دونوں اللہ کے ہاں جا پہنچے لیکن منشی ذکاء اللہ کی فرض شناسی اور ایمانداری کی یاد باقی ہے۔

دتی کے لوکل لیڈر

احباب دلی کے لوکل لیڈروں کا حال سنیئے۔ شاہزادہ مرزا ثریا جاہ اور رائے بہادر سری کرشن داس وغیرہ کی جگہ ان حضرات نے لی: حکیم اجمل خاں۔ شمس العلما مولوی سید احمد امام جامع مسجد۔ خان بہادر نواب غلام محمد حسن خاں۔

www.taemeernews.com

خان بہادر مولوی عبدالاحد۔ رائے بہادر لالہ شیو پرشاد چھنا مل والے اور رائے بہادر لالہ سلطان سنگھ۔

حکیم اجمل خاں کا حال پہلے لکھ چکا ہوں۔ حکیم صاحب آل انڈیا لیڈر بھی تھے اور لوکل لیڈر بھی۔ امام صاحب جامع مسجد نے جامع مسجد کی امامت کو اس رتبہ پر پہنچایا جس کی وہ مستحق تھی۔ انگریز حکومت پر اور مسلمان ریاستوں میں امام صاحب کا غیر معمولی اثر تھا۔ انگریز روم کے پوپ سے انھیں کم نہیں تصور کرتے تھے۔ امام صاحب نہایت اہل انسان تھے۔ امام صاحب نے خود بھی ترقی کی اور اپنی ترقی سے دوسروں کو بھی فیض پہنچایا۔ خدا معلوم کتنے مسلمان امام صاحب نے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر لے جا بٹھائے۔ امام صاحب بڑے سے بڑے کام میں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں ہاتھ ڈالنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ وائسرائے سے لے کر تھانہ دار تک سفارش کے لئے چلا جانا اُن کے نزدیک یکساں تھا۔

امام صاحب دوسرے خطاب یافتوں کی طرح انگریزوں کی خوشامد نہیں کرتے تھے۔ ابتداءً خوشامد کی ہو تو کی ہو۔ میں نے تو انھیں انگریزوں کو ڈانٹتے ہی دیکھا۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جس وقت کلکتہ سے دِلّی آئے ہیں اُس وقت دِلّی کا ڈپٹی کمشنر ایک فوجی افسر تھا۔ کرنل بیڈن۔ وہ اپنی کوٹھی میں بھی کسی کو

www.taemeernews.com

کرسی پر نہیں بٹھاتا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی ملنے گئے تو انھیں اس نے کھڑا رکھا۔ کرسی ملنے والے کے واسطے کمرہ میں ہوتی ہی نہیں تھی۔ مولانا محمد علی نے بیڈن کی اس حرکت پر حکومت کو ہلا ڈالا تھا۔ مگر امام صاحب نے یہ کیا کہ کمرے میں گھستے ہی بیڈن سے کہا مجھے وائسرائے کرسی دیتا ہے۔ تمھاری کیا حیثیت ہے جو مجھے کھڑا رکھنا چاہتے ہو۔ کرسی منگواؤ ورنہ میں جاتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھے بغیر بات نہیں کروں گا۔ بیڈن نے مجبوراً کرسی منگوائی۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مہر دلی میں نظر بند کئے گئے اور شہرت ہوئی کہ خواجہ حسن نظامی کو اور مجھے بھی نظر بند کیا جائے گا۔ کانپور کی مسجد کا قصہ چل رہا تھا۔ اس قصہ میں خواجہ صاحب، علی برادران اور مولانا ابوالکلام کی طرح پیش پیش تھے لیکن میرا نام محض خواجہ صاحب کے تعلق کے سبب آ گیا تھا۔ میں پریشان تھا۔ ایک دن میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں شیدا نے کہا۔ میاں! تم امام جی کو چیف کمشنر کے پاس لے جاؤ۔ وہ تمھارا چھٹکارا کرا دیں گے۔ آج امام جی فرما رہے تھے کہ حسن نظامی کے ساتھ واحدی خواہ مخواہ پس رہا ہے۔

مجھے خدا معلوم کیا سوجھی کہ چیف کمشنر کے ہاں تنہا پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ بہت بڑا کمرہ ملاقاتیوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری نوبت کیا آئے گی۔ اتنے میں امام صاحب تشریف لائے اور اتفاق سے میرے ہی برابر کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجھ سے پوچھا۔ ارے بھئی! تم کہاں؟ میں نے بتا دیا کہ اس لئے

آیا ہوں اور اب جرأت کر کے عرض کیا کہ آپ بلوا دیجیے۔ امام صاحب نے کہا۔ اچھا۔ ابھی لو۔ امام صاحب کو انتظار نہیں کرایا گیا۔ اُن کی فوراً بلاوا ہوئی اور پانچ منٹ کے اندر اندر مجھے بلا لیا گیا۔

پون گھنٹے امام صاحب میری صفائی میں بولتے رہے۔ بولتے کیا رہے۔ چیف کمشنر سے جواب طلب کرتے رہے کہ آپ نے واحدی کے متعلق بدگمانی کی کیوں؟

چیف کمشنر مسٹر ہیلی تھے، جو بعد میں پنجاب کے اور یو۔پی کے گورنر ہوئے اور سر میلکم ہیلی کہلائے اور اب لارڈ ہیلی ہیں۔ المختصر امام صاحب نے عجیب شان سے میری جاں بخشی کرائی۔

خان بہادر نواب غلام محمد حسن خاں مفتی صدرالدین۔ صدر الصدور کے پوتے تھے، محلہ شیا محل کے قریب حویلی صدر الصدور میں رہتے تھے۔ انگریزی تعلیم کے ثمرات اولین میں سے تھے۔ غالباً ایم اے تھے اور بی۔ اے ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہے۔ لیکن انگریزیت سے مغلوب نہیں تھے انگریزیت پر

لہ میں سیاست میں پڑنے کا اہل نہیں ہوں۔ میں نے کبھی حکومت کا آدمی بن کر کام کیا اور نہ کبھی حکومت کی مخالفت میں حصہ لیا۔ ہماری سیاست سے ملا کیا جائے تو وہ کچھ دین ہے لیکن مروجہ سیاست سے میرا کامل گھبراتا ہے۔

www.taemeernews.com

غالب تھے۔ قدیم معاشرت اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرتے تھے۔

آپ کہتے ہوں گے، واحدی جس کی ہے تعریف ہی کئے چلا جا رہا ہے۔ گویا واحدی کے زمانہ کی دلی میں کوئی بُرا تھا ہی نہیں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے عیب کم نظر آتے ہیں اور ہُنر زیادہ نظر آتے ہیں ؎

مرا پیرِ دانائے روشن شہاب ۔۔۔ دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش ۔۔۔ دگر آں کہ بر غیر بد بیں مباش

لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے زمانے کی دِلی کے لوگ ایسے تھے کہ اُن جیسوں کو اب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ شاید سارے ہی ہندوستان میں یہ صورت ہو۔ مرکز کا اثر سارے ملک پر پڑتا ہے۔ مگر میں سارے ہندوستان سے واقف نہیں۔ دِلی کا مجھے علم ہے۔ ۱۹۱۱ء سے قبل کے دِلی والے ۱۹۱۱ء کے بعد کے دِلی والوں سے افضل تھے اور ۱۹۴۷ء سے قبل کے دِلی والوں کو میں ۱۹۴۷ء کے تجربات کے بعد فرشتہ تصور کرتا ہوں اور اندازہ لگاتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے لوگ کیسے ہوں گے۔ اہلِ قلعہ کو انگریزوں نے بدنام کیا تھا۔

اور تمام باتیں جانے دیجیے۔ آپ بھی مُڑ کر پیچھے دیکھیں گے تو انسان کو انسان کا اور مسلمان کو مسلمان کا آجکل جیسا دشمن نہیں پائیں گے۔

میرے زمانے کا کوئی دِلی والا دِلی والوں کو آٹے میں، گھی میں، دودھ میں، مصالحوں میں زہر نہیں کھلاتا تھا۔ آج مسلمان مسلمانوں کے ساتھ اور ہندو

www.taemeernews.com

ہندوؤں کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ شیعہ سُنّی سے، مقلد غیر مقلد سے۔ دیوبندی بریلوی سے اُلجھا ضرور تھا۔ لیکن اسلام کو مذہبی فرقہ واریت نے اتنا گہرا زخم نہیں لگایا جتنا سیاسی فرقہ واریت نے لگایا ہے۔ مغربی پاکستان میں ختم نبوّت کی تحریک اُٹھا کر جو کھیل کھیلا گیا اور مشرقی پاکستان میں مسلمان بنگالیوں نے غیر بنگالی مسلمانوں کے جس طرح گلے کاٹے اِس نوع کی مثالیں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کے بیچ میں نہیں ملتیں۔

بے عیب ذات فقط اللہ کی ہے اور معصوم سوائے انبیاء کے کوئی انسان نہیں ہے۔ میں اپنے زمانہ کے دلّی والوں کو بے عیب اور معصوم نہیں کہتا، لیکن میرے زمانہ کے دلّی والوں کے محاسن اتنے تھے جو اُن کے معایب کو دبائے رکھتے تھے۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ۔ محاسن معایب کو دبا دیتے ہیں۔ یہ قرآنی فیصلہ ہے۔

جن حضرات کا ذکر اس وقت چل رہا ہے وہ سب حُکّام رس تھے اور حُکّام سے تعاون کرنے والے۔ مگر اُس وقت کے حکام رسوں اور حُکّام سے تعاون کرنے والوں کی ذہنیت صرف ذاتی فایدے حاصل کرنے کی نہیں تھی۔ وہ اپنے رسوخ سے عزیزوں، دوستوں اور قوم کے کام آتے تھے۔ وہ خلق اللہ کو دھوکے نہیں دیتے تھے، خلق اللہ کے سچ مچ کام آتے تھے۔

خان بہادر مولوی عبدالاحد کا بھی اِنہی لوگوں میں شمار ہے۔ مولوی

www.taemeernews.com

خان بہادر مولوی عبدالاحد

عبدالاحد کا یہی وصف کیا تھوڑا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ مقدس کتابیں شائع کیں۔ فحش لٹریچر اُس زمانہ میں مقبول نہیں تھا۔ لیکن قصے، کہانیاں اور افسانے تو مقبول تھے۔ مولوی عبدالاحد کی طبیعت ان چیزوں کی طرف بھی کبھی نہیں گئی۔

مولوی عبدالاحد بیٹے تو ایک غیر معروف شخص غلام محمد ساکن بنارس کے تھے، لیکن اُن کی بیوہ والدہ سے مولانا محمد احسن نانوتوی نے نکاح کر لیا تھا۔ اس لیے مولوی عبدالاحد نے تربیت مولانا محمد احسن نانوتوی سے پائی تھی، جو مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلوی اور مولانا مملوک العلیٰ جیسے مقدس اور عالم بزرگوں کے شاگرد تھے۔

رائے بہادر شیو پرشاد، رائے بہادر سلطان سنگھ، حکیم رضی الدین

رائے بہادر شیو پرشاد اور رائے بہادر سلطان سنگھ سے میں برائے نام واقف ہوں۔ ان دونوں کے علاوہ بھی ہندو لوکل لیڈر اور ضرور ہوں گے مگر میں کسی ہندو لیڈر کو پوری طرح نہیں جانتا۔ یہ میری کتاب کا نقص ہے کہ اس میں دلی کے خاص ہندوؤں کے متعلق بھی مواد کم ہے اور عام ہندوؤں کے متعلق بھی مواد کم ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ہندو مسلمان لیڈر اور ہندو مسلمان عوام اُس زمانہ کے متحد تھے۔ ہندو مسلمانوں میں ایسی محبتیں تھیں کہ آج مسلمانوں مسلمانوں میں نہیں ہے۔ ہندوؤں ہندوؤں میں ہوں تو ہوں۔

ہندو مسلمان لیڈروں کا مرکز حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم اجمل خاں کا گھر تھا۔ مسلمان لیڈر تو حکیموں کے لفٹننٹ تھے ہی، ہندو لیڈر بھی شریف خانی

www.taemeernews.com

حکیموں کا جتنا لحاظ کرتے تھے ہندوؤں میں سے کسی کا نہیں کرتے تھے۔ اصل لیڈری دلّی کی شریف خانی حکیموں کے ہاتھ میں تھی۔

حکیم عبدالمجید خاں کے دور میں کوئی شخص شریف خانیوں سے لگّا نہیں کھا سکتا تھا۔ حکیم اجمل خاں کا دو صاحبوں نے مقابلہ کیا۔ حکیم اجمل خاں کا کیا، حکیم اجمل خاں کی پارٹی کا۔ ایک صاحب تو حکیم ہی تھے اور خاندانی اور بلند مرتبہ حکیم تھے۔ یعنی حکیم رضی الدین خاں اور دوسرے امراؤ مرزا حیرت۔ یہ بھی شرفائے شہر میں سے تھے۔ دونوں بے انتہا ذہین۔ حکیم رضی الدین خاں اپنے تئیں حکیم اجمل خاں سے نیچا نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔[1] حکیم رضی الدین خاں کا حکیم اجمل خاں سے مقابلہ بس اتنا تھا کہ حکیم رضی الدین کے ہم جلیس حکیم اجمل خاں کے ہاں نہیں جاتے تھے اور حکیم اجمل خاں کے ہم جلیس حکیم رضی الدین خاں کے ہاں نہیں آتے تھے۔ صرف ایک صاحب اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ اُن کا نام

---

[1] حکیم اجمل خاں اور حکیم رضی الدین خاں کے علاوہ دلّی میں اور بھی بہت سے طبیب تھے۔ چند کے نام لکھتا ہوں۔ حکیم بر سیتے والے بازار سیتارام میں، حکیم علی احمد خاں محلہ چوڑی والان میں رہے (حکیم علی رضا خاں کے والد تھے اور حکیم احمد حسن خاں کے دادا) حکیم صادق علی خاں محلہ سوئی والان کے سامنے، حکیم نجو میاں محلہ گندہ نالہ میں اور حکیم سراج الدین فراشخانہ میں مطب کرتے تھے۔ حکیم سراج الدین کا شمار شہر کے رؤسا میں بھی تھا۔

مرزا یارن جان تھا۔

مرزا یارن جان

یارن جان کی آمد و رفت شریف منزل میں حکیم عبدالمجید خاں کے وقت سے تھی بلکہ شاید حکیم محمود خاں کے وقت سے۔ اور حکیم رضی الدین صاحب کے گھر بھی وہ اُن کے والد حکیم ظہیر الدین خاں کے زمانہ سے جاتے تھے۔

مرزا یارن جان بے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ رفوگری کرتے تھے۔ چاوڑی بازار میں دکان تھی۔ دن بھر تہہ بند باندھے اور نیم آستین پہنے رفوگری میں مصروف رہتے تھے۔ مگر شام کو تنگ پاجامہ۔ کرتہ۔ انگرکھا۔ دوپلی ٹوپی۔ کامدار جوتی پہن اور دکان کے آگے کرسی ڈال حکیم عبدالمجید خاں کا انتظار کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں کا معمول تھا کہ روزانہ چار پانچ بجے گِگ (GIG) میں نکلتے تھے۔ چاندنی چوک سے گذرتے ہوئے پہلے حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھتے۔ پھر جامع مسجد، چاوڑی بازار، حوض قاضی اور اجمیری دروازہ کے راستے سے حضرت سید حسن رسول نماؒ کی درگاہ میں حاضری دیتے تھے۔ مرزا یارن جان کو انتظار رہتا تھا کہ کب حکیم صاحب آئیں اور کب میں سلام بجالاؤں۔ حکیم صاحب کا بھی قاعدہ تھا کہ اگر آنکھ چوک جاتی اور مرزا صاحب سے علیک سلیک کئے بغیر آگے بڑھ جاتے تو گِگ واپس لاتے اور مرزا صاحب کا سلام لے کر آگے جاتے۔

مرزا یارن جان بے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود نہایت نستعلیق

www.taemeernews.com

انسان تھے۔ تعلیم نہیں ملی تھی۔ لیکن تربیت ملی تھی۔ اس زمانہ میں تربیت کا تعلیم سے زیادہ رواج تھا۔ حکیم اجمل خاں اور حکیم رضی الدین خاں دونوں سے اُنھوں نے وضع یوں نباہی کہ یہاں کی بات وہاں اور وہاں کی بات یہاں نہیں کہتے تھے۔

مرزا حیرت نے حکیم اجمل خاں اور اُن کی پارٹی کے خلاف ایک محاذ قایم کر دیا تھا۔ مرزا حیرت بڑے طرار انسان تھے۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے ٹھیک طریقے سے پڑھ لکھ لیا ہوتا اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کیا ہوتا تو ہندوستان بھر میں اُن کا جواب نہ تھا۔ مرزا حیرت نے اپنے اخبار کرزن گزٹ میں اجمل خاں پارٹی کے خلاف تابڑ توڑ مضامین شائع کئے۔ مگر حکیم اجمل خاں کا اقبال یاور تھا۔ جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ اُن کے ہر مخالف نے مُنہ کی کھائی۔ اور مخالفت تو اولیا انبیا کی ہوتی رہی ہے۔

مرزا حیرت وہی بزرگ ہیں جنھوں نے سیدنا حضرت امام حسینؑ کے کارنامہ شہادت سے انکار کیا تھا اور انکار پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی ـــ کمال یہ تھا کہ جس زمانہ میں انکارِ شہادت پر کتاب تصنیف کر رہے تھے اُسی زمانہ میں جمعہ کے جمعہ شہادت پر تقریریں کرتے تھے اور ایسی تقریریں کرتے تھے کہ سُننے والوں کی روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔

مرزا حیرت کا دفتر آخر میں تو میرے بالکل نزدیک کلاں محل میں آ گیا تھا۔

www.taemeernews.com

انکارِ شہادت کی تصنیف اور بیانِ شہادت کے زمانہ میں دفتر جامع مسجد کے شمالی دروازہ کے سامنے، پلیٹے والوں کے پاس شیش محل میں تھا۔ شیش محل عظیم الشان مکان ہے۔ سارا مکان اور اُس کا صحن سُننے والوں سے بھر جاتا تھا اور خلقت باہر سڑک پر کھڑی رہتی تھی کہ شاید کوئی بھنک کان میں پڑ جائے۔ میکروفون اور لاؤڈ سپیکر اُس وقت نہیں تھے ورنہ شاید راستے رُک جاتے۔

مرزا حیرت جیسا بولتے تھے ویسا ہی لکھتے تھے۔ حالانکہ ضابطہ کی تعلیم نہ جدید قسم کی پائی تھی نہ قدیم قسم کی۔ لیکن قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا اور اُسے مولوی نذیر احمد کے ترجمے سے ٹکرایا تھا۔ فارسی میں شعر کہنے کے مدعی تھے۔ ہر کس و ناکس صرف دیکھ کر مرعوب ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حُسن مردانہ عطا فرمایا تھا۔

ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ سر عبد القادر نے سُنایا تھا، اُس زمانہ میں، جبکہ مرزا حیرت کا عروج تھا اور عبد القادر شیخ عبد القادر ایڈیٹر مخزن تھے۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا مدارس کی طرف کہیں سالانہ اجلاس تھا۔ شیخ عبد القادر اور اُن کے احباب میر غلام بھیک نیرنگ۔ مسٹر عبد العزیز "فلک پیما" اور شیخ خوشی محمد، گورنر کشمیر وغیرہ اجلاس کی شرکت کرنے لاہور سے روانہ ہوئے۔ میر نیرنگ کے سوا سب انگریزی لباس میں تھے۔ مدراس قریب آیا تو تین چار سیٹھ وضع کے مسلمان اِن کے ڈبہ میں آ کر بیٹھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے

انھوں نے شیخ عبدالقادر اور اُن کے احباب سے باتیں شروع کیں۔ پوچھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ اِنھوں نے بتا دیا۔ پوچھا۔ کہاں سے آ رہے ہیں۔ اِنھوں نے کہا۔ لاہور سے۔ بس لاہور کا نام سُننا تھا کہ سیٹھ صاحبان کھڑے ہو گئے اور ان لوگوں کے ہاتھ چومنے لگے۔ یہ حیران کہ ہمارے ہاتھ کیوں چومے جا رہے ہیں۔ پوچھا۔ صاحبو! کیا ماجرا ہے۔ ہمیں کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ بولے۔ آپ لاہور سے جو آ رہے ہیں۔ پوچھا۔ لاہور سے آ رہے ہیں تو کیا ہوا۔ بولے۔ لاہور دِلّی کے نزدیک ہے۔ اور دِلّی میں مرزا حیرت جیسے بزرگ موجود ہیں۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا محمد علی نے دلی کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ سنہ ۱۲ یا ۱۳ میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری بھی دلی پہنچ گئے۔ حکیم اجمل خاں پر ان دونوں کا اثر پڑا اور حکیم صاحب نے انڈین نیشنل کانگریس کی ممبری قبول کر لی۔ کانگریس ۱۸۸۵ء سے قایم تھی۔ لیکن مسلمان اس سے دُور رہتے تھے۔ مسٹر بال گنگادھر تلک اور مسٹر گوپال کرشن گوکھلے کے دور تک کل آٹھ سات مسلمان کانگریس کے ممبر تھے۔ اُنہی میں دلی کے سید حیدر رضا بھی تھے۔ کسی کانگریسی مسلمان کا مسلمانوں میں گزر نہیں تھا۔ لیکن سید حیدر رضا کا زور بندھا اور ۱۹۰۴، ۱۹۰۵ء میں دلی کے عوام خصوصاً مسلمان، اُن کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ اُتنی گرویدگی اور مسلمان لیڈروں کے ساتھ میں نے نہ پہلے دیکھی اور نہ بعد میں دیکھی۔ چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی صدارت

www.taemeernews.com

میں خان بہادروں اور رائے بہادروں کے جلسے ہو رہے ہوتے اور حیدر رضا آ جاتے تو حاضرین ایک ایک کرکے سرکاری جلسہ سے اُٹھتے اور حیدر رضا کے پاس چلے جاتے سرکاری جلسہ برخاست کرنا پڑتا۔ سرکاری میز کرسیوں پر حیدر رضا کا قبضہ ہو جاتا اور وہ ٹھاٹ سے اپنا جلسہ کرتے۔

ایسے تماشے حیدر رضا نے بہت دکھائے۔ ایک دفعہ اعلان کیا گیا کہ فلاں دن فلاں وقت بیگم کے باغ میں فلاں جگہ حیدر رضا تقریر فرمائیں گے۔ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ لگا دی۔ مگر لوگ پہنچ گئے اور حیدر رضا بھی آ گئے۔ حیدر رضا جلسہ گاہ میں رُکے نہیں۔ مُنہ کو سیدھے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور رستہ میں جس نے یہ ہجوم دیکھا وہ بھی ساتھ چل پڑا۔ جلسہ گاہ میں پانچ ہزار کا مجمع تھا تو اب دس ہزار کا ہو گیا۔

حیدر رضا نے جمنا کے پُل کا رخ کر لیا اور مجمع کو لے کر پُل پار کر گئے پُل کی دوسری جانب دِلّی کی حدود نہیں تھیں۔ یو۔ پی کی حدود تھیں۔ وہاں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ نہیں تھا۔ وہاں حیدر رضا نے تقریر کی اور دل کی خوب بھڑاس نکالی۔

حیدر رضا کے چچا تحصیلدار تھے۔ انھیں نوکری خطرہ میں نظر آئی۔ انھوں نے اپنی لڑکی سے حیدر رضا کی نسبت کر دی اور اپنے خرچ سے بیرسٹری پڑھنے انگلستان بھیج دیا۔ حیدر رضا نوجوان تھے۔ حیدر رضا نے جب بی اے پاس کیا ہے تو آصف علی اور رؤف علی فسٹ ایر میں تھے۔ دو ڈھائی سال حیدر رضا نے

ری کی اور آصف علی اور رؤف علی اُن کے متعلقین رہے۔ پھر تینوں ساتھ بیرسٹری
یئے گئے۔ رؤف علی نے واپس آکر پوری توجہ بیرسٹری پر کی۔ آصف علی کا رجحان
یاست کی طرف رہا۔ حیدر رضا نے لندن میں ایک دولتمند عورت سے شادی رچالی۔
ٹھارہ برس دِلّی کو بُھلائے رکھا۔ وہ دولتمند عورت مرگئی تو تشریف لائے لیکن
مولانا محمد علی کا دور دورہ تھا۔ مولانا محمد علی کیا، مسٹر آصف علی کے سامنے بھی
نکا چراغ نہ جلا۔ اُنھوں نے دِلّی کو بُھلا دیا تھا، دِلّی نے اُنھیں بُھلایا۔ ابھی زندہ
۔ حیدر آباد دکن کے کسی ضلع میں پریکٹس کرتے ہیں۔ پریکٹس بھی یونہی سی ہے۔
جس قدر شاندار تھی اُس کے مطابق باقی عمر نہیں گذری۔ (افسوس ان سطور
کتابت کے وقت سید حیدر رضا کا انتقال ہو چکا ہے۔)

خیر کہہ میں یہ رہا تھا کہ مسٹر تلک اور مسٹر گوکھلے کے زمانہ میں مسلمان کانگریس
نام سے بھڑکتے تھے۔ لیکن گاندھی جی واقعی موہن داس کرم چند نکلے۔ اُن کی
ہنیت اور کرمیت نے مسلمانوں کو کھینچ لیا۔ تمام وزنی مسلمان کانگریس
ں شامل ہو گئے۔ حکیم اجمل خاں کانگریس سے کیسے بچ سکتے تھے۔

حکیم اجمل خاں کے شریک کانگریس ہونے کے بعد دلّی کی قیادت دو حصوں
ں بٹ گئی۔ حکیم اجمل خاں کا کوئی قدیم ساتھی حکیم صاحب کا ہم خیال نہ تھا۔
ن سب کی ایک پارٹی رہی اور حکیم صاحب اُن سے محروم ہو کر نئے ساتھیوں کی
منڈلی میں آگئے۔ حکیم اجمل خاں کے قدیم ساتھی انگریزوں کے ساتھ رہے۔ حکیم

اجمل خاں نے ہندوؤں کا ساتھ دینے میں مسلمانوں کی فلاح سمجھی۔

کس نے صحیح راستہ اختیار کیا اور کون غلط راستہ پر تھا۔ ہمیں اس سے بحث نہیں، ہمارا کام جماعتوں اور پارٹیوں کا محاکمہ کرنا تھوڑا ہی ہے۔ ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک دلی کا جو رنگ رہا تھا اس میں فرق پڑ گیا دلی کا سکون و اطمینان برباد ہو گیا۔

بہر حال دلی کے ہندو مسلم عوام پر اثر اب بھی حکیم اجمل خاں کا تھا۔ خان بہادروں اور رائے بہادروں کی وہ پرسش پانچ فی صدی باقی نہیں رہی تھی جو ۱۹۲۰ء سے پہلے تھی۔ ۱۹۲۰ء سے پہلے خان بہادروں اور رائے بہادروں کے انگریزوں سے ملنے اور تعاون کرنے میں معصومیت تھی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد عوام کی نظر میں معصومیت مشتبہ ہو گئی۔

ایک صاحب تھے۔ نواب فیض احمد خاں۔ یہ اصل میں تو ضلع کرنال کے باشندے تھے۔ پاکستان کے وزیر اعظم اوّل نواب زادہ لیاقت علی خاں کے رشتہ کے چچا۔ لیکن اِن کے والد نے دلی کے محلہ چھتہ شیخ منگلو میں شادی کر لی تھی۔ والدہ کی طرف سے دلی والے تھے اور دلی والوں کا مکمل نمونہ۔ حکیم اجمل خاں کی ترک کانگریس کے بعد حکام رس مسلمانوں کا اجتماع نواب فیض احمد خاں کے ہاں ہونے لگا۔ نواب فیض احمد خاں کو لیڈری کا شوق نہیں تھا۔ وہ حکام سے ملتے جلتے بھی نہیں تھے اور حکام سے کسی نوع کا فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ ان کی یہ رائے

www.taemeernews.com

نی مخلصانہ تھی کہ حکیم اجمل خاں نے انگریزوں سے قطع تعلق کر لیا۔ بُرا کیا۔
ب فیض احمد خاں حکیم اجمل خاں کے بچپن کے دوست تھے۔ حکیم اجمل خاں
م کرتے کرتے تھک جاتے تو اختلافِ مشرب کے باوجود بھی نواب فیض احمد خاں
کے ہاں آکر آرام لیتے تھے۔ نواب فیض احمد خاں کے دیوانخانہ میں حکیم
مل خاں کو خلقت کی یورش سے پناہ مل جاتی تھی۔ دماغوں کا اختلاف تھا
وں کا اختلاف نہیں تھا۔ مگر بہر حال حکیم اجمل خاں کی شرکت کانگریس کا
یہ حکیم اجمل خاں کی قدیم پارٹی کے حق میں بُرا رہا۔ دہلی کی حکومت نے اب اُن
ندوؤں اور مسلمانوں کی سرپرستی شروع کر دی، جو حساب کی رُو سے ہندو مسلم عوام
ہ نمایندے سمجھے جاتے تھے۔ یعنی ممبران میونسپل کمیٹی تھے۔ انگریزوں نے
ادی کسی خیر خواہ سے نہیں لیکن اپنے قریب کر لیا میونسپل کمیٹی کے ممبروں کو۔
ممبرانِ میونسپل کمیٹی سچ مچ حساب کے سوال اور جواب کی طرح پبلک کے
ایندے ہوں یا نہ ہوں لیکن ممبروں میں ایک دو ممبر ایسے ضرور آجاتے تھے جو
ہ از کم باقی ممبروں کی نمایندگی یا لیڈری واقعی کر سکتے تھے۔ دلّی کی حکومت نے
ں قابلیت کے ممبروں پر ہاتھ دھر دیا اور انگریزوں کی غالباً سارے ملک میں ہی
یسی ہو گئی کہ جس کا تعاون حاصل کیا جائے اُس میں تھوڑی بہت جان ہونی
ہیئے۔ جان ہیں نہ پھونکنی پڑے۔ چنانچہ حکومت دہلی نے دو آدمی تو ایسے
تخب کئے کہ واقعی بڑے جاندار تھے۔ حکومت نے اُن کی سرپرستی نہیں کی،

www.taemeernews.com

انھوں نے حکومت کی سرپرستی کی۔ ایک سر شری رام۔ دوسرے خان بہادر حبیب الرحمٰن۔ او۔ بی۔ ای۔

سر شری رام پہلے میونسپل کمشنر تھے جن کا حکومت دہلی نے تعاون حاصل کیا اور خان بہادر حبیب الرحمٰن آخری۔ یہ دونوں غیر معمولی دماغ کے انسان ہیں۔ سر شری رام میونسپل کمیٹی کے جونیر وائس پریسیڈنٹ تھے اور سر عبد الرحمٰن سینئر وائس پریسیڈنٹ۔ لیکن میونسپل کمیٹی پر حکومت سر شری رام کی تھی۔ علیٰ ہذا خان بہادر حبیب الرحمٰن کی جونیر وائس پریسیڈنٹی میں سر شنکر لال سینئر وائس پریسیڈنٹ ہو گئے تو مسٹر لا بیلی جیسا زبردست اور مضبوط پریسیڈنٹ میونسپل کمیٹی جونیر وائس پریسیڈنٹ کی نگاہیں دیکھا کرتا تھا۔ میرے سامنے بارہا ایسا ہوا ہے کہ لا بیلی صاحب میونسپلٹی کی سب سے اہم سب کمیٹی ایگزیکیوٹو فائنس کی صدارت کرتے ہیں اور کسی ممبر نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا۔ وہ تھوڑی دیر ممبر سے اُلجھا کئے بالآخر خان بہادر حبیب الرحمٰن سے پوچھا۔ خان بہادر آپ کیا کہتے ہیں۔ خان بہادر نے جواب دیا۔ ممبر حق بجانب ہے اور لا بیلی صاحب جو دلی کے ڈپٹی کمشنر بھی تھے بت کی طرح بیٹھ گئے۔ پریسیڈنٹ کو خان بہادر حبیب الرحمٰن کی بے لوثی۔ ایمانداری اور عقل پر اس قدر بھروسہ تھا کہ پریسیڈنٹ وائس پریسیڈنٹ کے آگے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ بالآخر ہندو مسلمان ممبران کمیٹی نے ڈپٹی کمشنر کی بجائے انہی کو کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا تھا۔

خان بہادر حبیب الرحمٰن

اُن سے پہلے دلی کے کسی ہندو مسلمان نے یہ عزت نہیں پائی تھی۔ انگریز اُس انسان کی قدر کرتے ہیں جس کے پاس طاقت ہو۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن کے پاس بے لوثی ایمانداری اور عقل کے ساتھ ساتھ پبلک کے نمائندگان کی طاقت بھی تھی۔ خان بہادر ہونا تو معمولی اعزاز تھا۔ دلی میونسپل کمیٹی کا ہر جونیئر وائس پریسیڈنٹ خان صاحب یا رائے صاحب اور ہر سینیئر وائس پریسیڈنٹ خان بہادر یا رائے بہادر بنا دیا جاتا تھا۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن کو حکومت نے او۔ بی۔ ای بنایا اور سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر نامزد کیا اور حکام رس طبقہ کا یہ آخری مسلمان حکیم اجمل خان کے سوا ماسبق تمام ہندو مسلمان حکام رسوں سے بازی لے گیا۔

مسلمانوں کا چراغ دلی میں گل ہونے والا تھا۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن نے اس چراغ کی پوری بھڑک دکھا دی۔

سر شری رام کے زمانہ وائس پریسیڈنٹی اور خان بہادر حبیب الرحمٰن کے زمانہ وائس پریسیڈنٹی میں کافی بُعد ہے۔ سر شری رام کے زمانہ میں دلی میونسپل کمیٹی پر حکومت کا کامل تسلط تھا۔ سر شری رام نے اس تسلط کے انجر پنجر ڈھیلے کئے۔ تسلط کو ہلانے کی ابتدا کی۔ سر شری رام ٹاٹا اور برلا کی صف کے دولتمند ہیں۔ اُن کے والد لالہ مدن موہن لال قدیم وضع کے ہندو تھے۔ قدامت کا اثر سر شری رام پر بھی ہے۔ انگریزی لباس لالہ مدن موہن لال تو کیا پہنتے، سر شری رام نے بھی نہیں پہنا۔ بلکہ سر شری رام کے چھوٹے بھائی سر شنکر لال نے بھی نہیں پہنا۔

سر شری رام

لالہ مدن موہن لال

www.taemeernews.com

سر شری رام کے بیٹے لالہ مرلی دھر پیتے ہوں تو پیتے ہوں۔ میری لالہ مرلی دھر سے دلی میں ملاقات نہیں تھی، کراچی وہ دو دفعہ تشریف لائے تو مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے انھیں شیروانی اور آڑا پاجامہ ہی پہنے دیکھا۔ افسوس لالہ مرلی دھر ہوائی جہاز کے حادثہ کا شکار ہو گئے۔ اور سر شنکر لال کا بھی انتقال ہو گیا۔ لالہ مرلی دھر اور سر شنکر لال دونوں اردو میں شعر کہتے تھے اور حضرت بیخود کے شاگرد تھے۔ دلی کے قدیم مسلمانوں کو ہندوؤں سے اور دلی کے قدیم ہندوؤں کو مسلمانوں سے متعلق کد نہیں تھی۔ سر شری رام کا خاندان بھی دلی کے قدیم خاندانوں میں ہے۔

میں اور خان بہادر حبیب الرحمٰن میونسپل کمیٹی کے ممبر قریباً ساتھ ساتھ ہوئے تھے۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن کا دور از اول تا آخر میرے سامنے گزرا۔ سر شری رام نے ہم لوگوں کے پہنچنے کے چند دن بعد میونسپل کمیٹی چھوڑ دی تھی اور ریزرو بنک کی گورنری اختیار کر لی تھی۔ مجھے اُن کے اثر و رسوخ کا ذاتی تجربہ کم ہے۔ مگر میں نے چند دن میں یہ دیکھا کہ سر شری رام کے مقابلے میں کمیٹی کے تمام ہندو مسلمان ممبروں کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔

سر شری رام سے قبل میونسپل کمیٹی میں سر عبدالرحمٰن کا زور تھا اور سر عبدالرحمٰن سے قبل بابو پیارے لال وکیل کا۔ لیکن سر شری رام دونوں سے بڑھ گئے تھے۔

سر شری رام اور خان بہادر حبیب الرحمٰن کے درمیان خان بہادر ہیں۔

خان بہادر ایس۔ ایم عبداللہ اور خان بہادر حاجی رشید احمد

ایم عبداللہ اور خان بہادر حاجی رشید احمد کا دور رہا، اور بہت زور رہا۔ خان بہادر حاجی رشید احمد میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ لیکن کاروبار کے سلسلہ میں دلی کے ہو گئے تھے اور دلی میں انھوں نے عروج پایا۔ خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ اور خانبہادر حاجی رشید احمد دونوں دلی میونسپل کمیٹی کے سینیر وائس پریسیڈنٹ رہے۔

خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ کی وائس پریسیڈنٹی میں نے نہیں دیکھی۔ سُنا ہے طوطی بولتا تھا۔ خان بہادر حاجی رشید احمد میونسپل معاملات میں خانبہادر ایس۔ ایم عبداللہ کے شاگرد تھے۔ خان بہادر ایس۔ ایم عبداللہ ہی نے انھیں اُٹھایا، اُبھارا اور عروج پر پہنچایا۔

خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ کی تعلیم زیادہ نہیں تھی لیکن اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو پرے بٹھاتے تھے۔ مسلمانانِ دہلی کی ذہانت کا نمونہ اور مسلمانانِ دلی

ؔ خان بہادر حاجی رشید احمد کے بعد خان بہادر حاجی وجیہہ الدین بھی اپنے اہل و عیال اور کاروبار کو لے کر میرٹھ سے دلی آ بسے تھے۔ حاجی وجیہہ الدین سنٹرل اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں لیکن دلی میں انھوں نے سیاست سے واسطہ نہیں رکھا۔ اب کراچی میں ہیں اور خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ایک لڑکے صاحبزادہ جمیل الدین کراچی میونسپل کارپوریشن کے ممبر ہو گئے تھے۔

www.taemeernews.com

کی اکڑ کا بھی نمونہ۔ دوستوں کے دوست، مخالفوں کے مخالف۔ مخالفت آواز دے کر کرتے تھے۔ اور دوستی پر اُن کی بھروسہ کیا جاتا تھا۔ خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ وائس پریسیڈنٹ نہ رہنے کے بعد بھی بے اثر نہیں ہوئے تھے۔

پیچھے لکھ آیا ہوں کہ اس کتاب میں ہندو عمایدکا ذکر بہت تھوڑا ہے۔ یہ نقص ہندوؤں سے میری ناواقفیت کی وجہ سے بھی ہے۔ مگر اب غور کرتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ میرے زمانہ میں دِلّی پر غلبہ متواتر مسلمانوں کا رہا۔ ہندو مسلمانوں کے آگے نمایاں ہوئے ہی نہیں۔

دِلّی میونسپلٹی کے دو گروپ فوٹو میرے پاس ہیں۔ ایک ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۹ء تک کے ممبروں کا۔ دوسرا ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۴ء تک کے ممبروں کا اُن میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ ۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۹ء کے گروپ میں چار ہندو ہیں:۔ لالہ چھنّا مل۔ رائے مہیش داس۔ لالہ امراؤ سنگھ۔ رائے صاحب سنگھ۔ اور مسلمان دو:۔ خان محبوب بخش اور نجف خاں تحصیلدار۔ دو انگریز ہیں۔ ایک کمشنر دہلی، کرنل ہملٹن اور ایک ڈاکٹر جے۔ سی۔ پیری۔ منیجر دہلی بینک۔ اُس زمانہ میں کمیٹی کا صدر کمشنر ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نہیں۔ بعد میں ڈپٹی کمشنر ہونے لگا اور ۴۷-۱۹۴۶ء میں تو خان بہادر حبیب الرحمٰن او۔ بی۔ ای صدر تھے۔

۱۸۷۳ء، ۱۸۷۴ء کے گروپ میں چھ ہندو ہیں:۔ رائے مہیش داس۔ رائے صاحب سنگھ۔ لالہ امراؤ سنگھ۔ لالہ رتی مل۔ لالہ اجودھیا پرشاد اور لالہ

www.taemeernews.com

نرائن داس گرڈ والے۔ اور انگریز بھی چھ ہیں۔ ڈاکٹر جے۔ سی۔ پیری۔ ریورنڈ جمیس اسمتھ۔ مسٹر جی۔ سایم (پرنسپل دہلی کالج) کیپٹن جی۔ ایچ۔ ایوارٹ (سپرنٹنڈنٹ پولیس) ڈاکٹر جے۔ سی۔ بینی۔ مسٹر سی۔ ای۔ بریسفورڈ (کمشنر) اور مسلمان صرف ایک ا۔ خان محبوب بخش۔

ہندوؤں کی ڈاڑھیاں منڈی ہوئی ہیں اور مسلمانوں اور انگریزوں کے ڈاڑھیاں ہیں۔ دونوں کمشنر بھی ڈاڑھی والے ہیں۔

خیر ڈاڑھی کی بحث چھوڑیئے۔ کہنا مجھے یہ ہے کہ جب تک الیکشن کا تقضہ نہیں تھا اور انگریز میونسپل کمیٹیوں کے لئے ممبر نامزد کیا کرتے تھے، تب تک انگریزوں کی نظر عنایت ہندوؤں پر تھی۔ انگریز نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ انگریز مسلمانوں کو پچکائے چلے جاتے تھے۔ لیکن الکشن نکلا یا ہندوؤں نے ذرا سر نکالا تو مسلمانوں کو بڑھنے کا موقع دیدیا گیا۔ دوسری طرف ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کو اپنایا اور بڑا بنایا۔ لہذا تعاونی مسلمان بھی نمایاں ہو گئے اور عدم تعاونی مسلمان بھی نمایاں ہو گئے۔

کم از کم دلی کا حسال میں نے یہی دیکھا۔ حکیم اجمل خاں کا خاندان تو خیر اس وقت بھی مستثنیٰ تھا جس وقت انگریزوں کی نظر عنایت ہندوؤں پر تھی۔ حکیم اجمل خاں کے والد حکیم محمود خاں سے لالہ چھنامل کو دباؤ کھانا پڑتا تھا اور چھنامل کے پوتے رائے بہادر شیو پرشاد (سی۔ آئی۔ ای) تو مرزا یارن جان کی طرح اپنی حویلی کے

www.taemeernews.com

بالاخانہ میں منتظر رہتے تھے کہ حکیم عبدالمجید خاں (برادر کلاں حکیم اجمل خاں) کی سواری حویلی کے نیچے پہنچے اور وہ کھڑے ہو کر حکیم صاحب کی خدمت میں سلام پیش کریں۔ علیٰ ہذا حکیم اجمل خاں کا اثر و رسوخ اُس زمانہ میں بھی بے مثال تھا جس زمانہ میں وہ حاذق الملک تھے اور اُس زمانہ میں بھی بے مثال رہا جس زمانہ میں وہ مسیح الملک[1] کہلائے۔

دلّی میں حکام رس طبقہ کے مسلمان لیڈروں کو بھی ہندو لیڈروں پر فوقیت حاصل تھی اور حکام سے تعاون نہ کرنے والے مسلمان لیڈر تو ہندو لیڈروں کے لیڈر رہتے۔ حکام رس طبقہ میں خان بہادر حبیب الرحمٰن جیسا آنکہ دلّی میں کسی ہندو کو نہیں میسّر آیا اور عدم تعاونی لیڈر دلّی میں حکیم اجمل خان ڈاکٹر انصاری۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تھے۔ اُن کی ٹکر کے لیڈر دِلّی سے باہر بھی کم تھے اور دلّی میں مطلق نہیں تھے۔

مسٹر آصف علی کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ اُس سے عدم تعاونی مسلمان لیڈروں کے اثر کا اندازہ لگائیے۔

---

[1] حاذق الملک کا خطاب انگریزوں کا عطا کردہ تھا۔ مسیح الملک کا خطاب قوم کا عطا کردہ اور خواجہ حسن نظامی کا مجوزہ۔ خواجہ صاحب اِس قسم کے خطاب خوب تجویز کیا کرتے تھے۔ قاید اعظم کو قاید اعظم بھی سب سے پہلے خواجہ صاحب نے لکھا تھا۔

www.taemeernews.com

چاندنی چوک کی جانب شاہزادی جہاں آرا بیگم کے باغ کے دو دروازے ہیں ۔ ایک دروازے سے ملحق قابل عطار کے کوچے میں مسلمانوں کی آبادی تھی مسلمانوں نے کہا۔ اس دروازہ کے پاس ۱۸۵۷ء سے پہلے مسجد تھی اور مسجد کی جگہ پر کچی پکی مسجد کھڑی کر لی۔ دوسرے دروازہ سے ملی ہوئی ہندوؤں کی آبادی تھی۔ کوچہ نٹواں میں۔ اور ویسے تو سارا چاندنی چوک ہی ہندوؤں کا تھا۔ ہندوؤں نے دعویٰ کیا کہ ادھر شیو جی کا مندر تھا۔ انھوں نے وہاں شیو جی کی مورتی لاکر رکھ دی اور مندر کی تعمیر کی اجازت میونسپل کمیٹی سے مانگی۔ ہندو ممبر چاہتے تھے کہ تعمیر کی اجازت دیدی جائے۔ مسلمان ممبروں کا کہنا تھا کہ جہاں آرا بیگم کے باغ میں مندر کا کیا کام جس باغ کا نام انگریزوں کے زمانہ میں کمپنی باغ یا ملکہ کا باغ مشہور ہو گیا تھا وہ دراصل جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کا باغ تھا اور بیگم کا باغ کہلاتا تھا۔ بیگم سے ملکہ کا باغ بن گیا تھا۔

یہ مباحثہ مہینوں چلا۔ میونسپل کمیٹیوں کی کارروائی اخبارات چھاپا کرتے ہیں۔ کارروائیاں پڑھ پڑھ کر دلی کے ہندو مسلمانوں کی کشیدگی بڑھ گئی اور دلی کا اثر سارے ملک پر پڑا۔ مسٹر آصف علی دلی کی میونسپل کمیٹی کے بھی ممبر تھے اور ملک کی لیجسلیٹو اسمبلی کے بھی ممبر تھے۔ اسمبلی کا اجلاس شملہ میں ہو رہا تھا۔ اسمبلی کے کانگریسی ممبران نے آصف صاحب سے کہا کہ دلی جا کر اس آگ کو ٹھنڈا کیجیے۔ چنانچہ آصف صاحب شملہ سے دلی آئے اور خان بہادر ممتاز حسن قزلباش، سکریٹری میونسپل کمیٹی

www.taemeernews.com

کو ٹیلیفون کیا کہ مندر کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے آج ہی شام کو چار بجے تمام ممبروں کو بلا لیجیے۔ چنانچہ چار بجے انفارمل میٹنگ شروع ہوئی۔ آصف صاحب نے تین چار منٹ کی تقریر کی۔ بس پوچھا کہ ماجرا کیا ہے اور پھر ہندو مسلمان ممبروں کو موقع دیدیا کہ خوب دل کی بھڑاس نکال لیں۔ چار بجے سے رات کے آٹھ بج گئے آصف صاحب نے فرمایا۔ جائیے۔ کھانا کھا کر دوبارہ تشریف لائیے۔ مجھے کل شملہ واپس جانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خواہ کتنی دیر لگے میرا آنا بیکار نہ جائے۔

ممبران نو بجے پھر جمع ہو گئے اور پھر تقریریں چلیں۔ آصف صاحب اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے اور میونسپل کمیٹی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر۔ اُن کے سوا اُن کی پارٹی میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ سب ہندو تھے۔ جلسہ نے اتنا طول کھینچا کہ صبح میں اور آصف صاحب گھر پہنچے ہیں تو میرے پڑوس کی مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔

بھڑاس نکلوا کر بھی آصف صاحب نے بھڑاس پر تبصرہ نہیں کیا۔ آغاز کی تقریر میں تین چار منٹ بولے تھے۔ اختتامیہ تقریر کے لئے ایک منٹ لیا۔ صرف حکم دیدیا کہ آیندہ میونسپل کمیٹی کے جلسوں میں اس بحث کو ہرگز نہ چھیڑا جائے اور معاملہ سکریٹری اور انجینیر وغیرہ افسران پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ جیسا مناسب سمجھیں فیصلہ کر دیں۔ یہ حکم مسلمانوں کے تو مطلب کا تھا۔ لیکن ہندوؤں نے اِسے ایسا مانا کہ اُس دن کے بعد سے تبو مندر کا نام میونسپل کمیٹی کے جلسوں

www.taemeernews.com

بنا نہیں لیا۔

ایک دن شام کو بیگم کے باغ میں دلّی صوبہ کانگریس کمیٹی کی طرف سے پنڈت
اہرلال نہرو کی بہن، مسز وجے لکشمی پنڈت کو چاء کی دعوت دی گئی۔ ایڈریس بھی
ش کیا گیا۔ خان بہادر حاجی رشید احمد کی وائس پریسیڈنٹی کا زمانہ تھا۔ اتفاق کی
ت، عین ایڈریس پیش کرنے کے وقت حاجی صاحب اپنی موٹر میں اُدھر سے گذرے
انگریس والوں نے اُنھیں پکڑ لیا اور اُن سے خواہش کی کہ مسز پنڈت کے گلے میں
ر آپ ڈال دیجیے۔ حاجی صاحب نے ہار ڈال دیا۔ دوسرے دن اخباروں میں یہ
بر میری نظر پڑی اور میں کمیٹی گیا تو میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ اب آپ حکام
ی بجائے مخالفین حکام سے مستقل تعاون کیجیے۔ اُس وقت لالہ دیش بندھو بھی
وجود تھے۔ حاجی صاحب تو مسکرا کر چپ ہو گئے لیکن لالہ دیش بندھو نے فرمایا۔
احدی صاحب! ہم تو مسلمانوں کی حکومت میں بھی منیم تھے اور قومی حکومت میں بھی
نیم رہیں گے۔ حکومت کے اہل تو مسلمان ہی ہیں۔ لالہ دیش بندھو کا یہ نسخہ بالکل غلط
ہیں تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق نہ پڑتا تو واقعی یہی ہوتا۔ ہندوؤں میں
سٹر دیش مکھ جیسے ماہر اقتصادیات کی افراط ہے تو مسلمانوں میں مسٹر رفیع احمد
قدوائی جیسے ایڈمنسٹریٹر تھوڑے نہیں ہیں۔ ہندو مسلم افتراق کے باوجود مسٹر قدوائی
نے بھارت کو ایسا سنبھالا کہ بھارت اُن کا کلمہ پڑھتا ہے۔

لالہ دیش بندھو مسٹر آصف علی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے مگر عقل میں اُن

www.taemeernews.com

رسوخ میں چھوٹے نہیں تھے۔ رسوخ دلی کے ہندوؤں میں اُن کے برابر اُن سے قبل کسی ہندو نے حاصل نہیں کیا تھا۔ مدبر قسم کے نوجوان تھے۔ زندہ رہتے تو پنڈت مدن موہن مالوی ثانی ہوتے۔ لیکن مسٹر آصف علی کے حکم سے انھوں نے کبھی سرتابی نہیں کی۔

مسلمان اگر عیش کے سامان مہیا ہو جانے پر عیش میں نہ پڑ جایا کریں اور دین و دنیا سے آنکھیں نہ بند کر لیا کریں تو مسلمانوں میں حکومت کی قابلیت ہندوؤں سے یقیناً زیادہ ہے۔

ہندوؤں میں عیش پسندی مسلمانوں جیسی نہیں ہے۔ ہندو عیش، بلکہ عیاشی، حساب لگا کر کرتے ہیں اور عیش پسند نہ ہونے کی صورت میں جو جو نعمتیں ملا کرتی ہیں وہ سب انھیں میسر ہیں۔ ہندوؤں میں مسلمانوں کی نسبت ڈسپلن زیادہ ہے۔ علم زیادہ ہے۔ دولت زیادہ ہے۔ ہندو اس ضرب المثل کے مصداق ہیں کہ دوڑ میں جیت اُس کی ہوتی ہے جو بے آپے ہو کر نہیں دوڑتا۔ بلکہ استقلال سے دوڑتا ہے۔

(SLOW AND STEADY WINS THE RACE)

خالی خولی ذہانت اور طباعی کام نہیں دیا کرتی۔ ذہانت اور طباعی روپے سے بڑی چیز نہیں ہے۔ ذہین اور طباع لوگ روپے والوں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ روپے سے بڑی چیز صرف ایمان ہے۔ سو ہماری تعلیم اور تربیت اب اس

www.taemeernews.com

اب اس قسم کی نہیں رہی ہے جس سے ایمان ترقی کرے۔ ہمارے خواص محض سیاسی مسلمان ہیں اور ہمارے عوام محض معاشرتی مسلمان۔

میرے زمانہ تک دلی کا اتنا برا حال نہیں ہوا تھا۔ میرے زمانہ میں مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں جیسے صاحب ایمان وایقان دلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

مولانا شوکت علی ذرا دور رہتے تھے اور ڈاکٹر انصاری اور دور۔ مولانا محمد علی بالکل پڑوسی تھے۔ اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور انہوں نے معمول بنا لیا تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے میرے ہاں آجاتے تھے اور مغرب کے بعد تک ٹھیرتے تھے۔ مغرب کے بعد اپنے گھر سے کھانا منگاتے اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ ذیابیطس کی وجہ سے ان کا کھانا پرہیزی ہوتا تھا۔

یہ وضع خواجہ صاحب اور ان کی لام بندی تک قائم رہی۔ میں نے لام میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مولانا محمد علی نے مولانا راشد الخیری کے ذریعہ کہلا کر بھیجا کہ مجھے واحدی سے توقع تھی کہ واحدی میرا ساتھ دے گا۔ میں نے جواب دیا کہ خواجہ صاحب کو میں مثل باپ کے سمجھتا ہوں اور آپ میرے چچا کی مثل ہیں۔ لڑائی باپ اور چچا کے درمیان ہے۔ مجھ خرد کو اس میں دخل دینے کا لڑائی شروع ہونے سے پہلے تو حق تھا کہ لڑائی چھڑنے نہ دیتا لیکن لڑائی چھڑ جانے کے بعد حق نہیں رہا۔ لیڈروں میں مجھے عقیدت اگر کسی سے تھی تو مولانا محمد علی سے تھی۔ مولانا

www.taemeernews.com

جیسا ہمہ صفت موصوف لیڈر میرے زمانہ میں نہیں پیدا ہوا۔ حسرت موہانی کا سا خلوص۔ شیخ الہند کی سی دین داری۔ اقبال کا سا تفکر۔ اجمل خاں کی سی فراست اور خدا معلوم کیا کیا اوصاف اکیلے محمد علی میں جمع تھے۔ وہ وفات نہ پا جاتے تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اپنے کسی دور میں دین سے بیگانہ نہیں رہے، لیکن مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا مرید ہو جانے کے بعد ان دونوں بھائیوں نے وضع طرح اور صورت شکل بھی مسلمانوں کی بنا لی تھی۔ حتیٰ کہ ڈاڑھیاں رکھ لی تھیں۔ ڈاڑھیاں اُن کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر انصاری اور مسٹر آصف علی نے بھی رکھی تھیں، مگر اُن کی ڈاڑھیاں کچھ دن بعد مُنڈ گئیں، اِن دونوں کی ڈاڑھیاں آخر دم تک رہیں۔

مولانا محمد علی میں تصنّع نہیں تھا۔ دل اور زبان ایک تھی۔ غصہ سے مغلوب ضرور ہو جاتے تھے، مگر دیسے باغ و بہار ان تھے۔ خانگی مجلسوں کے علاوہ میں نے اُن کے ہاں لیڈروں کے جلسے بھی دیکھے ہیں۔ وہ خشک سیاسی مباحث کو اپنے چٹکلوں سے خشک نہیں رہنے دیتے تھے۔

مولانا شوکت علی سے مجھے سابقہ تو نہیں رہا لیکن مولانا محمد علی کے باغ و بہار ہونے پر مولانا شوکت علی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

میرے ایک دوست تھے میر محمد حسین۔ اس کتاب میں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے مجھے یہ لطیفہ سنایا تھا۔ میر محمد حسین سیتاپور میں ملازم تھے۔ وہیں مولانا

www.taemeernews.com

شوکت علی کا بھی تبادلہ ہو گیا۔ مولانا شوکت علی پبلک لائف اختیار کرنے سے قبل کسی سرکاری عہدہ پر متعین تھے۔

ایک دن میر محمد حسین ریلوے اسٹیشن پر ریل کا ٹکٹ خرید رہے تھے کہ اُن کے سر پر سے کھڑکی میں ایک ہاتھ بڑھا۔ میر محمد حسین نے ہاتھ بڑھانے والے کو گھور کر دیکھا کہ یہ کون شخص ہے جو مجھ سے پہلے ٹکٹ حاصل کرنا چاہتا ہے، حالانکہ کھڑا میں پہلے سے ہوں۔

میر محمد حسین کا قد ہمارا آپ کا سا تھا۔ معمولی۔ درمیانہ۔ ہاتھ بڑھانے والے صاحب خوب لمبے چوڑے تھے۔ جب ہی تو اُن کا ہاتھ میر محمد حسین کے سر پر سے گزر گیا تھا۔

لمبے چوڑے شخص نے میر محمد حسین کے گھورنے پر کہا۔ میں آدمی کو مار بیٹھتا ہوں۔ میر محمد حسین نے کھٹ سے جواب دیا کہ میں آدمی کے کاٹ کھاتا ہوں یعنی تمھیں مار تو نہیں سکتا لیکن کاٹ تو لوں گا۔

لمبے چوڑے شخص نے میر محمد حسین کو گلے سے لگا لیا اور فرمایا:۔ ارے تو علی گڑھ کا پڑھا ہوا ہے؟۔ علی گڑھ کے طالب علم کے سوا یہ جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ میرا نام شوکت علی ہے۔

مولانا شوکت علی کی بے تکلفی اور زندہ دلی کا ایک لطیفہ اور پڑھ لیجیے:۔

مولانا شوکت علی کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک دفعہ میں متھرا سے دلی آ رہا تھا۔

www.taemeernews.com

ریل کے درجے میں گھسا تو مولانا شوکت علی تشریف فرما تھے اور پھل کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا بمبئی سے برابر کھانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اُن کا پرائیویٹ سکریٹری اُن کے ساتھ تھا۔ وہ اُس دن روزہ سے تھا مغرب کے قریب پرائیویٹ سکریٹری گوڑگانوہ کے اسٹیشن پر درجہ سے باہر گیا اور روزہ کھولنے کے لئے تھوڑے سے دہی بڑے لے آیا اور پھر شاید کچھ اور لینے چلا گیا۔ اتنی دیر میں دہی بڑے مولانا شوکت علی چٹ کر گئے اور کھڑے ہو کر پرائیویٹ سکریٹری کو آوازیں دینے لگے کہ دہی بڑے کون بیچ رہا ہے۔ اُسے بلاؤ۔ دہی بڑے والا حاضر کیا گیا۔ لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ مولانا شوکت علی کو ملک میں کون نہیں پہچانتا تھا۔ مولانا شوکت علی نے خوانچہ کا خوانچہ خرید لیا۔ گوڑگانوہ کے ایک زمیندار نے خوانچہ کی قیمت ادا کر دی کہ حضرت آپ گوڑگانوہ میں پیسے نہیں دے سکتے۔ یہاں آپ ہمارے مہمان ہیں۔

مولانا محمد علی بھی کھانے کے شوقین تھے۔ مگر اُنھیں ذیابیطس نے مجبور کر دیا تھا۔ تاہم کبھی کبھی بد پرہیزی کر بیٹھتے تھے۔

ایک دفعہ میرے ہاں بیٹھے تھے۔ سامنے ایک ٹوکرا رکھا نظر آیا۔ ٹاٹ پڑھا تھا اور پارسل بنا۔ پوچھا۔ اس میں کیا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ غالباً آم ہیں۔ فرمایا کھولو۔ میں آج آم ضرور کھاؤں گا۔ مسور کی دال کھاتے کھاتے ہار گیا۔ میں نے کہا۔ آپ نے "غالباً" کا لفظ غالباً نہیں سُنا۔ ٹوکرا میرا نہیں ہے۔ خواجہ صاحب کا ہے۔

www.taemeernews.com

اُن کا آدمی چھوڑ گیا ہے۔ لینے آتا ہوگا۔ میں تو خوشبو سے سمجھ رہا ہوں کہ اِس میں آم ہیں۔ فرمایا۔ خواجہ صاحب سے اجازت لے لو۔ میں نے ٹیلیفون کیا۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ ٹوکرا کا ٹوکرا مولانا کی نذر ہے۔

دونوں بھائی جس سے ملتے تھے لپک کر ملتے تھے اور ملنے والے کو اپنا سا انسان تصور کر کے ملتے تھے۔ یہ بات اتنے بڑے لیڈروں میں صرف ان دو بھائیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔ کھانے اور کھلانے کے خرچ کے سوا اُن کی شان درویشانہ تھی۔ اور کھلانے کا خرچ تو بعض مسلمہ درویشوں کا بھی شاہانہ رہا ہے۔ دونوں بھائیوں کا لباس اور چہرہ اللہ کے سپاہیوں جیسا تھا۔ آنکھوں سے درویشی جھلکتی تھی۔

ڈاکٹر انصاری

کھلانے کے اعتبار سے ڈاکٹر انصاری علی برادران سے فائق تھے۔ اُن کا گھر مستقل مہمان خانہ تھا۔ گاندھی جی سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے لیڈر کے لئے اُن کا گھر کھلا رہتا تھا۔ اور صرف کانگریسیوں کے لئے نہیں، غیر کانگریسیوں کے لئے بھی۔

گاندھی جی کا قاعدہ تھا کہ ہر شہر میں اپنے ٹھیرنے کی ایک مستقل جگہ مقرر کر لیتے تھے، میزبان بدلتے نہیں تھے۔ ڈاکٹر انصاری سے پہلے اُن کے میزبان سینٹ اسٹیفنز مشن کالج کے پرنسپل، مسٹر رُدرا تھے، رُدرا صاحب ہی کے ہاں گاندھی جی کی ریورنڈ اینڈریوز سے ملاقات ہوئی۔ اور گاندھی جی نے اس فاضل انگریز پروفیسر اور پادری کو اپنا گرویدہ کیا۔ رُدرا صاحب کا انتقال ہو گیا تو گاندھی جی بس ایک دفعہ اپنے

www.taemeernews.com

اکیس روزہ برت کے سلسلے میں مولانا محمد علی کے ہاں ٹھیرے تھے۔ پھر ڈاکٹر انصاری کے ہاں ٹھیرنے لگے۔ ڈاکٹر انصاری کے بعد اس وضع میں لچک آگئی تھی۔ کبھی برلا ہاؤس میں ٹھیرتے تھے۔ کبھی بھنگی کالونی میں۔

* * *

آصف علی

مسٹر آصف علی میرے ہم محلّہ اور بالکل ہم عمر تھے۔ مجھ سے سات دن بڑے۔ ۱۷ مئی ۱۹۰۶ء میری تاریخ پیدائش ہے[1]۔ ۱۰ مئی ۱۹۰۶ء ان کی تاریخ پیدائش تھی۔ بچپن میں ساتھ کھیلے۔ سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول اور اینگلو عربک ہائی اسکول میں ساتھ پڑھے۔ انھوں نے انگلستان جانے کی ٹھانی میں سلطان جی کی طرف چل پڑا۔ وہ بیرسٹر ہوگئے۔ میں نے مُلّائیت اختیار کرلی۔ وہ وزیر رہے۔ سفیر رہے۔

---

[1] یہ تاریخ والد مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ۱۹۴۷ء تک میرے پاس موجود تھی۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ رمضان کا مہینہ تھا، جمعہ کا دن اور صبح صادق کا وقت۔ میں چاہتا تھا کہ عیسوی تاریخ کی طرح ہجری تاریخ بھی معلوم ہو جائے۔ چنانچہ ایّوب قادری صاحب، بی۔اے، نے جن کا کراچی کی نیم سرکاری ہسٹاریکل سوسائٹی سے تعلق ہے، کسی پرانی جنتری میں دیکھ کر ۱۷ رمضان، جمعہ کا دن، ۱۳۲۴ ہجری بتایا۔ جمعہ کا دن انھیں معلوم نہیں تھا۔ اس لئے ان کی بتائی ہوئی ۱۷ رمضان ۱۳۲۴ ہجری کو میں اپنی صحیح تاریخ پیدائش سمجھتا ہوں۔ اور اس حساب سے شعبان ۱۳۹۶ ہجری میں چوہترواں سال ختم کر رہا ہوں۔

www.taemeernews.com

گورنر رہے۔ میرے حال پر بھی اللہ کا بڑا کرم ہے۔

دو آدمی ہیں جن سے آصف علی کے بچپن میں تعلقات تھے اور آخر عمر تک تعلقات رہے۔ ایک میں، دوسرے مولانا احمد سعید۔ ساٹھ سال کا نباہ معمولی بات نہیں ہے۔ مولانا احمد سعید سے خیر سیاست کا اشتراک تھا۔ مجھ سے یہ بھی نہ تھا۔ میری دنیا الگ اور آصف علی کی دنیا الگ۔ لیکن نصف صدی سے زیادہ نباہ گئے۔

آصف علی نو عمری سے جری اور بہادر تھے۔ ایک دفعہ میں اور وہ سینٹ اسٹیفنز اسکول (چاندنی چوک[1]) سے گھر آ رہے تھے۔ دیکھا کہ پریڈ کے میدان میں جرنیلی کے سپاہی نے ایک شخص کو پکڑ رکھا ہے۔ اس نے املی کے درخت پر چڑھ کر املی توڑی تھی۔ آصف علی اس کی وکالت کرنے کھڑے ہو گئے اور اس کے ساتھ قلعہ گئے اور انگریز کرنیل سے اُسے رہا کرا کر لائے۔ اس وقت آصف علی کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے کی کتنی صحیح مثال ہے۔

آصف علی کی مشرقیت مغربیت سے کبھی مغلوب نہیں ہوئی۔ انگلستان کی تعلیم و تربیت کا اُن پر ضرور اثر تھا لیکن گھر اور کوچہ چیلان اور دلّی کی فضا کو وہ انگلستان میں بھی نہیں بھولے تھے۔

آصف علی کی والدہ اصل رہنے والی تو سیوہارہ ضلع بجنور کی تھیں، لیکن شاہ

---

[1] ہماری طالب علمی کے وقت یہ اسکول چاندنی چوک میں تھا۔ موری دروازے بعد میں گیا ہے۔

www.taemeernews.com

پیدا دلی ہی میں ہوئی تھیں اور دلی کی امیر خواتین کا نمونہ تھیں۔ دلی کے امیر گھروں کا دستور تھا کہ عید کے دن زنانہ میں ڈومنیاں اور مردانہ میں قوال آتے تھے اور گاتے تھے۔ کوچہ چیلان میں آصف علی کا گھر تنہا گھر تھا۔ جہاں قوال تو نہیں مگر ڈومنیاں والدہ آصف علی کے بعد تک یعنی مسز ارونا آصف علی کے زمانہ میں بھی آتی رہیں۔

ارونا آصف علی

ارونا آصف علی جب تک خود سیاست کے میدان میں نہیں آئی تھیں مسٹر آصف علی کی بڑی خدمت گزار بیوی تھیں۔ انھوں نے ہندو میاں بیوی کے برتاوے دیکھے تھے، اُن کا برتاؤ شوہر پرستی کا نمونہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں آصف صاحب کے پاس بیٹھا ہوں، وہ کسی کام سے تشریف لائیں اور فرش پر آصف صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ آصف صاحب بگڑے کہ یہ کیا حرکت ہے، تب آصف صاحب کے حکم کی تعمیل میں کرسی پر بیٹھیں۔

ایک دن دونوں میاں بیوی کھانا کھا رہے تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ کھانا کھا چکے تو ارونا آصف علی نے جھوٹے برتن اُٹھانے شروع کر دیئے۔ آصف صاحب نے پھر ڈانٹا کہ یہ کام کیا کوئی ملازم نہیں کر سکتا۔

لیڈر بن جانے کے بعد ارونا آصف علی جیل میں یا ملک کے دوروں میں رہنے لگی تھیں۔ مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آصف صاحب اُن کے سیاسی کاموں کی بہت تعریف کیا کرتے تھے اور یہ تو دور سے دیکھنے والوں کو بھی محسوس ہوتا ہے کہ کام کرنے والی خاتون ہیں۔

www.taemeernews.com

آخر میں آصف علی اور مسز آصف علی میں رائے کا اختلاف ہوگیا تھا۔ اس نوع کا اختلاف، مثلاً مسٹر آصف علی نے وزارت قبول کرلی۔ مسز آصف علی اپنی حکومت کے عہدے قبول کرنے کو بھی برا سمجھتی تھیں۔ آصف صاحب کے انتقال کے بعد خود انھیں مغربی بنگال کی گورنری پیش ہوئی تو منظور نہیں کی اور دلی میونسپل کارپوریشن کی میئر شپ کو ترجیح دی۔ یہ عزت پبلک کی طرف سے ملتی ہے، میئر شپ کا الاؤنس اور کوٹھی، موٹر وغیرہ کوئی چیز یہاں بھی نہیں لی۔ بالکل سادگی کے ساتھ ایک معمولی فلیٹ میں رہتی ہیں۔

مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر آصف علی آل انڈیا لیڈر تھے، مگر چونکہ دلی میں بھی کام کرتے تھے۔ دلی پر ان پانچوں کا اثر تھا۔

دلی میں ان کے ہاتھ پاؤں حسب ذیل حضرات تھے۔ لالہ شنکر لال انشورنس والے۔ لالہ پیارے لال، موٹر والے۔ لالہ ہنونت سہائے۔ لالہ دیش بندھو۔ لالہ جگل کشور کھنہ۔ لالہ اونکار ناتھ۔ مسٹر رگھو نندن سرن۔ ڈاکٹر مہندر سنگھ۔ لالہ رشامنا تھ۔ مولانا عارف ہسوی۔ قاری عباس حسین۔ حافظ عزیز حسن بقائی۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے۔ شیخ محمد تقی وکیل۔ مولانا عرفان۔ مسٹر تاج الدین۔ قطب الدین صدیقی۔ مولانا امداد صابری۔ منشی عبدالقدیر۔ میر مشتاق احمد۔

لالہ دیش بندھو دلی کے لیڈر تو تھے ہی، ملک کے بھی ممتاز آدمیوں میں

www.taemeernews.com

لالہ دیش بندھو گپتا

اُن کا شمار ہوتا تھا۔ روزنامہ تیج کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ ہوائی جہاز کا حادثہ پیش آیا ہے تو جنوبی ہند سے سارے بھارت کے اخباروں کی انجمن کی صدارت کر کے لوٹ رہے تھے۔ بھارت پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے تھے۔ زندہ رہتے تو صوبہ دہلی کے پہلے وزیر اعلیٰ مقرر کئے جاتے۔

ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ اور لالہ شام ناتھ وغیرہ

لالہ اودنکار ناتھ۔ مسٹر رگھو نندن سرن۔ ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ اور لالہ شام ناتھ ایسے کانگریسی ہندو تھے جن پر مسلمان اعتماد کرتے تھے خان بہادر حبیب الرحمٰن دلی میونسپل کمیٹی کی پریسیڈنٹی چھوڑ کر کراچی آنے لگے تو انھوں نے کوشش کر کے اپنے سامنے یدھ ویر سنگھ کو پریسیڈنٹ منتخب کرایا تھا۔ اُن کے بعد شام ناتھ نے پریسیڈنٹی سنبھالی اور یدھ ویر سنگھ صوبہ دہلی کی وزارت میں چلے گئے۔

لالہ اودنکار ناتھ آجکل بھارت پارلیمنٹ کے ممبر ہیں — مسٹر رگھو نندن سرن، لالہ پیارے لال موٹر والے کے فرزند تھے۔ ہوائی جہاز کے حادثہ نے انھیں بھی ختم کر دیا۔ بہت خوب آدمی تھے۔ ہاں ایک صاحب ہیں لالہ رام کشن جاری منہ والے۔ مسٹر سری کشن ایسوشی ایٹڈ پریس آف انڈیا والے کے چھوٹے بھائی۔ یہ پورے گاندھی بھگت ہیں۔

مولانا عارف ہسوی

مولانا عارف ہسوی مرحوم سراپا اخلاص شخص تھے۔ مجھے اُن کے اخلاص کا جس قدر علم ہے، شاید ہی کسی اور کو ہو۔

۱۹۱۴ء میں حکیم اجمل خاں نے اپنے بیٹے حکیم جمیل خاں اور دوسرے

www.taemeernews.com

رشتہ دار بچوں کو انگریزی پڑھانے کے واسطے ایک پرائیویٹ اسکول قائم کیا تھا مولانا نیاز فتحپوری اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نیاز صاحب میرے ہاں مقیم تھے۔ اُن کے بیوی بچوں کو لے کر عارف صاحب فتحپور ہسوہ سے دلی آئے۔ عارف صاحب کے نیاز صاحب سے برادرانہ تعلقات تھے۔ پھر نیاز صاحب تو بھوپال میں ملازم ہوگئے اور اُنھیں میرے سپرد کر گئے۔ عارف صاحب نہایت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ میرا ہفتہ وار رسالہ خطیب ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی نیاز صاحب قلمی امداد کیا کرتے تھے۔ عارف صاحب نے اس کے سیاسی مضامین کا باب اپنے ذمہ لے لیا۔ عارف صاحب بجد تیز اور سخت لکھتے تھے۔ میں تیزی اور سختی کو سمو دیتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہوتا رہا کہ وہ لکھتے رہے اور میں خاموشی سے اُن کے مضامین کی کانٹ چھانٹ کرتا رہا۔

میری خاموشی اور کچھ نہ کہنے سے متاثر ہو کر ایک دن عارف صاحب نے فرمایا۔ افسوس ہے آپ پر ایک نیا بار پڑ گیا ہے۔ مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔ اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ مضامین کے کاٹنے چھانٹنے کی مجھے ہرگز شکایت نہیں ہے۔ میری بھڑاس بہرحال نکل جاتی ہے۔ لیکن آپ کی تکلیف کے خیال سے اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں۔

میں نے کہا۔ میں آپ کے لئے انقلاب کے نام سے ایک نیا ہفتہ وار اخبار جاری کئے دیتا ہوں۔ آپ اُس میں دل کھول کر بھڑاس نکالئے۔ انقلاب

www.taemeernews.com

بحیثیت ایڈیٹر آپ کا نام لکھا جائے گا۔ آپ کے بھائی مولانا ابراہیم حسن اُس کے پبلشر بن جائیں اور حافظ عزیز حسن بقائی اُس کے پرنٹر بقائی صاحب بھی انگریزوں سے لڑنے کے لئے بیچین رہتے تھے۔ چنانچہ انقلاب کا دفتر اور چھاپہ خانہ الگ قایم کیا گیا اور انقلاب کے ذریعہ عارف صاحب نے آزادی سے لکھنے کا کمال دکھایا اور اُردو اخبار نویسی میں انقلاب پیدا کردیا۔

انقلاب فقط تین مہینے زندہ رہ سکا۔ جلیانوالہ باغ کی گولیوں نے اُس کی جان بھی لے لی۔ انقلاب کے پچاس فی صدی خریدار پنجاب میں تھے۔ حکومت پنجاب نے اس کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا اور اُسے اَدھ موا کرڈالا۔

عارف صاحب اب اخباری دنیا میں متعارف ہوچکے تھے۔ دلّی کانگریس کمیٹی نے اخبار "کانگریس" کی ادارت اُن کو دیدی۔ پھر مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے سب ایڈیٹر ہوگئے اور لکھنا اور جیل جانا اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔

عارف صاحب نے دِلّی کے قیام کا بڑا زمانہ میرے مکان میں گزارا۔ قریبًا سترہ اٹھارہ سال وہ میرے مہمان رہے۔ آخر میں پانچ چھ سال سے مولوی عبد الحمید ایڈیٹر رسالہ مولوی کے ہاں رہنے لگے تھے۔

پان عارف صاحب کے کلّے میں دن رات دبا رہتا تھا۔ پان ختم ہوجاتا تھا تو سوتے سوتے آنکھ کُھل جاتی تھی۔ پان کی کثرت سے اُن کے کلّے میں کینسر ہوگیا تھا۔ بہت علاج کئے۔ لیکن کینسر کسے بخشتا ہے۔

www.taemeernews.com

میں ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال میں عارف صاحب کو دیکھنے جاتا تھا تو وہ مجھے اپنا بیماری کے زمانہ کا کلام دے دیا کرتے تھے۔ یہ بڑا عارفانہ کلام تھا۔ افسوس انقلاب ۱۹۴۷ء کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ایک دن کہنے لگے۔ کانگریس سے مولانا محمد علی کے الگ ہو جانے کا مسلمانوں پر اتنا خراب اثر پڑا ہے کہ وہ مجھ تک کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ مگر میں آپ کو گواہ کرتا ہوں کہ میں مسلمان مر رہا ہوں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ عارف صاحب دلی صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔

ایک دفعہ میں مسٹر آصف علی اور مسز آصف علی کے ساتھ عیادت کے لئے گیا تو عارف صاحب کہنے لگے۔ واحدی صاحب! ایک تمنا پوری کر دیجیے۔ آپ کے مکان کے جس کمرہ میں دلی پہنچ کر پہلے دن بٹھایا تھا، اس میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ہاں لے آیا اور مکان کے نیچے کی منزل کی منزل اُنھیں دیدی۔ اُنھوں نے جبوہ سے والدہ اور بیوی وغیرہ کو بلا لیا۔

عارف صاحب کے کیرکٹر کا ایک نمونہ تو وہ تھا کہ اُنھوں نے میرے رسالہ خطیب میں اپنے ضمیر کے خلاف اور معیار سے نیچے اُتر کر لکھنا گوارا نہیں کیا۔ دوسرا نمونہ ایک اور عرض کرتا ہوں۔ ایک دن خدا جانے کون سی سیاسی تقریب تھی۔ اُس تقریب کے سلسلے میں ہندوستان ٹائمز کے نمایندے مسٹر موتی رام[1] عارف صاحب کا پیغام لینے آئے۔ پیغام موتی رام نے مجھے بھی دکھایا۔ وہ عارف صاحب کا

---

[1] موتی رام اب میونسپل کارپوریشن دلی کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔

www.taemeernews.com

مرتے وقت کا پیغام تھا (Dying declaration) مرتے وقت بھی انھوں نے وہی کہا جو زندگی بھر کہتے رہے تھے۔ عارف صاحب ایسے آدمی تھے کہ ہندوستان میں اگر ایک ہندو اور ایک مسلمان بھی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا خواہاں نہ رہتا تو بھی وہ انگریز حکومت کے خلاف ہی رہتے۔

عارف صاحب ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور کسی قیمت پر اتحاد کو توڑنا پسند نہیں کرتے تھے اور اتحاد توڑنے والے ہندو مسلمانوں کو انگریزوں کا گرگا سمجھتے تھے۔ اُن کی رائے صحیح ہو یا غلط مگر حقیقی اور مخلصانہ ضرور تھی۔ اوپری اور دکھاوے کی رائے نہیں تھی۔

عارف صاحب میری ساڑھے چار آدمیوں کی منڈلی کے ممبر تھے۔

مجھے مختلف النوع گروپوں سے واسطہ رہا ہے۔ ایک گروپ وہ تھا جس کے بندھن حضرت خواجہ حسن نظامی تھے۔ اس گروپ کے ہر ممبر سے میرے مراسم رہے۔ لیکن دِل خواجہ صاحب کے بعد صرف بھتیجا احسان الحق سے ملا۔

دوسرا گروپ نیاز فتحپوری کا تھا۔ اُن کی وجہ سے منشی محمد الدین خلیق۔ سید ظفر احسن علوی۔ حکیم مجیب الدین بقائی غریب خانے پر مہینے میں ایک دو دفعہ جمع ہو جاتے تھے۔ اُس گروپ کی یادگار فقط نیاز صاحب باقی ہیں۔ خلیق صاحب اور علوی صاحب بھی ادیب تھے۔

تیسرا گروپ میونسپل کمیٹی کی شرکت سے پیدا ہوا۔ یہ گروپ خان بہادر

حبیب الرحمٰن کا تھا۔ اللہ اللہ کتنے ساتھی دُنیا سے اُٹھ گئے۔

ساڑھے چار آدمیوں کا گروپ جیسے کہہ رہا ہوں، اُس کے چار ممبر مستقل تھے۔ (۱) میں (۲) علامہ راشد الخیری (۳) خواجہ فضل احمد خاں شیدا (۴) مولانا عارف ہسوی۔ اور ایک غیر مستقل۔ قاری عباس حسین۔ قاری صاحب اس منڈلی میں کبھی کبھی آتے تھے اور منڈلی کے آدھے ممبر کہے جاتے تھے۔ ہم چاروں کا ملنا جلنا پچیس برس مسلسل ایسا بے تحاشا رہا کہ شاید کسی کا کسی سے رہا ہو۔

علامہ راشد الخیری اور مولانا عارف ہسوی کی موت منڈلی کے زندہ ممبروں کو بھی مردہ کر گئی۔

ایک صاحب اور قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کا نام سیّد حامد حسین بیدل تھا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی کلکتہ سے دلّی تشریف لائے اور روزنامہ ہمدرد جاری کیا تو انھوں نے اُس کی ایڈیٹری کے لئے مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کو مقرر فرمایا اور منیجری کے لئے مولوی محفوظ علی بدایونی کو، اور کوشش کی کہ باقی عملے میں بھی جہاں تک ممکن ہو دوست ہی بھرتی کئے جائیں۔ سیّد حامد حسین بیدل شاہجہانپوری اس طرح دلّی پہنچے اور پھر دلّی اُن کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ ہمدرد چونکہ کوچہ چیلان سے نکلتا تھا، یہ سب حضرات میرے ہاں پھیرا کرتے رہتے تھے۔

مولانا عبدالحلیم شرر اُردو زبان کے سب سے بڑے ناول نویس مانے جاتے ہیں لیکن اخبار نویسی سے انھیں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مولوی محفوظ علی کا

www.taemeernews.com

ادیبوں میں ایک مقام ہے اور وہ مولانا ظفر علی خاں کی شرکت میں کچھ کاروبار بھی کر چکے تھے مگر روزانہ اخبار کی منیجری شے دیگر ہے اور سید حامد حسین بیدل تو نِرے ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ انھیں دفتری گھس گھس کیسے راس آسکتی تھی۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ اور مولوی محفوظ علی نے خود کہہ دیا کہ ہمارا انتخاب غلط ہوا ہے اور حامد حسین بیدل کو مولانا محمد علی نے جواب دے دیا اور بیدل صاحب دفتر ہمدرد سے دفتر نظام المشایخ میں نہیں، بلکہ میرے گھر میں بہ حیثیت مہمان منتقل ہو گئے۔ پھر تا دمِ مرگ بیدل صاحب کا ہیڈ کوارٹر میرا گھر رہا۔

بیدل صاحب پڑھے لکھے اور ذہین آدمی تھے اور ملک کے ہر پڑھے لکھے اور ذہین آدمی سے اُن کے تعلقات تھے۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام سے لے کر اوسط درجے اور معمولی درجے کے تمام نمایاں لوگوں سے ملنا جُلنا تھا۔ وہ دوستوں کے ہاں اس طرح جایا کرتے تھے جس طرح پیر مریدوں کے ہاں دورے کیا کرتے ہیں۔ کبھی کلکتہ، کبھی بمبئی، کبھی لاہور، کبھی امرتسر، کبھی لکھنؤ کبھی کانپور، اور پھر پھرا کر میرے ہاں آجاتے تھے۔ میرے ہاں کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے کوئی شغل ایسا اختیار نہیں کیا جس سے کمائی ہوتی۔ میں نے قیام کی جگہ دے رکھی تھی، کھانا میرے ساتھ کھاتے تھے، لیکن کپڑا کہاں سے پہنتے تھے۔ ریل کے کرائے کیونکر دیتے تھے، یہ میں نے نہ پوچھا اور

www.taemeernews.com

نہ مجھے آج معلوم ہے۔ غالباً دوست ہی نذرانے دیتے ہوں گے۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتے تھے۔ کرائے کا قصہ خود ایک دفعہ سنایا تھا کہ بمبئی سے دلی بغیر ٹکٹ آرہا تھا۔ راستے میں کسی چھوٹے اسٹیشن پر ضرورتاً اترا اور پکڑا گیا اور اسٹیشن ماسٹر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اسٹیشن ماسٹر باتوں سے ایسا گرویدہ ہوا کہ اُس نے ڈبل کرایہ وصول کرنے کی بجائے درخواست کی کہ چند دن میرے پاس ٹھہریئے۔ جنگل میں اللہ نے نعمت بھیج دی ہے اُسے جلدی نہیں چھٹنا چاہیئے۔

جس طرح اللہ کی مہربانی سے کوئی تحریر کا بادشاہ ہوتا ہے کوئی تقریر کا، اسی طرح لوگوں کو باتیں کرنے کی صلاحیت بھی اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ میری نظر سے بڑے بڑے باتیں کرنے والے گزرے ہیں لیکن بیدل صاحب جیسی دل چسپ باتیں کرنے والا نہیں دیکھا۔ وہ اس فن کے بادشاہ تھے۔ اور اگر تنک مزاجی اُن کے پیچھے نہ لگ جاتی تو بادشاہوں کی مصاحبت کے قابل تھے۔ تنک مزاجی کا سرٹیفکٹ مولانا ابوالکلام نے انھیں اِن الفاظ میں دیا تھا:۔

"بیدل صاحب سے تعلقات کی عمر تین سال! عجیب"

مولانا ابوالکلام حکیم بھورے میاں کے ہاں مقیم تھے۔ نیاز فتحپوری اور بیدل شاہجہاں پوری مولانا سے ملاقات کرنے گئے۔ بیدل صاحب تھوڑی دیر ٹھہرے اور نیاز صاحب زیادہ دیر۔ مولانا نے نیاز صاحب سے سوال کیا۔ بیدل صاحب کو آپ کب سے جانتے ہیں۔ نیاز صاحب نے کہا۔ ہم دونوں واحدی صاحب

www.taemeernews.com

کے مہمان ہیں۔ وہیں میری اِن کی جان پہچان ہوئی ہے"۔ مولانا نے پوچھا۔ واحدی صاحب کے ہاں یہ کب سے ہیں۔ نیاز صاحب نے جواب دیا۔ قریباً تین سال سے۔ مولانا نے کہا:۔

"بیدل صاحب سے تعلقات کی عمر تین سال! عجیب"

تنک مزاجی کا ستم نکل جاتا تو حامد حسین بیدل حامدیار جنگ ہو کر مرتے۔ نہایت معمولی باتوں پر بگڑ جاتے تھے۔

ایک رئیس نے پان پہلے طوائف کو دیدیا اور بیدل صاحب کو بعد میں دیا۔ بیدل صاحب نے پان نہیں لیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے اور منائے نہیں منے۔

شریف خانیوں میں حکیم محمد احمد خاں نمبر اوّل کے تنک مزاج تھے۔ بیدل صاحب اُن سے خفا ہو جاتے تھے اور وہ مناتے تھے۔

باتوں کی دل کشی کا یہ عالم تھا کہ دلی کی ایک شہرہ اور دولتمند مغنیہ بیدل صاحب پر ریجھ گئی اور اپنے بھائی کی مخالفت کے باوجود اُس نے بیدل صاحب سے نکاح کر لیا مگر بیدل صاحب تنک مزاجی کے باعث اُسے بھی نہ نباہ سکے۔ تاہم جو اُن کی تنک مزاجی سہہ جاتا تھا اُس کے وہ مخلص اور سچے خیر خواہ تھے۔ دولت مندوں سے ملنا جلنا تھا لیکن دولت کا رعب نہیں مانتے تھے اور دولت کو عزت کا معیار نہیں سمجھتے تھے۔ مصاحبت کا اہل ہونے کے باوجود مصاحب کہلانے سے چڑتے تھے۔ اہلیت مصاحبت کی تھی اور طبیعت شاہانہ یا درویشانہ تھی۔ روپے کی ضرورت کا لفظ اُنکی

www.taemeernews.com

زبان پر کبھی نہیں آتا تھا۔ باتوں میں رکاکت سے پرہیز کرتے تھے۔ بیدل صاحب کی زندگی میں میرے جن جن حضرات سے مراسم رہے اُن کی صحبتوں میں بیدل صاحب شریک ہوتے تھے۔

خیر ذکر لالہ سیتا کا چل رہا تھا۔ میں کہاں سے کہاں جا نکلا۔ عارف صاحب کے بعد ہندوؤں کے عارف صاحب لالہ شنکر لال تھے، ٹراپیکل انشورنس کمپنی والے عارف صاحب کی مثل۔ بڑی مخلص اور وسیع الخیال۔

لالہ پیارے لال موٹر والے نے کانگریس کو روپے پیسے سے بڑی مدد دی اور باوجود بڑھاپے کے بھاگ دوڑ بھی خاصی کی۔

لالہ ہنونت سہائے کانگریس کا اُس وقت سے کام کر رہے تھے جبکہ دلّی والوں نے گاندھی جی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ ہنونت سہائے مسٹر تلک کے زمانے کے ورکر تھے۔

لالہ جگل کشور کھنہ (وکیل) میرے ساتھ میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے۔ آجکل بھارت کی وزارت دفاع میں جوائنٹ سکریٹری ہیں۔

شیخ محمد تقی (وکیل) نے ہندو مسلم اتحاد کے زمانہ میں خلافت کمیٹی اور کانگریس کی بڑی خدمت کی۔ وکالت چھوڑ دی تھی اور صرف کانگریس کمیٹی کے ہو گئے تھے۔ اب پھر وکالت کر رہے ہیں، دلّی میں ہیں۔

مسٹر تاج الدین۔ مولانا عرفان۔ قطب الدین صدیقی۔ اور قاری عباس حسین

مولانا محمد علی کے خاص لفٹننٹ تھے۔ لفٹننٹ کا لفظ ویسے عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب قریشی کے واسطے بولا جاتا تھا اور یہ دونوں مولانا محمد علی کی رحلت کے بعد ڈاکٹر انصاری کے لفٹننٹ بھی رہے۔ لیکن اُن کے فرائض کچھ اور تھے اور تاج الدین۔ عرفان، قطب الدین اور عباس حسین کے فرائض کچھ اور۔

حافظ عزیز حسن بقائی اور مولانا عبداللہ چوڑی والے یکساں طبیعت کے کارکن تھے۔ نہایت بے باک، نہایت من چلے۔

ہندو مسلم اتحاد کے زمانہ میں ایک وقت ایسا آگیا تھا کہ انگریزوں کے طرفدار ہندو مسلمانوں کو مرنا مشکل ہو گیا تھا۔ دلّی میں ایک مسلمان رئیس مرے تو مسلمانوں نے اُن کی قبر پر پھول چڑھانے کی بجائے پیخانہ پھرا۔ ایک رائے بہادر کی لاش جلانے میں ہندوؤں نے رکاوٹ ڈالی۔ ایک خانبہادر کا جنازہ ہندیوں والے قبرستان سے واپس کیا گیا کہ "خان بہادر" حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے زیر سایہ دفن نہیں ہو سکتا۔ مسلمان اس معاملہ میں ہندوؤں سے پیش پیش تھے اور اس تحریک کے قائد حافظ عزیز حسن بقائی اور مولانا عبداللہ چوڑی والے تھے۔ پہلی قید اُن دونوں نے اسی سلسلہ میں کاٹی تھی۔

حافظ عزیز حسن بقائی اور مولانا عبداللہ چوڑی والے

بقائی صاحب نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کیا اور ہمیشہ لوہے کے قلم سے لکھا۔ تحریر کا رنگ عام بات چیت میں بھی جھلکتا تھا۔ میں سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست اور حافظ عزیز حسن بقائی کی نسبت کہا کرتا تھا۔ کہ بہت

www.taemeernews.com

اچھے دوست ہیں اور بہت تھوڑے دشمن۔

بقائی صاحب کی خالہ میرے ایک پھوپی زاد بھائی سید آغا میرے منسوب تھیں۔ میں بقائی صاحب کو اور بقائی صاحب مجھے بچپن سے جانتے تھے۔ مجھ سے دو چار ہی برس چھوٹے ہوں گے۔ عارف صاحب والے اخبار انقلاب کی چھپائی اُن ہی کے زیر اہتمام کرائی جاتی تھی۔ انقلاب کے اجرا سے قبل بھی میرے کاروبار میں مددگار رہے۔ خواجہ صاحب کے ہاں بھی کافی عرصے رہے۔ لیکن جب تن جاتے تھے تو ہمیں بھی نہیں بخشتے تھے۔

بقائی صاحب کو وہم ہو جاتا کہ اُن سے کوئی بے نیازی برتتا ہے تو اُس کی خیر نہ رہتی تھی۔ مگر نیاز مندوں پر جان فدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔

دوستوں کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والے سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست اور حافظ عزیز حسن بقائی، ایڈیٹر ہیٹیو لکے درجے کے میں نے نہیں دیکھے۔ بقائی صاحب کو سمجھنے کے لئے فقط ایک واقعہ بیان کر دینا کافی ہے۔ بقائی صاحب اوّل سے آخر تک کانگریسی رہے۔ غیر کانگریسیوں میں وہ حضرت خواجہ حسن نظامی کا بہت ادب و لحاظ کرتے تھے لیکن انقلاب ۱۹۴۷ء سے دو تین سال قبل انھوں نے خواجہ صاحب کے خلاف بھی قلم اُٹھایا اور حسب عادت سخت لکھا۔ لکھنا جاری تھا کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آگیا۔ اُس وقت خواجہ صاحب کے بیوی بچے اور سب گھر والے حیدرآباد (دکن) میں تھے۔ دلّی کی شورش زیادہ بڑھی تو خواجہ صاحب کو بھی

www.taemeernews.com

حیدرآباد جانا پڑا۔

حیدرآباد سے خواجہ صاحب نے بقائی صاحب کے پاس خط بھیجا کہ گھر کے لٹنے کی پرواہ نہیں ہے۔ گھر لٹتا ہے تو لٹ جائے مگر قلمی کتابیں بچانی چاہتا ہوں۔ قلمی کتابیں جہاں بند ہیں، آپ جانتے ہیں۔

بقائی صاحب ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں اسپیشل مجسٹریٹ بنا دیئے گئے تھے اور انہیں کانگریس گورنمنٹ نے دو مسلح فوجی سپاہی دے رکھے تھے۔ خط پڑھتے ہی بقائی صاحب اختلاف بھول گئے اور فوراً گلے میں پستول اور کارتوس ڈال اور سپاہیوں کو ساتھ لے بستی نظام الدین اولیا پہنچے اور ساری کتابیں ٹرک میں بھر لائے۔

بقائی صاحب کا مکان مختصر تھا۔ کتابوں کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن انھوں نے خواجہ صاحب کی خاطر مہینوں مکان کی تکلیف برداشت کی۔ کتابیں خواجہ صاحب کی واپسی تک ان کے ہاں رہیں۔

بقائی صاحب کا تعلق حضرت شاہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے تھا۔ درگاہ شاہ باقی باللہؒ کے بقائی صاحب سجادہ نشین تھے۔ اب ان کے فرزند انیس حسن بقائی سجادہ نشین ہیں۔

مولانا عبداللہ چوڑی والے جلسوں اور جلوسوں کو آرگنائز کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ گالیاں دیتے جاتے ہیں اور کام لیتے جاتے ہیں۔ دلی میں کانگریس کا

www.taemeernews.com

اجلاس ہوا تو اس کا منڈوا انھوں نے بنوایا۔ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی چھندواڑہ سے رہائی پاکر آئے تو ان کے استقبال کے وہ منتظم تھے۔

مولانا عبداللہ نے استقبالیہ جلسہ کے لئے گھنٹہ گھر کا چوک تجویز کیا۔ گھنٹہ گھر مرحوم کے گرد خوشنما شامیانہ بندھوایا۔ ریلوے اسٹیشن سے علی برادران عظیم الشان جلوس کی شکل میں گھنٹہ گھر لائے گئے۔ خواجہ حسن نظامی سے ایڈریس پڑھوایا گیا۔

مولانا عبداللہ کو جو سوجھتی تھی انوکھی سوجھتی تھی۔ ایک دفعہ شہر میں کوئی اعلان کرانا تھا۔ مولانا عبداللہ نے تین چار اونٹ فراہم کئے اور اونٹوں پر اعلان کے بورڈ لٹکا دیئے اور اونٹوں کو چاروں طرف پھرا دیا۔ دلی میں اونٹوں کی کثرت نہیں ہے۔ اونٹ جدھر جاتے تھے لوگ اعلان ضرور پڑھتے تھے۔ یہ اعلان خان بہادر کا جنازہ روکنے کا تھا۔

علی برادران کانگریس سے بددل ہوگئے تو مولانا عبداللہ نے بھی کانگریس کو خیرباد کہا اور قائد اعظم مسلم لیگ میں آگئے تو مولانا عبداللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کرلی۔ ۱۹۴۷ء سے کراچی میں ہیں۔ کام لینے کے قابل شخص ہیں مگر یہاں کسی نے کام نہیں لیا۔ تعلیم معمولی ہے مگر دماغ مشیر احمد قدوائی کا سا ہے۔ اور مشیر احمد قدوائی کی طرح بے نیاز۔ کام بڑھئی کہتے نہیں پھر سکتے۔ خالص دہلوی ہیں۔

قاری عباس حسین نے کراچی آکر سرکاری ملازمت کرلی ہے۔ یہ دلی کے

قاری عباس حسین

روزنامہ ہمدرد اور لاہور و لکھنؤ کے متعدد اخباروں کے سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ دس دس اور پندرہ پندرہ ہزار کے مجمع میں تقریریں کرتے تھے۔ علی برادران ہی کے ساتھ انھوں نے بھی کانگریس کو خیرباد کہا اور پھر سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ نون، تیل، لکڑی کی فکر نے انھیں ہندوستانی دواخانہ دہلی کا مینیجر بنا دیا۔ پھر ہندوستانی دواخانہ لاہور کے مینیجر ہو گئے اور اب ریڈیو پاکستان کراچی کے دفتر میں صحیح تلفظ سکھانے پر مامور ہیں۔

قاری سرفراز حسین

عباس حسین کے والد قاری سرفراز حسین علی گڑھ کالج کے مشہور زندہ دل اولڈ بوائے تھے۔ دماغ وہ پایا تھا جس میں بقول مسٹر عنایت اللہ فرزند منشی ذکاء اللہ، چالیس ذہین آدمیوں کا بھیجا تھا۔ قاری سرفراز حسین کو بھی روپیہ کمانے کے لئے ملازمت کرنی پڑی تھی ورنہ صف اول کے ناموروں میں ہوتے۔ ملازمت کے باوجود بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں اور شائع کیں۔ اسلام پر لکچر دینے ایک دفعہ انگلستان گئے اور ایک دفعہ جاپان گئے۔

مولانا امداد صابری۔ میر مشتاق احمد۔ منشی عبدالقدیر اور مولوی حفظ الرحمٰن

مولانا امداد صابری۔ میر مشتاق احمد اور منشی عبدالقدیر بھی پرجوش کانگریسی تھے۔ اور منشی عبدالقدیر تو اب تک کانگریس کا کام کرتے ہیں۔ حالانکہ عمر اسی کے قریب ہے۔ میر مشتاق احمد سوشیلسٹ ہو گئے ہیں۔ صوبہ دہلی کی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ دلی میں آجکل دو مسلمان لیڈروں کا زور ہے۔ ایک مولوی حفظ الرحمٰن کا، دوسرے میر مشتاق احمد کا۔ مولانا حفظ الرحمٰن بھارت پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ مولانا

احمد سعید بوڑھے ہو چکے۔

مولانا امداد صابری ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے فاروڈ بلاک میں چلے گئے تھے۔ اب غالباً گوشہ نشین ہیں اور صرف تصنیف و تالیف کا شغل ہے۔ موٹی موٹی اور پُر از معلومات کتابوں کے مصنف ہیں۔

دلی کانگریس کا مرکز نہیں تھی، یا مرکز تھی تو بس مولانا محمد علی کی صدارت کے زمانے میں تھی۔ مستقل مرکز کانگریس کا الٰہ آباد تھا۔

مہاتما گاندھی - قایداعظم اور لیاقت علی خاں

قایداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کا مرکز دلی کو بنایا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا دفتر فیض بازار میں قایم کیا اور خود بھی نئی دلی میں رہنے لگے اور اُن کے نایب نواب زادہ لیاقت علی خاں بھی دلی آ گئے۔

گاندھی جی کے میں نے دو دفعہ قریب سے درشن کئے۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح کی قریبی زیارت کا مجھے موقع نہیں ملا۔ گاندھی جی سے بھی بات کبھی نہیں ہوئی۔ خواجہ صاحب کے ساتھ گیا اور خواجہ صاحب کی اور گاندھی جی کی باتیں سنتا رہا۔ پہلی دفعہ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں۔ دوسری دفعہ برلا ہاؤس میں۔

ڈاکٹر انصاری کے ہاں وہ برآمدہ گاندھی جی کی نشست گاہ تھا جو ریلوے جمنا کے رُخ ہے۔ ہم پہنچے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے ہمارا خیر مقدم کیا اور خود جا کر گاندھی جی سے اجازتِ ملاقات لائے اور پھر گاندھی جی کے پاس پہنچا آئے۔

گاندھی جی اُس وقت کھانا کھانے بیٹھے تھے۔ کھانا کھاتے ہی میں ہمیں

www.taemeernews.com

بلا لیا گیا۔ گاندھی جی ایک سنٹیل پائی پر تشریف فرما تھے۔ مس سلیڈ، اُن کی انگریز چیلی کھانا پروس رہی تھیں۔ کھانا کیا تھا۔ ایک پلیٹ میں کھجوریں اور ایک پلیٹ میں سنترے کی پھانکیں۔ دونوں خوبصورتی اور سلیقہ سے چُنی ہوئی ایک گلاس میں بکری کا دودھ۔ گاندھی جی کھاتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔

برلا ہاؤس میں ہم جب ملنے گئے تو وہاں بھی فوراً ملاقات ہوگئی۔ وہاں کوٹھی کے اندرونی لان (صحن) میں گاندھی جی مسہری پر لیٹے تھے۔ طبیعت ناساز تھی۔ ڈاکٹر سوشیلا نایر دوا پلا رہی تھیں۔ ناسازیِ طبع کے باوجود گاندھی جی خواجہ صاحب سے خوش طبعی کرتے رہے۔ خواجہ صاحب کی عمر پوچھی۔ خواجہ صاحب نے بتا دی۔ گاندھی جی بولے۔ میری عمر یہ ہے۔ آپ تو ابھی بچے ہیں۔ گاندھی جی خواجہ صاحب سے پانچ سات برس بڑے تھے۔

ڈاکٹر انصاری کے ہاں بھی کسی اہم مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں گاندھی جی کوشش کر رہے تھے کہ سوامی شردھانند شُدھی کا اور خواجہ صاحب تبلیغ کا کام بند کر دیں اور خواجہ صاحب کے پاس اُن کے گھر جاتے تھے اور مولانا محمد علی کے ہاں اُنھیں بُلا بُلا کر سمجھاتے تھے اُس زمانہ کی گفتگوئیں ریکارڈ کر لینے کے قابل تھیں۔ مگر اُن گفتگوؤں کے وقت میں موجود نہیں ہوتا تھا۔ گاندھی جی جب خواجہ صاحب کے گھر جاتے تھے تو اِس کی

www.taemeernews.com

تو مجھے خبر ہی نہ لگتی تھی اور مولانا محمد علی کے ہاں بھی اُن گفتگوؤں میں بغیر بلائے میں کیسے جا سکتا تھا۔ اپنی اور گاندھی جی کی جو گفتگوئیں خواجہ صاحب نے روزنامچے میں لکھ دی ہیں وہ میں نے خواجہ صاحب کی سوانح عمری میں نقل کی ہیں۔

الغرض گاندھی جی سے مجھے براہ راست سابقہ نہیں رہا۔ یا ہاں۔ ایک مرتبہ گاندھی جی کو جب دیکھا تھا، جب ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں وہ کوچہ چیلان تشریف لائے تھے اور مسٹر آصف علی کے مکان میں مولانا احمد سعید اور مولانا حفظ الرحمٰن نے مسلمانوں کے مصایب کی داستانیں اُن کے گوش گزار کی تھیں۔ قاید اعظم سے میرا اتنا بھی ملنا نہیں ہوا۔ قاید اعظم اور گاندھی جی کے متعلق لکھنے کے لئے میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے آپ اُن کی سوانح عمریوں میں نہ پائیں۔

میرا اور نواب زادہ لیاقت علی خاں کا البتہ سُنّی مجلس اوقاف میں ڈھائی برس ساتھ رہا۔ میں اس مجلس کا ممبر تھا اور نواب زادہ صدر تھے۔ نواب صاحب کو مجلس کے کاموں میں عملی حصہ لینے کی فرصت نہیں تھی۔ مسلم لیگ کا کام اُن کے ذمہ بہت تھا۔ تاہم مجلس اوقاف کی صدارت کرنے تشریف لاتے تھے تو اُن کی فراست۔ بُردباری اور قوتِ برداشت کا اندازہ ہوتا تھا۔

قاید اعظم اور نواب صاحب کے ہاتھ پاؤں دلّی میں یہ حضرات تھے۔ شمس الحسن۔ مولانا مظہر الدین۔ شیخ شجاع الحق۔ وحید الدین وکیل۔ نذیر الدین۔ وکیل۔ شیخ عبدالسلام بی۔ اے۔ ڈاکٹر ہاشمی۔ سید عبدالحی جعفری۔

www.taemeernews.com

مسٹر حسین ملک۔ خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ خان بہادر حاجی رشید احمد۔ خان بہادر حافظ محمد صدیق ملتانی۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن۔ ڈاکٹر عبدالغنی قریشی۔ نواب قمر الاسلام۔ حاجی محمد شفیع رنگ والے۔ مولانا عبدالغفار خیری۔ مولانا انوار الحق خیری۔ سید یوسف بخاری۔ مولانا حامد قریشی۔ مسٹر واحد قریشی۔ مولانا ابوالبیان آزاد۔ شیخ منظور الحق۔ مولانا ابوالکمال ماہر۔ سردار علی تائب۔ مولانا عبدالمجید نعمانی۔ ڈاکٹر حسین بخش۔ بھیا عرفان الحق شبلی۔ چوہدری محی الدین۔ مرزا محمد احمد گوٹہ والے۔ نواب محمد ابراہیم کوتانہ والے۔ حاجی محمد عارفین گھی والے۔ فضل احمد کشمیری۔ ضیاء بینرٹ۔

پاکستان کا تصور کا غذ پر لائے علامہ اقبال۔ پاکستان بنا قایداعظم کے ہاتھوں، لیکن جس جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانے کی قایداعظم مسلمانوں کو دعوت دیا کرتے تھے اُسے سلامت رکھا شمس الحسن نے۔

مسٹر شمس الحسن خدا جانے کب سے مسلم لیگ کے آفس سکریٹری ہیں۔ مسلم لیگ پر بڑے بڑے بُرے دن آئے۔ سب مسلم لیگی مسلم لیگ کو چھوڑ گئے اور بھول گئے مگر شمس الحسن مسلم لیگ کا دفتر کسی نہ کسی طرح لئے بیٹھے رہے۔ شمس الحسن مسلم لیگ کو نہ سنبھالتے تو مسلمان ممکن ہے کوئی اور جماعت کھڑی کر لیتے مگر وہ لیگ باقی نہ رہتی جسے نواب مشتاق حسین وقار الملک جانشین سر سید احمد خاں نے قایم کیا تھا اور جس کے پہلے صدر سر سلیم اللہ، نواب ڈھاکہ

اور پہلے آنریری سکریٹری مولوی عزیز مرزا تھے۔

شمس الحسن اب بھی مسلم لیگ کے آفس سکریٹری ہیں اور اب بھی مسلم لیگ سے مایوس نہیں ہیں۔ قاید اعظم کا دور دیکھنے کے بعد وہ شخص کیسے مایوس ہو سکتا ہے جو قاید اعظم سے پہلے کے دور میں مایوس نہ تھا۔[1] میں مسلمانوں کی سیاسی فرقہ بندی کا قایل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک، اور میرے نزدیک کیا، اللہ اور رسول کے نزدیک مسلمانوں کا فرقوں میں بٹ جانا گناہ کبیرہ ہے۔ مسلمان تو خود ایک فرقہ ہیں۔ ایک فرقہ مسلم اور ایک فرقہ غیر مسلم۔ مسلمانوں کو مزید فرقوں میں بٹنا نہ چاہیئے اور مسلم لیگ۔ عوامی لیگ۔ اسلام لیگ وغیرہ لیبل اپنے اوپر نہ لگانے چاہئیں۔ تاہم مسٹر شمس الحسن کے استقلال کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ اتنا مستقل مزاج آفس سکریٹری کانگریس کو بھی غالباً نہیں ملا ہوگا۔

مولانا مظہرالدین اور مولانا عرفان تحریک خلافت کے زمانہ میں مولانا احمد سعید کے جوڑی دار تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند سے بھی یہ تینوں یکساں متعلق رہے۔ پھر مولانا عرفان تو بمبئی چلے گئے اور مولانا شوکت علی کے دست راست بن گئے اور مولانا شوکت علی کی شرکت مسلم لیگ سے قبل انتقال کر گئے

مولانا مظہرالدین، مولانا احمد سعید، مولانا عرفان

---

[1] چنانچہ سردار عبدالرب نشتر کی صدارت سنبھالنے کا مسلم لیگ پر اچھا اثر پڑ رہا ہے اور سردار عبدالقیوم خاں اپنے رنگ میں بڑے تیز جا رہے ہیں۔

اور مولانا مظہرالدین نے قاید اعظم کی قیادت قبول کرلی۔ وہ یو۔پی کے باشندے تھے۔ مسٹر شمس الحسن بھی یو۔پی کے ہیں۔ لیکن قاید اعظم کے دور میں میرے مکان کے قریب آبسے تھے۔ اس لئے اُن سے کچھ واقفیت ہوگئی ہے۔ مولانا مظہرالدین دور رہتے تھے۔ اُن سے صرف علیک سلیک تھی۔ اللہ مغفرت کرے کسی مسلمان کی چھری یا گولی نے اُن کی جوان جان کو سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شہادت کی مانند مولانا مظہرالدین کی شہادت بھی آج تک راز ہے۔

شیخ شجاع الحق قاید اعظم کے دور میں صوبہ دہلی کی مسلم لیگ کے پہلے صدر تھے۔ اُن کے بعد غالباً شیخ عبدالسلام، بی۔اے صدر ہوئے۔ پھر مسٹر وحیدالدین وکیل اور پھر مسٹر قدیرالدین وکیل۔

شیخ شجاع الحق آزاد منش آدمی ہیں۔ دل کی بات بے دھڑک زبان پر لے آتے ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ایسے شخص کو سیاست میں کامیاب نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ کامیاب تھے۔ ۱۹۴۷ء سے کراچی میں ہیں۔ سیاست سے اب واسطہ نہیں ہے۔ موجودہ حالات سے گھٹتے ضرور رہتے ہیں۔ (ابھی حیات ہیں)

شیخ شجاع الحق کے فرزند شیخ منظور الحق سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ دلّی میں مسلم نیشنل گارڈ کے سالار تھے۔ کراچی میں مسلم لیگ سے بیزار ہیں اور عوامی لیگ کے حامی ہیں۔

شیخ عبدالسلام، بی۔ اے بھی کراچی میں ہیں اور بہت اچھی حالت میں ہیں۔ دلی میں بھی گرے پڑے نہیں تھے۔ دلی میں صوبہ مسلم لیگ کے صدر اور میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے۔ پاکستان پہنچ کر انھوں نے پوری توجہ کاروبار پر دی۔ سب قضیوں سے کنارہ کش ہیں اور فقط کاروبار کی کشتی کھے رہے ہیں۔ مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔ دلی کے پنجابی سوداگروں کی برادری کے فرد ہیں۔

مسٹر وحیدالدین اور مسٹر قدیرالدین نے بھی اچھی ترقی کی ہے۔ بحیثیت وکیل ان دونوں کا شمار کراچی کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ اب دونوں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ ان دونوں کے سیاست میں حصہ لینے کا کام ہی نہیں رہا۔ جج ہونے سے پہلے بھی سیاست سے الگ تھے۔

ڈاکٹر ہاشمی کی پریکٹس خوب چل رہی ہے۔ انھیں بھی اب سیاست میں حصہ لینے کی فرصت نہیں ہے۔ ہمہ تن مریضوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی قریشی۔ خان بہادر ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ خان بہادر حاجی رشید احمد اور خان بہادر حافظ محمد صدیق ملتانی کا انتقال ہو گیا۔ خان بہادر حبیب الرحمٰن سیاست سے کنارہ کش ہیں۔ دلی کے تقریباً تمام ہی مسلم لیگیوں نے سیاست سے کنارہ کر لیا ہے۔ سیاست کی دال جوتیوں میں بٹ رہی ہے۔ دلی والے سمجھدار ہیں۔ وہ شاید دلی کی ساکھ کو نہ بگڑنے دینا چاہتے ہوں اور سیاست سے اس لئے دامن بچائے ہوئے ہوں کہ یہاں

www.taemeernews.com

سیاست دامن بچانے ہی کے لایق ہے۔ جو سیاست میں پڑے وہ گندگی میں لتھڑ گئے۔ نواب قمرالاسلام[1]۔ مولانا عبدالغفار خیری اور سید عبدالحی جعفری وکیل کا نام کبھی کبھی سننے اور پڑھنے میں آتا ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ ملک نہیں جاتے۔

مولانا حامد قریشی کا یتیم خانہ دلّی کی طرح قایم ہے۔ مولانا ابوالبیان آزاد کی تسبیں چلتی ہیں۔ مولانا انوارالحق خیری سندھ کے کسی قصبہ میں ہیں اور وہاں کے لیڈر ہیں۔ سید یوسف بخاری بدستور سرکاری ملازم ہیں۔ کاش سید صاحب کو ملازمت کی احتیاج نہ ہوتی اور وہ سیاست اور ملازمت دونوں سے قطع تعلق کر سکتے تو ادب میں کتنا اضافہ کرتے۔ سید صاحب دلّی کے لکھنے والوں میں ہیں۔

مسٹر واحد قریشی روزنامہ انجام میں کام کرنے لگے ہیں۔ حاجی محمد شفیع رنگ والے کا وہی کاروبار ہے جو دلّی میں تھا۔

نواب قمرالاسلام اور حاجی محمد شفیع میرے اتوار کے ساتھی ہیں۔ اتوار کا دن خان بہادر حبیب الرحمٰن کے ہاں جن کے ساتھ گذرتا ہے، اُن میں یہ بھی ہیں۔ نواب قمرالاسلام بھی کاروبار کرتے ہیں۔ دلّی کی پنجابی برادری کا

---

[1] نواب قمرالاسلام اب کراچی میونسپل کارپوریشن کے ممبر ہوگئے ہیں۔

www.taemeernews.com

ہر آدمی کاروبار کرتا ہے۔ دلی اور جالندھر میں نواب قمرالاسلام کی کثیر جائیداد تھی۔ یہاں خالی ہاتھ پہنچے تھے۔ مگر جوان ہیں اور جوان ہمت۔ کاروبار پھر جما لیا ہے اور مطمئن ہیں۔

مولانا ابوالکمال ماہر نے یہاں شکوہ نہیں پایا۔

مولوی عبدالمجید نعمانی کا ۱۹۴۷ء سے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر حسین بخش اور چوہدری محی الدین ۱۹۴۷ء میں بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ سردار علی تائب پاکستان آکر اللہ کو پیارے ہوئے۔

بھیا عرفان الحق شبلی نے بھی کراچی آکر رحلت کی۔ یہ بھیا احسان الحق کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے انتہائی پرجوش ممبر۔ آزادی ملنے کے بعد دلی میں پکڑ لئے گئے تھے اور جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ جیل والوں نے اُن پر ایسی سختیاں کیں کہ جیل سے باہر نکل کر بھی تندرست نہ ہو سکے۔ جیل سے سردار دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر ریاست نے بھاگ دوڑ کر کے رہائی دلوا دی تھی لیکن عرفان کے اعصاب اس قدر کمزور پڑ چکے تھے کہ قائداعظم کے انتقال کی خبر سنتے ہی کسی بیماری کا حملہ ہوا جس نے تڑ پتڑپ جان لے لی۔

مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں سے قبل مجھے سرسید احمد خاں کا ذکر کرنا چاہیئے تھا۔ سید صاحب کا ذکر آ تو چکا ہے لیکن اہلِ قلم کی حیثیت سے زیادہ اور لیڈر کی حیثیت سے کم۔ سید صاحب ہندوستان کے مسلمانوں کے پہلے

www.taemeernews.com

لیڈر تھے۔ اُن کی ذات سے مسلمانوں میں لیڈر کے لفظ کا آغاز ہوا، ورنہ ہندوؤں میں تو لیڈر تھے، مسلمانوں میں لیڈر نہیں تھے۔ مسلمانوں پر مشایخ اور علماء کا اثر تھا۔ مگر انھیں لیڈر نہیں کہا جاتا تھا۔ انگریزی الفاظ مسلمانوں کے لئے شجرِ ممنوع تھے۔ سرسید احمد خاں نے یہ کڑی توڑی اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ تمھارا غم و غصہ اور انگریزوں سے نفرت بیجا نہیں ہے، انگریزوں نے حکومت تم سے چھینی ہے۔ لیکن بہر حال اب انگریز حاکم ہیں۔ ہندو انگریزوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ تم عدم تعاون کئے گئے تو آج انگریزوں کے غلام ہو، کل عدم تعاون کی صورت میں ہندوؤں کا بھی غلام بننا پڑے گا۔ کیونکہ ہندو حکومت میں دخل حاصل کرلیں گے۔ لہذا تمھیں تعاون کرنا چاہیئے اور ہندوؤں کی شل حکومت میں دخل حاصل کرنا چاہیئے۔

سرسید احمد خاں کوچہ چیلان کے پاس اس سڑک کے کنارے رہتے تھے جس کا نام اب سرسید احمد روڈ ہے۔ لیکن اُنھوں نے مسلمانوں کی لیڈری علی گڑھ میں بیٹھ کر کی۔ وہیں کالج کھولا۔ وہیں انگریزی تعلیم کے بُرے اثرات روکنے کے خیال سے کچھ مقبول اور کچھ نامقبول مذہبی کتابیں لکھیں اور وہیں دو قومی نظریئے کی بنیاد ڈالی۔

سرسید احمد خاں انگریز نواز مشہور ہیں اور ۱۸۵۷ء میں تو وہ انگریزوں کے ملازم تھے۔ بجنور میں سب جج تھے۔ مگر اُن کی بیسیوں کتابوں میں ایک

مختصر سی کتاب ہے "اسبابِ بغاوتِ ہند" اُسے پڑھیئے۔ آپ حیران رہ جائیں گے۔

غدر کے بعد انگریزوں کا مزاج بے قابو تھا۔ خصوصاً مسلمانوں سے انگریز بہت خفا تھے۔ سید صاحب نے انگریزوں سے کہا کہ ہوش کی خبر لو۔ حکومت کرنی ہے تو دوسروں کی بجائے اپنی غلطیوں کو دیکھو۔ لو میں گنواتا ہوں تمہاری کیا کیا غلطیاں تھیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا کرایا۔

سید صاحب پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے سر سے کفن باندھ کر حکومت کو للکارا۔ پہلے مسلمان نہیں، پہلے ہندوستانی۔

ساری کتاب یہاں درج نہیں کی جا سکتی۔ مداخلتِ مذہب کے عنوان سے سید صاحب نے جو باتیں اِس کتاب میں لکھی ہیں انھیں کہیں کہیں سے نقل کرتا ہوں۔ سید صاحب کی تکنیک سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے "غدر" بعد کا "کافر مسلمان" کیا کہتا ہے؟:-

"تمام لوگ جاہل اور قابل۔ ادنیٰ اعلیٰ یقین جانتے تھے کہ گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لاوے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ آہستہ ظہور میں آتے ہیں۔ اُسے جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ

www.taemeernews.com

کیا کرتی ہے۔ اس واسطے دفعتًا اور جبرًا دین بدلنے کو نہیں کہتی۔ مگر حقیقتًا جتنا قابو پاتی جائے گی اُتنی اُتنی مداخلت کرے گی۔ اور جو باتیں رفتہ رفتہ ظہور میں آتی گئیں جن کا ذکر آئے گا وہ اُن کے اس شبہ کو زیادہ مستحکم اور مضبوط کرتی گئیں۔ سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کے مثل نابود کردینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو مذہب کے مسائل سے ناواقف کرنے اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر دین سے بے دین کر دے گی۔

۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو لڑکے عیسائی کیے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں گورنمنٹ کے ارادے کا ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔

حکومت کی ابتدا میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی۔ روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ اکثر افسرانِ فوج نے اپنے ماتحتوں سے صرف مذہب کی گفتگو

www.taemeernews.com

شروع کی تھی۔ بعضے صاحب ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آکر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرضکہ اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قایم رہیگا۔

پادری صاحبوں نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال جواب چھپی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنجیدہ مندرج ہوئے۔ ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے وہاں آکر سُنے۔ پادری صاحبان خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ اور میلہ میں جاکر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں تقر انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچی

تھی اور گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا۔

مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور اُن میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بڑے بڑے عالی قدر حکام ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو ان میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور لڑکے عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اِس پر اُن کو انعام ملتا تھا۔

یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو لڑکوں کو داخل کیوں کرتے تھے۔ یہ اعتراض غلط ہے۔ بلکہ یہ تو دلیل ہے ہندوستان کے کمال مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے کی۔ ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا ایسی سخت بات کو جس سے بلا شبہ ان کو دلی رنج اور روحانی غم تھا گوارا کرتے تھے۔

www.taemeernews.com

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ۱۸۵۵ء میں پادری ای۔ ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی۔ ریلوے سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہو گئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی مذہب بھی ایک چاہیئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی ایک مذہب عیسائی ہو جاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے سے خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا۔ جتنے سرکاری نوکر ہیں اوّل ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔

کچھ عجب نہ تھا کہ اسی زمانے میں برہمی اور فساد شروع ہو جاتا مگر لفٹنٹ گورنر بنگال نے جلد خبر لی اور ایک اشتہار جاری کیا، جس سے فی الجملہ لوگوں کے دلوں میں تسلی ہوئی۔ مگر اضطرار کا پورا قلع قمع نہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ بالفعل یہ بات موقوف ہو گئی۔ پھر اور قابو پا کر جاری ہو گی۔

www.taemeernews.com

ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم ورواج کے ادا کرتے ہیں نہ کہ بطور احکام مذہب کے۔ اُن کو اپنے مذہب کے احکام اور عقاید اور اعتقادی باتیں جن پر نجات آخرت کی موافق اُن کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ اُن کے برتاؤ میں تھیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سُست اور بجز چند رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ نہیں ہیں۔ اُن کے سامنے اُن کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیئے برخلاف باتیں ہوا کریں اُن کو غصّہ نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اُن باتوں کو جو نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور اُن احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں اُن کا شریک ہونا قرین قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بلا شبہ حقیقی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا بیجا ہے۔"

www.taemeernews.com

مضمون طویل ہونے لگا۔ حالانکہ میں نے سر سید احمد خاں کے رسالہ اسباب بغاوت ہند کا مذہبی مداخلت والا ٹکڑا بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور جستہ جستہ نقل کیا ہے۔ خیر چلئے آگے چلئے۔

مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کا میں نے لیڈروں میں نام نہیں لیا۔ حالانکہ حضرت مفتی صاحب تو مولانا محمد علی کی صف کے لیڈر رہتے اور مولانا احمد سعید مسٹر آصف علی کی صف کے۔ لیکن ان دونوں کی لیڈری پر اُن کی مفتیت اور مولویت غالب تھی۔ لہذا مشایخ اور علماء کے ذیل میں ان کا ذکر کرتا ہوں۔

مفتی کفایت اللہ

مفتی صاحب شاہجہاں پور (یو۔پی) کے رہنے والے تھے۔ لیکن شاہجہان آباد (دہلی) میں آکر شاہجہاں پور شاید ایک دو دفعہ ہی گئے ہوں گے۔ شاہجہان کی دلی سے اُن کا دل لگ گیا تھا۔ اُنھوں نے اپنی عمر کا دو تہائی حصہ دلی میں بسر کیا۔

مفتی صاحب کے ہم جماعت مولوی امین الدین نے سنہری مسجد چاندنی چوک میں ایک مدرسہ دیوبندی طرز کا کھولا تھا۔ مدرسہ امینیہ۔ اوّل اوّل چار پانچ برس اس مدرسے کے صدر مدرس مولانا انور شاہ (کشمیری) رہے۔ پھر مفتی کفایت اللہ نے اُن کی جگہ سنبھالی اور مولوی امین الدین رحلت کر گئے تو مدرسے کے انتظام کو بھی سنبھالا اور آخر تک نہایت خوش اسلوبی سے مدرسہ چلاتے رہے۔

آجکل مفتی صاحب کے فرزند مولوی حفیظ الرحمٰن مدرسہ امینیہ کے ناظم ہیں۔

www.taemeernews.com

مفتی صاحب اور مولوی امین الدین صاحب دونوں کے مکان میرے گھر کے نزدیک تھے۔ میں شام کو ٹہلنے نکلتا تو روز اس مقدس جوڑی کو پریڈ کے میدان کے راستے سے اپنے محلے کی طرف آتے دیکھتا تھا۔ مفتی صاحب ہمیشہ میرے پڑوسی رہے اور اُن کے دِلّی تشریف لانے کے بعد سے ۱۹۵۲ء تک میں نے اُنھیں مسلسل دیکھا اور قریب سے دیکھا۔ علم کی جگہ علم۔ فراست کی جگہ فراست اور مومنانہ فراست۔ توکّل۔ قناعت۔ سادگی۔ وضعداری۔ پابندیٔ سُنّت کون سی خوبی ہے جو مفتی کفایت اللہ میں نہ تھی۔ کم بولتے تھے۔ مگر بولتے تھے تو بولنے میں وزن ہوتا تھا۔ خواص پر اُن کا اثر تھا۔ عوام پر اُن کا اثر تھا۔ سیاسیین پر اُن کا اثر تھا۔ حکیم اجمل خاں اپنی مجلس اور اپنے مطب میں کسی کی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن مفتی صاحب کے لئے کھڑا ہوتے میں نے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ پنڈت مدن موہن مالوی سے ہندو مسلم سوال پر مفتی صاحب سرگرمِ گفتگو تھے۔ یہ جب کا واقعہ ہے جب دلّی میں کانگریس کا اجلاس ہوا ہے اور مالوی جی نے اُس کی صدارت کی ہے۔ گفتگو میں کوئی نوخیز ہندو لیڈر مفتی صاحب سے اُلجھنے لگا۔ مالوی جی نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ تم جانتے نہیں، کس سے گفتگو کر رہے ہو۔

مالوی جی مفتی صاحب کو خوش کرنے کے لئے نوخیز لیڈر پر نہیں برسے تھے۔ مفتی صاحب سے معاملہ کی بات کرنا ہر کس و ناکس کے بس کا تھا ہی نہیں۔

www.taemeernews.com

مفتی صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملائے رکھنے کی کوشش میں نمبر ایک کا حصہ لیا۔ مگر جب یہ کوشش بارآور ہوتی نظر نہ آئی تو سیاست سے دست بردار ہوگئے اور زبان پر قفل چڑھا کر بیٹھ گئے۔ نہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی طرح مسلم لیگ کے کیمپ میں آئے اور نہ مولانا ابوالکلام اور مولانا حسین احمد کی طرح تقسیم ملک کی مخالفت کی۔

مفتی صاحب جس وقت مدرسہ امینیہ کی صدر مدرسی کرنے آئے ہیں، وہ مدرسہ کا ابتدائی وقت تھا۔ مدرسے کی مالی حالت کمزور تھی۔ مفتی صاحب نے صرف بیس روپے ماہوار پر کام شروع کردیا۔ یہ ۱۳۲۳ ہجری کی بات ہے۔ پھر تنخواہ بڑھتے بڑھتے دو سو پچاس تک پہنچ گئی۔ ۱۳۳۰ھ میں مدرسے کی مجلس منتظمہ نے پچیس روپے کا اور اضافہ کیا۔ مفتی صاحب اضافے کے پچیس روپے لے تو لیتے تھے مگر بطور چندہ مدرسے کو واپس دیدیتے تھے اور کہا کرتے تھے مجھے ڈھائی سو کافی ہیں۔

جب چالیس روپے تنخواہ تھی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے پانچ سو روپے پر بلایا گیا تھا۔ فرمایا۔ وہاں ضمیر آزاد نہیں رہے گا اور اس سے دین کی خدمت میں رکاوٹ پڑے گی۔ انکار لکھ بھیجا۔ حکیم اجمل خاں نے ریاست حیدرآباد سے منصب مقرر کرا دیا تھا مگر مفتی صاحب نے اس کا اجرا نہیں کرایا۔

مفتی صاحب کے ایک نایب مفتی صاحب سے دو قدم آگے تھے۔ مولانا

www.taemeernews.com

مدرسہ امینیہ

ضیاء الحق اُن کا نام تھا۔ مولانا ضیاء الحق۔ مفتی صاحب۔ مولوی امین الدین ؛
صاحب اور مولانا انور شاہ صاحب سب ایک ساتھ دیوبند سے فارغ التحصیل
ہوئے تھے۔ مولوی امین الدین نے مدرسہ کھولا تو مولانا انور شاہ کو صدر مدرس ؛
بنایا اور مولانا ضیاء الحق کو مدرس دوم۔ مولانا ضیاء الحق مولانا محمد انور شاہ ا
کے زمانے سے مفتی صاحب کے بعد تک مدرس دوم رہے۔ پورے اٹھاون ؛
سال لگاتار مدرسے کی خدمت کی۔ ابتداءً خوراک کے واسطے چار یا پانچ آنے د
روزانہ لے لیا کرتے تھے۔ چار سال یونہی گزار دیئے۔ پھر بارہ روپے ماہوار
لینے لگے۔

مفتی صاحب کی عدم موجودگی میں مدرسے کی صدر مدرسی اور مدرسے ؛
کا اہتمام مولانا ضیاء الحق کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ ۱۳۲۶ھ میں تنخواہ پندرہ روپے ؛
ہوگئی تھی، مفتی صاحب تحریک خلافت کے سلسلے میں جیل چلے گئے اور جیل ؛
سے مولانا کو لکھا کہ اب ستر لیا کیجیے۔ مولانا نے جواب دیا:۔

"بچپن سے پندرہ کر دینے کے بعد اب آپ پانچ روپے اور بڑھانے
چاہتے ہیں۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ بچپن ہی روپے پر کام کیے
جاؤں۔ قویٰ میں اتنا ضعف آگیا ہے کہ میں اپنے آپ کو پندرہ
روپے کا بھی مستحق نہیں سمجھتا۔"

یہ ایسے حضرات تھے جن کے ذکر سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

مولانا احمد سعید مفتی کفایت اللہ کے شاگرد ہیں۔ لیکن مولانا مدرسہ امینیہ سے جس وقت فارغ التحصیل ہوئے تھے تو جوان تھے۔ مفتی صاحب سے کچھ ہی چھوٹے۔ پھر میدان سیاست میں مفتی صاحب اور مولانا ایک ساتھ تشریف لائے۔ اس لئے مفتی صاحب مولانا سے دوستوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ گو مولانا، مفتی صاحب کو ہمیشہ استاد ہی سمجھا کئے۔

مولانا احمد سعید قریباً میرے ہم عمر ہیں۔ بچپن میں، میں، وہ، اور قاضی ملیت الحق حقی ساتھ کھیلے ہیں۔ پھر مجھے عربی پڑھنے کا شوق ہوا تو چند دن میں نے اُن سے پڑھا بھی۔

مولانا احمد سعید متحدہ ہندوستان کے بہترین مقرروں میں ہیں۔ قوم نے انھیں سحبان الہند کا خطاب دیا ہے۔ دِلّی کی ٹھیٹ زبان میں اُن جیسی تقریر کوئی اور نہیں کر سکتا۔ دوسرا نمبر اس اعتبار سے مسٹر آصف علی کا تھا۔ وہ بھی اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ اُردو کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ آصف علی اُردو میں انگریزی کے الفاظ نہیں لاتے تھے۔ سُنا ہے یہ وصف مسز وجے لکشمی پنڈت میں بھی ہے۔ وہ اُردو بولتی ہیں تو انگریزی کی آمیزش مطلق نہیں کرتیں۔

مولانا احمد سعید بڑے بے تکلف اور شگفتہ انسان ہیں۔ اُن کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی سے دوسروں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اُن کی زبان گدگدیاں بھی کرتی ہے اور چٹکیاں بھی لیتی ہے۔ جنگ آزادی کے کمانڈروں

میں تھے لیکن آزادی ایسی ملی کہ اُس نے اُنھیں مرجھا دیا اور ساکت اور ساکن کر دیا۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی ہے۔ اب مولانا کا بالکل ڈھیر ہو گیا ہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ بس مولانا احمد سعید کے دم تک دلّی میں دہلویت برقرار ہے۔

مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کے دور سے قبل میری نو عمری میں

میاں نذیر حسین

حضرت میاں نذیر حسین، محدث، زندہ تھے۔ گلی ہینگا بیگ، پھاٹک حبش خاں میں اُن کا مدرسہ تھا اور میری نوجوانی میں مولانا محمد حسین فقیر۔ مولانا کرامت اللہ۔ اور مولانا عبدالعلی کا دور دورہ تھا۔

میاں نذیر حسین اور مولانا عبدالعلی کا مشغلہ ہمیشہ درس و تدریس رہا۔ مولانا محمد حسین فقیر اور مولانا کرامت اللہ وعظ و تلقین کرتے تھے۔

مولانا کرامت اللہ کا مدرسہ حسین بخش میں جمعہ کے جمعہ وعظ ہوتا تھا۔

مولانا محمد حسین فقیر۔ مولانا کرامت اللہ۔ مولانا عبدالعلیٰ

اور مولانا محمد حسین فقیر نے خود مدرسہ بنایا تھا، وہ اُس میں وعظ کہتے تھے۔ دونوں مدرسے آمنے سامنے ہیں۔ جامع مسجد سے جو سڑک محلہ مٹیا محل کو جاتی ہے، اُس کی دائیں طرف کی گلی میں مدرسہ حسین بخش ہے اور بائیں طرف کی گلی میں مدرسہ محمد حسین فقیر۔

میاں نذیر حسین فرقہ اہل حدیث کے پیشوا اور امام تھے۔ علمی دُنیا میں اُن کا شہرہ تھا۔ مولانا عبدالعلی کے علم و فضل اور تقدس کی بھی دھاک تھی۔ مولانا عبدالعلی مدرسہ مولوی عبدالرب میں صدر مدرس تھے۔ مولانا

www.taemeernews.com

عبدالعلی اور مولوی عبدالرب حنفی تھے۔

وعظ کہنے میں مولوی عبدالرب کا جواب نہیں تھا۔ میاں نذیر حسین مولوی عبدالرب کے بہنوئی تھے۔ مولوی عبدالرب کی بھتیجی، یعنی مولانا راشد الخیری سگی پھوپی، ڈپٹی نذیر احمد سے منسوب تھیں[1]۔

مندرجہ بالا چار مدرسوں کے علاوہ دینیات کے اور بھی کئی مدرسے تھے۔ مثلاً مدرسہ فتحپوری سب سے پرانا مدرسہ تھا[2]۔

مولانا محمد حسین فقیر کے بیٹوں نے باپ کا نام زندہ رکھا۔ مولانا عبدالرحمٰن راسخ اور مولانا ابراہیم تو باپ سے کم نہیں رہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا اسحٰق بھی دلی کے ممتاز واعظ تھے۔ اب مولانا اسحٰق کے فرزند مولانا زبیر اپنے دادا کے مدرسہ کو چلا رہے ہیں اور دادا کے صحیح جانشین ہیں۔ مولانا زبیر اچھے واعظ ہیں، اور انھوں نے انگریزی بھی بی۔ اے تک پڑھی ہے۔

میاں نذیر حسین اور مولانا عبدالعلی کی نسل میں کوئی اُن جیسا نہیں ہوا۔ میاں نذیر حسین کے نواسے مولانا عبدالرؤف بانی نذیریہ لائبریری بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

---

[1] مولانا راشد الخیری کے پھوپا ڈپٹی نذیر احمد اور ڈپٹی نذیر احمد کے پھوپا میاں نذیر حسین۔

[2] اب بھی ہے۔ آجکل مولانا سجاد صاحب اس کے صدر مدرس ہیں۔

www.taemeernews.com

مولانا کرامت اللہ کے داماد جو دلی کی سنہری مسجد میں پیش امام تھے انھیں کراچی میں عاشق رسول اشرف خاں نے اپنی تعمیر کردہ موتی مسجد کا امام بنالیا تھا۔

اشرف خاں ایک بے پڑھے لکھے بزرگ تھے۔ صوبہ دلی کے گڑگاؤں کے رہنے والے۔ ساٹھ پینسٹھ برس سے دہلی میں آبسے تھے۔ میرے مکان کی سامنے کی گلی میں۔ انھیں عاشق رسول میں اس لئے کہتا ہوں کہ واقعی عاشق رسول تھے۔ رسول، بلکہ آلِ رسول کا نام سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں کا دریا بہانے لگتی تھیں۔

خان صاحب کو مسجدوں کی خدمت کا شوق تھا۔ قابل بھروسہ شخص تھے۔ لوگ مسجدوں کے لئے انھیں بے دریغ روپیہ دیتے تھے اور وہ ایک ایک پیسہ مسجدوں پر خرچ کردیتے تھے۔ کراچی میں بھی اپنے جاننے والوں کی مدد سے وہ ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کر گئے ہیں۔ موتی مسجد اس کا نام ہے۔

خیر ذکر مولانا کرامت اللہ کا ہو رہا تھا۔ مجھے مولانا کرامت اللہ سے خاص لگاؤ تھا۔ پاکیزہ صورت۔ موزوں قدوقامت۔ مناسب تن و توش۔ اُجلا لباس۔ جب میں نے ان کے وعظ میں جانا شروع کیا ہے تو عمر چالیس پچاس کے درمیان تھی مگر از راہ انکسار جھک کر چلتے تھے۔ مجھے ان کی مجلس وعظ پر نور کا مینہہ برستا محسوس ہوتا تھا۔

www.taemeernews.com

مشایخ میں حضرت مولانا شاہ ابوالخیر نقشبندیؒ۔ حضرت مولانا محمد عمر اخوندجی قادریؒ۔ حضرت میاں امیر حسین چشتی صابریؒ۔ حضرت میاں عبدالصمد چشتی نظامی فخریؒ قابل ذکر ہیں۔

میاں امیر حسین مشایخ دہلی میں، بلکہ مشایخ ہند میں سب سے زیادہ معمر تھے۔ اُن کی گدّی معمولی سی تھی، لیکن کم از کم سلسلۂ صابریہ کا بڑے سے بڑا گدّی نشین اُن کی اہمیت مانتا تھا۔ ہر گدّی نشین اُن کے تجربوں اور مشوروں سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ باوجود بڑھاپے کے ذی عقل اور ذی ہوش تھے۔

میاں امیر حسین کی صابری گدّی نشینوں میں وہ حیثیت تھی جو ہز ہائی نس نواب سرامیرالدین فرخ مرزا والیِ ریاست لوہارو کی متحدہ ہند کے نوابوں اور راجاؤں میں تھی۔ لوہارو ریاست کچھ بھی نہیں تھی، لیکن اوّل درجہ کے نواب اور راجہ سرامیرالدین سے متاثر تھے۔ کوئی چچا کہتا تھا کوئی ماموں اور انگریز حکومت نے بھی اُنھیں اوّل درجہ کے اعزاز و خطابات دے رکھے تھے۔ سات ضرب توپ کی سلامی تک دی جاتی تھی۔

میاں امیر حسین کے پڑپوتے میاں صابر حسین اب صابریہ درگاہ کے سجادہ نشین ہیں۔ صابر میاں نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں درگاہ کا رہنا ترک نہیں کیا تھا۔ حالانکہ فیض بازار (دریا گنج) جہاں یہ درگاہ ہے بے حد خدشہ کی جگہ تھی۔ اس اعتبار سے مولانا عبدالسلام نیازی اور مولانا لقاءاللہ پانی پتی کے ساتھ ان کا نام لیا جائے گا۔

www.taemeernews.com

میاں کرار حسین

صابر میاں کے والد میاں کرار حسین میرے لڑکپن کے ساتھی تھے۔ جس دن میونسپل کمیٹی کی ممبری کے ووٹ پڑنے لگتے تھے میاں کرار حسین میری درخواست کے بغیر میرے خیمہ کے دروازہ پر آ بیٹھتے تھے تاکہ لوگوں کو اُن کا اور میرا تعلق یاد رہے۔

اس خاندان سے میرے خاندان کا گہرا تعلق ہے۔ آخری فوجدار، میر نجف علی خاں میاں صابر بخشؒ کے مرید تھے۔ صابر بخش صاحب نے انتقال کے وقت اپنے فرزند میاں سید عبداللہ کو میر نجف علی کے سپرد کیا تھا۔ میاں عبداللہ اس وقت دس بارہ برس کے ہوں گے۔ سنا ہے کہ میاں عبداللہ ناشتہ کرتے یا کھانا کھاتے تو میر نجف علی ہاتھ باندھ کر دو زانو پیر کے فرزند کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ اور اسی ادب اور تعظیم سے اور باتوں کی نگرانی فرماتے تھے۔

دریا گنج میں جو ترکاری کی منڈی ہے میر نجف علی خاں ہی نے درگاہ صابر بخش کے اخراجات کے واسطے نذر کی تھی۔

میاں امیر حسین میاں عبداللہ کے بیٹے تھے اور میاں صابر بخش کے پوتے۔ میر نجف علی کے پوتے حافظ سید عبدالوہاب کے ساتھ میاں امیر حسین کا برتاؤ میں نے دیکھا ہے۔ حافظ صاحب میرے دادا کے سگے ماموں زاد بھائی بھی تھے اور داماد بھی تھے۔ وہ ہر عید پر خاندان کے سب چھوٹوں بڑوں کو جمع کر کے درگاہ صابر بخش میاں امیر حسین کے پاس لے جاتے تھے۔ میں بھی

ہوتا تھا۔ حافظ عبدالوہاب میاں امیر حسین سے بہت زیادہ چھوٹے نہیں تھے لیکن میاں امیر حسین جہاں بچوں اور جوانوں کو دو دو پیسے عیدی دیتے تھے: ہاں سفید بگلا سی ڈاڑھی والے حافظ عبدالوہاب کو بھی دو پیسے دیتے تھے اور حافظ صاحب انہیں سمجھایا کرتے تھے کہ یہ پیسے خرچ مت کرنا۔ کاغذ میں لپیٹ کر دوسرے پیسوں کے ساتھ رکھ دینا۔ اِن سے برکت ہوگی۔

میاں امیر حسین اور حافظ عبدالوہاب کے انتقال کے بعد میاں کرار حسین نے بھی غالباً اس وضع کو ترک نہیں کیا تھا اور شاید اب بھی وضع جاری ہے۔ مگر عیدی لینے والے اب دلی میں ہی کے۔ میاں صابر حسین موجودہ سجادہ نشین درگاہ صابر بخش کراچی تشریف لائے تو مجھ سے بھی ملنے آئے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے۔ آنکھوں سے آنسو نہیں تھما اور زبان سے لفظ نہیں نکلا۔

میاں کرار حسین پُرانی طرز کے مشایخ کا دلی میں آخری نمونہ تھے۔

میاں عبدالصمد

میاں امیر حسین کے معاصر مشایخ میں سب سے چھوٹے میاں عبدالصمد تھے۔ اُن کی سُوجھ بُوجھ کا بھی دلی میں چرچا تھا۔ میاں عبدالصمد، ابوظفر بہادر شاہ (آخری مغل شہنشاہ) کے پیر حضرت میاں کالے صاحب کے نواسے تھے۔ حویلی کالے صاحب ضبط ہونے کے بعد سے یہ خاندان کوچہ پنڈت میں رہتا ہے۔ میاں عبدالصمد کے فرزند اور سجادہ نشین حاجی میاں اب بھی وہی ہیں۔ اِن کی درگاہ بانس کولی (نئی دلی) میں ہے۔

شاہ ابوالخیر

شاہ ابوالخیر کی خانقاہ ترکمان دروازہ کے قریب تھی اور ہے۔ شاہ صاحب کے فرزند و سجادہ نشین زید صاحب دلّی میں ہیں۔ شاہ ابوالخیر کا افغانستان تک رسوخ تھا۔ ۱۹۰۷ء میں حبیب اللہ خاں، امیرِ افغانستان ہندوستان تشریف لائے تو دِلّی میں اُنھوں نے شاہ ابوالخیر کی خدمت میں حاضری دی تھی۔

شاہ ابوالخیر جلالی درویش تھے۔ پٹھانوں کی عقیدتمندی نے انھیں اور بارعب بنا دیا تھا۔ باہر نکلتے تو ساٹھ ستر پٹھان جلو میں ضرور ہوتے۔ خانقاہ کے دروازہ پر بھی پٹھانوں کا پہرہ رہتا تھا۔ دِلّی والے شاہ ابوالخیر سے بڑا حسنِ ظن رکھتے تھے۔ حسنِ ظن باقی تینوں کے ساتھ بھی تھا۔ بُرا کسی کو نہیں کہا جاتا تھا۔

میں نے اوپر فقط اُن علما و مشایخ کا تذکرہ کیا ہے، جن کی خانقاہیں درگاہیں اور مدرسے تھے۔ ان کے علاوہ میرے زمانہ کی دِلّی کے اور علما و مشایخ بھی ہیں۔

مولانا شاہ امیر حمزہ

مثلاً مولانا شاہ امیر حمزہؒ۔ یہ عالم بھی تھے اور درویش بھی تھے۔ ہندو کالج (دلّی) میں مدتوں عربی کے پروفیسر رہے۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کے خلیفہ تھے۔

مولانا ناصر جلالی۔ مولانا حامد جلالی۔ مولوی شرف الحق

اُن کے صاحبزادگان مولانا ناصر جلالی اور مولانا حامد جلالی کا بھی دِلّی کے ممتاز لوگوں میں شمار تھا۔ اب یہ دونوں کراچی میں ہیں۔ مجھے مولانا امیر حمزہؒ کے ماموں زاد بھائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔

ایک بڑے اچھے واعظ مولوی شرف الحق تھے۔ مولانا امداد صابری کے والد ماجد۔ مولوی شرف الحق نے دیوبند میں تعلیم پائی تھی اور مولانا امیر حمزہ کے

پیر بھائی تھے۔

مولوی کرامت اللہ بھی حاجی امداد اللہ کے مرید تھے۔ اور غالباً خلیفہ بھی
ایک ممتاز عالم مولانا عبدالحق حقانی تھے۔ جن کی تفسیر حقانی ہے۔
ایک جید عالم مولانا محمد اسحاق رامپوری تھے۔ ان کا مفصل حال گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

اور صاحب! ڈپٹی نذیر احمد کے عالم ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے قرآن مجید کا ترجمہ اور الحقوق و الفرائض وغیرہ اُن کے علم و فضل کی یادگاریں ہیں۔ اُن کا ذکر بھی گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔ عربی اور اُردو دونوں زبانوں پر اُنہیں عبور تھا۔

دِلّی کے خواجگان کا، بجز حضرت خواجہ باقی باللہ کے، سجادہ نشین نہیں ہوا کرتا۔ چھوٹی چھوٹی درگاہوں کے سجادہ نشین ہیں۔ بڑی درگاہوں کے سجادہ نشین نہیں ہیں۔ بڑی درگاہوں میں صرف حضرت خواجہ باقی باللہ کے سجادہ نشین تھے۔ پیر جی سید مظفر علی۔ پھر حافظ سید عزیز حسن بقائی (مدیر رسالہ پیشوا) اس درگاہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ اب امیر حسن بقائی ہیں۔

درگاہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے متولی پچاس سال پہلے میر قاسم علی کلیمی تھے۔ پھر عبدالغنی کلیمی رہے۔ آجکل اس درگاہ کی تولیت کے فرائض

---

(۱) ... درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا سجادہ نشین منتخب کیا ہے۔

www.taemeernews.com

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی (مدیر رسالہ آستانہ و اخبار پیام مشرق) انجام دیتے ہیں۔

اوہو، دلی کے دو عالم تو رہے ہی جاتے ہیں۔ مولانا عبدالسلام اور مولانا محمد ایوب۔

مولانا عبدالسلام

مولانا عبدالسلام کی پیدائش میرٹھ کی ہے۔ لیکن مولانا نے عمر دلی میں بسر کی ہے۔ دلی والوں سے بڑھ کر دلی والے ہیں۔ دیو بند کے فارغ التحصیل اور بریلی کے نیاز بیہ سلسلہ میں بیعت۔ بریلویت دیو بندیت پر غالب ہے۔

مولانا عبدالسلام کے معتقد اور احباب مولانا سے محبت کرتے ہیں۔ تنہا دم ہے۔ بیوی بچوں کا بکھیڑا نہیں پالا۔ عطر کی تجارت کرکے ضرورت کے لائق روپیہ کما لیتے ہیں اور آزادانہ زندگی گزارتے ہیں۔ نیازمندوں کے نیازمند۔ فرعونوں کے لئے موسیٰ۔

مولویت یا درویشی کے بھی پابند نہیں ہیں۔ اس کے باوجود مولویت اور درویشی اُن کی تسلیم کی جاتی ہے۔ شاعر بھی ہیں۔ آزاد تخلص کرتے ہیں۔

دلی کے جس محلہ میں رہتے ہیں۔ وہ محلہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ لیکن یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمان خدمت کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندو اور سکھ شرنارتھی خدمت کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے آنکھوں میں پانی اترنے لگا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آنکھوں نے بالکل جواب دے دیا۔ اب

www.taemeernews.com

آنکھیں بنوائی ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے معقول انہی سے پڑھی تھی۔

مولانا محمد ایوب مولانا محمد اسحاق رامپوری کے شاگرد ہیں۔ مولانا محمد اسحٰق نے ساٹھ برس لوگوں کو پڑھایا۔ مدرسہ نذیریہ کے طلباء نے ممکن ہے اُن سے کچھ سیکھا ہو۔ لیکن مولانا محمد اسحاق کے تمام گھریلوشاگرد میری طرح کورے رہے۔ میں بھی مولانا محمد اسحاق کا شاگرد ہوں اور مولانا محمد ایوب سے پہلے کا شاگرد ہوں۔

مولانا محمد ایوب تنہا شخص ہیں جنھوں نے مولانا محمد اسحاق سے پورا فیض پایا اور ایک چیز تو ایسی حاصل کر لی کہ اُس میں مولانا محمد اسحاق پر فوقیت لے گئے۔ مولانا محمد اسحاق قرآن، حدیث، فقہ سب علوم میں یکتائے روزگار تھے۔ لیکن منطق اور فلسفہ وحکمت اُن کا خاص مضمون تھا۔ منطق اور فلسفہ وحکمت کا اُنھیں اسپیشلسٹ (Specialist) کہنا چاہیئے۔ مولانا محمد ایوب نے بھی منطق اور فلسفہ وحکمت میں کمال پیدا کیا ہے۔

منطقیوں کا دماغ عموماً مذہب کے خلاف چلا کرتا ہے۔ لیکن مولانا محمد اسحٰق منطق سے اسلام کی تائید کا کام لیتے تھے۔ مولانا محمد ایوب کی بھی یہی روش ہے اور اس روش پر چلنے کے، مولانا محمد ایوب کو مولانا اسحٰق سے زیادہ مواقع ملے ہیں۔

مولانا محمد ایوب تیئیس سال کے تھے جب پہلی دفعہ حکیم علی رضا خاں کی

www.taemeernews.com

تلاش کرتے میرے ہاں پہنچے۔ حکیم صاحب کسی مریض کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ اُس دن سے ۱۹۴۷ء تک دِلّی میں چھبیس ستائیس برس مسلسل مولانا محمد ایوب مجھ پر کرم فرماتے رہے۔

مولانا محمد ایوب جب بولتے ہیں تو گھنٹوں بولتے ہیں۔ اب ساٹھ سال سے اوپر عمر ہے۔ تقریباً چالیس سال سے بول رہے ہیں اور چالیس سال میں بلا مبالغہ چھ سات ہزار تقریریں کر چکے ہیں۔ مشق کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

علمی اور دقیق مضامین ایسی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں کہ بے پڑھے لکھے مسلمان اور اسلام سے ناواقف غیر مسلم سمجھ لیتے ہیں۔ دلّی میں ایک ہندو صوفی ہیں۔ پنڈت تیلو رام۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں اُن کا ذکر کر چکا ہوں۔ پنڈت جی بھی مولانا محمد ایوب کی تقریریں سننے آتے تھے۔ یکایک آنا بند کر دیا۔ میں نے سبب پوچھا۔ بولے۔ ایمان سرکنے لگا تھا اور اس کے لئے دل تیار نہیں ہے۔

مولانا کی تقریریں سننے سے اسلام کے متعلق کوئی شک شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ بولنے کی طرح لکھنے کا چسکہ نہیں ہے[۱]۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے امام غزالیؒ کا سا دماغ عطا کیا تھا۔ کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ ہو تو وہ مولانا محمد ایوب کی تقریریں

---

[۱] اب لکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔

سُن لے اسے اپنی عقل کی بے بضاعتی کا پتہ لگ جائے گا۔ مولانا محمد ایوب کی عقل کی دست رس ہر بڑی عقل کی دست رس سے آگے ہے۔ مولانا عقل و عرفان کے سمندر میں اس تہ تک پہنچ جاتے ہیں جہاں بڑے بڑے مدعیانِ عقل نہیں پہنچ سکتے۔

مجھے مولانا محمد ایوب کی تقریروں سے بے حد فائدہ پہنچا ہے۔ میں اُن کے اِس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ اللہ نے مذہب کی طرف متوجہ فرمایا تھا، مولانا محمد ایوب کی تقریریں سنوا کر ایمان مستحکم کر دیا۔ مولانا محمد ایوب مجھ سے دس برس چھوٹے ہیں، لیکن میں اُنھیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ میری تحریر میں تھوڑی بہت کوئی بات ہے تو وہ خواجہ حسن نظامی کی پچاس سالہ ہم نشینی کا نتیجہ ہے اور کسی قدر غور و فکر کرنا مجھے آیا ہے تو مولانا محمد ایوب کی چالیس سالہ صحبت سے آیا ہے۔

مولانا محمد ایوب نے مولویت کو پیشہ نہیں بنایا ہے۔ دلّی میں پُرانی ساڑھیوں کی تجارت کرتے تھے۔ کراچی میں بھی کپڑے کی دکان ہے۔ دلّی میں میرے علاوہ حکیم علی رضا خاں اور نواب فیض احمد خاں[1] کے دیوان خانے میں تقریریں کیا کرتے

---

[1] نواب فیض احمد خاں کا دیوان خانہ حکیم اجمل خاں کے دیوان خانے کے بعد میرے زمانہ کی دلّی کا سب سے اہم دیوان خانہ تھا۔ اس میں مولانا محمد ایوب کی تقریریں

(باقی صفحہ ۳۳۰ پر)

www.taemeernews.com

تھے، کراچی میں ایک اتوار بیچ جناب اسد ملتانی کے ہاں تقریریں ہوتی ہیں۔

(صفحہ ۳۲۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) ہی نہیں ہوتی تھیں مسلمانوں کی تقدیر کے فیصلے بھی ہوتے تھے۔ نواب صاحب کے دیوان خانے کے علاوہ میں نے حکیم اجمل خاں۔ حکیم رضی الدین خاں۔ ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو۔ نواب احمد سعید خاں طالب۔ ڈپٹی اکرام اللہ خاں۔ ڈپٹی ہادی حسین خاں اور نواب سلطان مرزا کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔ حکیم واصل خاں کا دیوان خانہ بھی دیکھا ہے۔ حکیم عبدالمجید کا دیوان خانہ بھی خواب سا یاد ہے۔ اور حکیم محمد احمد خاں اور حکیم غلام کبریا خاں عرف بھورے میاں کے دیوان خانے تو کل کی بات ہیں۔

ہاں ایک دیوان خانہ اور تھا۔ محلہ مٹیا محل میں منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں کا دیوان خانہ۔ مولانا الطاف حسین حالی اِس دیوان خانے میں پابندی سے آتے تھے۔

تقریریں مولانا محمد ایوب میرے ہاں نواب فیض احمد خاں کے ہاں سے زیادہ کیا کرتے تھے۔ ایک عرصے تک اُنھوں نے میرے ہاں مسلسل روزانہ تقریریں کی ہیں۔ لیکن میں اپنے ہاں کے اجتماع کو یا خواجہ محمد شفیع کے ہاں کی اُردو مجلس والے اجتماع کو دیوان خانے کی نشست نہیں کہہ سکتا۔ میرے ہاں کا اجتماع اور اُردو مجلس کا اجتماع اپنے اپنے رنگ کے بے مثل اجتماع تھے۔ مگر دیوان خانے کی نشست

(باقی صفحہ ۳۳۱ پر)

الحمد للہ میں چالیس سال سے مسلسل یہ تقریب کرتا رہا ہوں۔

ہاں ایک بے مثل مولوی اور تھے۔ مولوی محمد الیاس۔ مولوی صاحب بستی حضرت نظام الدین کی گنبد والی مسجد میں رہتے تھے۔ انھوں نے نئے مسلمان بنانے کی بجائے مسلمانوں کو مسلمان بنانے کا کام کیا اور دوسروں کو بھی اس خدمت کے لئے اکسایا۔ تبلیغی جماعت کے نام سے آپ نا آشنا نہ ہوں گے۔ یہ مولوی الیاس ہی کی جماعت ہے۔ اسے مسلمانوں کو اسلام سے باخبر کرنے کے سوا اور کسی قصے جھگڑے سے سروکار نہیں ہے۔ بے لوث جماعت ہے۔ اس جماعت کے ممبر نوکری سے یا کاروبار سے جتنا وقت ملتا ہے وہ خدمت دین میں صرف کر دیتے ہیں۔ اس جماعت کا انتظام اب مولانا محمد الیاس کے فرزند مولانا محمد یوسف کے ہاتھ میں ہے۔

(۱۸۸۵ء – ۱۹۴۴ء)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ہندوستان آکر بھی دلی سے باہر رہے، لیکن ان کے والد حضرت مولانا خیرالدینؒ دہلوی تھے۔ پنڈت کے کوچہ میں مکان تھا۔ مولانا ابوالکلام خود شروع شروع اپنے نام کے ساتھ

(۱۸۸۸ء – ۱۹۵۸ء)

(صفحہ ۳۳۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) نہیں تھے۔

ہندوؤں میں دیوان خانے کا مکمل نمونہ لالہ سری رام، ایم۔ اے، مؤلف خمخانۂ جاوید کا گھر تھا۔

www.taemeernews.com

دہلوی لکھا کرتے تھے۔ "محی الدین احمد المکنٰی بہ ابی الکلام دہلوی کان اللہ لہٗ"
لکھنا ابھی بہتوں کو یاد ہوگا۔ مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی مولانا ابو نصر آہ
بھی دہلوی لکھتے تھے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ میں مولانا ابوالکلام کو دلی والوں
میں شامل نہ کروں اور دلی کو اس شرف سے محروم رکھوں کہ اُسے مولانا جیسے
فاضل۔ ادیب۔ مقرر اور مدبر سے نسبت ہے۔ ویسے بھی آدمی عمر کے بعد سے
مولانا کا زیادہ وقت دلی ہی میں گزرا ہے۔ اور میں صرف دلی والوں کا ذکر نہیں
کررہا، اپنے زمانہ کی دلی کا حال لکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے دلی کو جن جن سے
واسطہ پڑا وہ سب میرے زمانے کی دلی میں آئیں گے۔ مولانا نے دلی میں بیٹھ
کر کام کئے ہیں۔ کام کے اعتبار سے مولانا مودودی کی نسبت مولانا ابوالکلام
کو دلی سے زیادہ تعلق رہا ہے۔ ایک زمانہ میں دریا گنج والی، حکیم عبدالحمید
مالک ہمدرد دواخانہ کی کوٹھی لے رکھی تھی۔ اُس قیام پر دریا گنج کا علاقہ
فخر کرسکتا ہے۔ اور قدیم تعلق پر بنڈت کا کوچہ اور سارا لال کنویں کا علاقہ:
بنڈت کے کوچہ سے دو عظیم شخصیتوں کو نسبت ہے۔ ایک مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اور ایک مولانا ابوالکلام آزاد کو۔ مولانا مودودی
کا اپنی دینی تصانیف اور اپنی منظم جماعت اسلامی کے باعث دنیائے اسلام
میں شہرہ ہے اور مولانا ابوالکلام سید عبدہٗ مصری اور جمال الدین افغانی
کی صف کے فاضل ہیں۔ فارسی کی مثل ہے۔ "یک من علم را دہ من عقل دکار"

لہ فٹ نوٹ (صفحہ ۳۳۳) پر دیکھئے۔

www.taemeernews.com

مولانا کے پاس دس من نہیں، سو من عقل موجود ہے۔

تحریر و تقریر کے مولانا بادشاہ ہیں۔ اُن کے اخبار الہلال[1] کا مسلمانانِ ہند کے جگانے میں سب سے زیادہ حصہ ہے اور جس انداز سے انھوں نے سوتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا تھا اُس انداز سے جھنجوڑنا دوسرے کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اُن کی زبان اور اُن کا طرزِ بیان کوئی کہاں سے لائے گا۔ معلوم ہوتا تھا کہ عرش کا پایہ

(صفحہ ۳۳۲ کا فٹ نوٹ) میرے زمانے کی دلی کے اِس دوسرے ایڈیشن میں اضافے تو خاصے کئے گئے ہیں لیکن ترمیمیں نہیں کی گئیں۔ شاید ہی کہیں ایک آدھ لفظ بدلا ہو۔ مولانا ابو الکلام اور بہت سے حضرات جن کا میرے زمانہ کی دلی میں تذکرہ ہے اِس کے کتابی شکل میں آنے سے پہلے انتقال فرما چکے تھے، مگر میں نے جسے لکھتے وقت زندہ لکھا تھا اُسے اُسی طرح رہنے دیا۔ کیونکہ کتاب اگر میرے مرنے کے بعد بھی شایع ہوئی تو خدا جانے جب تک اور کیا کیا انقلاب آجائیں گے۔ ناظرین کو کتاب لکھنے کا وقت ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

[1] الہلال سے پہلے، گیارہ اور سولہ سال کی عمر کے درمیان ۱۹۰۳ء تک۔ مولانا نیرنگِ عالم (طرحی غزلیات کا ایک گلدستہ)، المصباح (ہفت روزہ)، احسن الاخبار ہفت روزہ، تحفۂ محمدیہ (ماہنامہ)، اور لسان الصدق (پندرہ روزہ) کی ادارت کر چکے تھے۔ الہلال ۱۹۱۲ء میں جاری کیا تھا۔

www.taemeernews.com

پکڑ کر لکھ رہے اور بول رہے ہیں۔

تقریریں مولانا اور بیٹری کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں ایک بوڑھے اور تجربہ کار شخص عبداللہ خاں دلی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی تھے۔ میرے مکان سے ملا ہوا اُن کا مکان تھا۔ اُنھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا۔ ابوالکلام تقریریں کیا کرتے جادو کرتے ہیں۔ جس دن چاہیں غدر کرا سکتے ہیں۔ ایک پولیس والے کے نزدیک کسی کی اہمیت کا اس سے بڑا معیار نہیں ہو سکتا۔

سابق ہندوستان کے مسلمانوں میں جو تھوڑا بہت شعور آگیا تھا اُس شعور کے پیدا کرنے والوں میں مولانا کا نام امتیاز خاص رکھتا ہے۔

تدبر اور سیاست دانی کی یہ کیفیت ہے کہ آج سے بیس برس پہلے ایک ذمہ دار بزرگ نے پنڈت جواہرلال نہرو کے مندرجہ ذیل الفاظ سنائے تھے۔

"پنڈت جی نے فرمایا:۔

میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا سکالر بھی ہوں۔ سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں اور دوں نے نہیں پڑھیں۔ پھر تیسرے چوتھے سال یورپ کا پھیرا ہو جاتا ہے، جہاں سیاست کی رفتار قریب سے دیکھنے میں آجاتی ہے اور میں سمجھنے لگتا ہوں کہ مجھے سیاست کا تازہ ترین علم حاصل ہو گیا۔ لیکن جب ہندوستان واپس پہنچ کر مولانا ابوالکلام سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی آگے ہیں۔"

www.taemeernews.com

اس روایت کے راوی سے میں نے کہا۔ آپ جانتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنڈت جی انسانوں کی تراشیدہ سیاست کے ماہر ہیں اور مولانا قرآنی سیاست کے۔ قرآنی سیاست میں ہیر پھیر نہیں ہے۔ لا تبدیل لکلمات اللہ۔

میں نے مولانا ابوالکلام کی فراست کی مولانا محمد ایوب کی فراست سے کم تعریف نہیں کی ہے۔ مگر دونوں کے میدان الگ الگ ہیں ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مولانا محمد ایوب ایک میدان کے شہسوار ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے بہت سے میدانوں کو اپنا لیا ہے۔

مبالغہ کا گناہ ان شاء اللہ کسی کی خاطر نہیں کروں گا۔ حتیٰ کہ اب سیدی و مولائی خواجہ حسن نظامی کا تذکرہ آتا ہے۔ وہ بھی مبالغہ سے قطعی پاک ہے۔ مولانا ابوالکلام سے صرف تعارف تھا۔ خواجہ صاحب پچاس برس سنگی اور ساتھی رہے۔ خواجہ صاحب کا ذکر طویل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خواجہ صاحب کے ذکر میں میرے لئے لذت ہے لیکن خواجہ صاحب کے ذکر میں بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔

۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کی بات ہے۔ میں نے خواب دیکھا کہ اپنے صحن میں لیٹا چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ چاند میں یکایک ایک سمندر نمودار ہوا اور اُس

www.taemeernews.com

سمندر سے کوئی غوطہ خور غوطہ لگا کر نکلا اور زمین کی طرف چلا اور سمندر کی فتوحات لئے سید ھا میرے گھر میں اُتر آیا۔

یہ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں کی مَسیں بھیگنے کا زمانہ تھا۔ تحریروں کے شباب کی ابتدا کہنا چاہیئے۔ اُن کے اچھے اور انوکھے تصورات۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے فقروں اور اُن کی دل کش اور مستانہ عبارت کا میں غائبانہ گرویدہ تھا۔ لیکن ملنے جُلنے کا شوق چونکہ نہیں ہے۔ مشتاق ہو جانے اور صرف تین میل کے فاصلے پر رہنے کے باوجود انھیں دیکھنے اور اُن سے ملنے کا ارادہ نہ کرسکا۔

میرے چچا زاد بھائی سید منظور احمد علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ وہ دِلّی آئے اور اپنے ساتھ کسی ہم جماعت کو لائے۔ میں اُس ہم جماعت کو چاندنی چوک کی سیر کراتا پھر رہا تھا کہ گوہر مقصود خود سامنے آگیا۔ محمد مرزا مشتاق۔ میرے اُستاد تھے اور غلام نظام الدین عرف خاکسار، خواجہ صاحب کے اُستاد۔ چاندنی چوک میں مشتاق صاحب اور خاکسار صاحب کی دوکانیں قریب قریب تھیں۔ میں اور منظور احمد مشتاق صاحب کی دُکان پر رُکے۔ خواجہ صاحب اس وقت اتفاق سے خاکسار صاحب کی دوکان میں بیٹھے تھے۔ وہ مشتاق صاحب کے پاس کوئی بات پوچھنے تشریف لے آئے۔ مشتاق صاحب نے میرا اور خواجہ صاحب کا تعارف کرایا۔ اب جو شکل۔ قد و قامت اور جسم کی ساخت ملاتا ہوں تو ہو بہو وہی غوطہ خور صاحب ہیں جنھیں چاندکے سمندر سے اپنے گھر میں اُترتے خواب میں دیکھا تھا۔

www.taemeernews.com

خیر ملاقات ہوگئی۔ تعارف ہوگیا۔ مگر ملنے جلنے سے بے نیازی یا ملنے جلنے کی کم جرأت نے پھر مل سکنا یا نہیں تو بیج کو بن لگادیا۔ میں طبیعت سے مجبور تھا اور خواجہ صاحب کو ضرورت کیا تھی کہ یاد رکھتے۔ لیکن مشیت ایزدی کو ہم دونوں ٹال سکتے تھے۔ ایک روز گھنٹہ گھر کے قریب پھر مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا اور ناکام رہا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس کا صدمہ میرے چہرہ سے پڑھا اور پوچھا۔ "کیوں پریشان ہو؟" میں نے بتا دیا کہ سند نہ ملنے کی پریشانی ہے۔ فرمایا۔ "تو کیا ہوگیا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں" میں نے عرض کیا "تین سال سے متواتر گر رہا ہوں" بولے۔ "انٹرنس پاس کرکے کیا کرتے؟" میں نے کہا۔ "ولایت جاتا" سوال کیا۔ "ولایت جاکر کیا بنتے؟" جواب دیا۔ "بیرسٹر" فرمایا۔ "بیرسٹر مشو، چیزے دیگر شو۔ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں عروج تک پہنچنے کا رستہ بتاؤں گا۔ جہاں بیرسٹر نہیں پہنچ سکتا"

خواجہ صاحب مجھے اپنی دلی کی قیام گاہ، نواب بدھن کی محل سرا میں لے گئے اور وہاں بہت دیر تک اس طرح سمجھاتے رہے کہ میں نے دل میں اطمینان اور دماغ میں سکون محسوس کیا۔ والد کے انتقال کو چار اور والدہ کے انتقال کو دو برس گذر چکے تھے اور کنبہ کا کوئی شخص سہارا نہیں دیتا تھا اور میں کسی سے سہارا طلب نہیں کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کی پہلی گفتگو ایسی تھی جیسے اللہ نے خواجہ صاحب کے پردہ میں میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔

www.taemeernews.com

اب میں نے خواجہ صاحب کے ہاں اور خواجہ صاحب نے میرے ہاں آنا جانا شروع کردیا۔ خواجہ صاحب سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلقین اور متوسلین میں سے تھے۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے شادی نہیں کی تھی حضرت کی درگاہ کا انتظام وانصرام کرنے والے حضرت کی اولاد نہیں ہیں، حضرت کے عزیزوں اور مریدوں کی اولاد ہیں۔ ان لوگوں کی حالت وہی ہے جو ہندوستان کی تمام درگاہوں کے متعلقین ومتوسلین کی ہے۔ نسل کے اعتبار سے یہ صاحبان کتنے بھی اونچے ہوں، فقط نسل کا نام لینے سے اونچائی پر ٹھہر نہیں سکتے۔ خواجہ صاحب کا خاندان انتہائی برگزیدہ ہے۔ اُن کے جدّ اعلیٰ مولانا سید محمدؒ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے حقیقی نواسے اور حضرت سلطان المشائخ کے مُنہ بولے بیٹے تھے۔ لیکن خواجہ صاحب کے دُنیا میں آنے سے بہت قبل خواجہ صاحب کا خاندان بھی برگزیدگی کھو چکا تھا۔ پھر طُرّہ یہ کہ بارہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے باپ اور ماں کے سایہ سے محروم کردیا۔ بڑے بھائی نے کچھ سنبھالا کچھ نہ سنبھالا۔ بچپن بڑی عُسرت میں کٹا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے بعد تو خواجہ صاحب کو درگاہ کی آمدنی کی حاجت کیا تھی لیکن اس آمدنی نے اُن کا ساتھ والدین کا انتقال ہوتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ درگاہ کی آمدنی بڑے بھائی ہی کے واسطے کافی نہ تھی۔

ایک مرتبہ خواجہ صاحب راجہ نوشاد علی خاں، تعلقہ دار جہانگیر آباد (اودھ)

www.taemeernews.com

کو درگاہ حضرت سلطان المشایخ کی زیارت کرانے لے گئے۔ اُس زمانہ میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہایش ترک کر رکھی تھی اور دلی میں میرے ہاں رہتے تھے۔ اس لئے میں بھی ساتھ تھا۔ درگاہ شریف کے دروازہ پر جوتیوں کے رکھوالے موجود ہوتے ہیں۔ ہم سب نے جوتیاں اُن کے سپرد کیں اور واپس آ کر رکھوالوں کو انعام دینے کی غرض سے خواجہ صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اکنی یا دونی دینا چاہتے تھے لیکن روپیہ ہاتھ میں آ گیا۔ خواجہ صاحب نے روپیہ رکھوالوں کو دے دیا اور راجہ صاحب سے فرمایا کہ بچپن میں مجھے بھی یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں پیسہ پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔

خواجہ صاحب عجیب و غریب حوصلے کے انسان تھے۔ میں نے خواجہ صاحب کا وہ دور دیکھا ہے کہ اُن کی مالی حالت بُری نہیں تھی تو اچھی بھی نہیں تھی لیکن دوستوں اور مہمانوں کی مدارات میں بے دریغ روپیہ لٹاتے تھے۔ یہاں تک کہ خود اُنھیں فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ فاقہ کا علم مجھے فاقہ کے وقت کبھی نہیں ہوا۔ خواجہ صاحب میں افلاس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا بھی حوصلہ تھا اور عروج پا جانے کے بعد افلاس کے وقت کی باتیں بیان کر دینے کا بھی حوصلہ تھا۔ فاقہ میں چہرہ پر پژمردگی نہیں چھاتی تھی۔ چہرہ ہر حال میں شگفتہ رہتا تھا۔ دو لتمند جب مفلس ہو جاتے ہیں تو افلاس کی رکاکتیں اُن میں آ جاتی ہیں۔ مگر خواجہ صاحب مفلس گھر میں جنم لینے اور مفلس تر ہو جانے کے باوجود اتنے خوددا

اور اتنے عالی ہمت تھے کہ پشتینی دولتمندوں میں اپنی خودداری اور عالی ہمتی میں نے نہیں دیکھی۔ جس فضا میں اُنھوں نے پرورش پائی تھی اُس کا اُن پر قطعی اثر نہ تھا۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ دولتمند ہوکر اور عروج پاکر بڑے لوگوں کے معایب بھی خواجہ صاحب میں نہیں پیدا ہوئے۔

منشی قربان علی بسمل ایک بوڑھے شخص خواجہ صاحب کے والد کے شناسا تھے۔ خواجہ صاحب ہمیشہ اُن کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوا کرتے تھے۔ اُنھوں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ مجھے محرروں میں رکھ لیجے۔ خواجہ صاحب نے کام پر لگالیا۔ مگر تعظیم ترک نہیں کی۔ خواجہ صاحب افلاس کے زمانہ میں جس سے جس طرح ملتے تھے اُس سے آخر عمر تک اُسی طرح ملے گئے۔ نئے ملنے والوں کو بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب میں عروج کا گھمنڈ ہے۔

خواجہ صاحب کی طرف خلقت کی رجوعات[1] کے کئی سبب تھے۔ کوئی اُن کی

---

[1] خواجہ صاحب کی طرف خلقت اس طرح کھنچتی تھی جس طرح مٹھاس کی طرف چیونٹیاں کھنچتی ہیں۔

ایک روز میں اور خواجہ صاحب بیوی نورؒ کے مزار پر گئے۔ یہ مزار مہرولی سے دو میل دور ہے۔ میں نے کہا مہرولی بھی چلے چلیے۔ مولانا راشد الخیری تبدیلی آب و ہوا کے لئے وہاں مقیم ہیں۔ اُن سے مل لوں گا۔ خواجہ صاحب قطب مینار کے پاس

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر)

www.taemeernews.com

ایسی تحریر کا شدید اثر تھا۔ کوئی آن پر درویش کی حیثیت سے فدا تھا۔ کسی کے خیال میں یہی کافی تھا کہ وہ پیرزادے ہیں اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

(صفحہ ۳۴۰ کا بقیہ فٹ نوٹ۔) میں ٹھہر گئے اور میں بستی میں مولانا کے پاس چلا گیا۔ جاتے وقت پارک میں آدمی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ واپس آیا تو ساٹھ ستر کا مجمع خواجہ صاحب کے گرد بیٹھا تھا۔ آنے جانے میں بیس منٹ سے زیادہ نہ لگے ہوں گے۔ بیس منٹ میں خدا معلوم کہاں سے آدمی نکل پڑے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا سفر کشمیر میں دیکھا۔ خواجہ صاحب کو سرینگر جانا تھا۔ میں اور بھتیجا احسان الحق بھی ساتھ ہو لئے۔ ہم ریاست کی سرحد کے قریب پہنچے تو مہاراجہ کے دو مسلمان ایڈیکانگ ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا۔ مہاراج آجکل شملہ ہیں۔ اُن کا تار شملہ سے آیا ہے کہ خواجہ صاحب تشریف لائے ہیں ممکن سے درخواست کی جائے کہ ریاست کی مہمانی قبول فرمائیں۔

سرینگر میں ہماری قیام گاہ کے ایک جانب ڈل ندی تھی اور دوسری جانب اتنا لمبا چوڑا میدان تھا کہ اُس کی چار دیواری اور اُس کے دروازہ تک جانے کا خیال نہیں آتا تھا۔ ہمیں ڈل ندی کے رُخ سے لایا لے جایا جاتا تھا۔

مہاراجہ کے مذکورہ بالا ایڈیکانگ روز علی الصباح ناشتہ کے بعد کہتے چلئے کشمیر کی سیر کو چلئے اور ڈل ندی کی جانب سے نکال لے جاتے۔ دوپہر کا کھانا سرینگر سے

(بقیہ صفحہ ۳۴۲ پر)

www.taemeernews.com

کی بیٹی کی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بہن کی اولاد ہیں۔ علاوہ ازیں خواجہ صاحب کی آنکھ میں موہنی تھی۔ خواجہ صاحب کی زبان میں موہنی تھی۔

(صفحہ ۳۴۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) سو میل دور ملتا اور سہ پہر کی چاء اور آ گئے۔ رات کا کھانا البتہ قیام گاہ پر پہنچ کر کھاتے۔

ہم سرینگر میں دس دن رہے۔ دس دن میں مضافات کی سیر نوابزادہ ایڈیکانگوں نے پیٹ بھر کر کرادی۔ لیکن سرینگر کے اندر جانے کی نوبت نہ آنے دی۔

ایک صبح بہت سویرے مولوی الف دین (وکیل کیمبلپور) تشریف لائے اور فرمانے لگے۔ آپ لوگ مہمان نہیں ہیں۔ نظر بند ہیں۔ میدان والے دروازہ پر پولیس اور فوج کا پہرہ ہے۔ ملنے والوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ میں کوشش کرتے کرتے ہار گیا۔ آخر ڈل ندی کے راستہ سے آیا ہوں۔

خیر دس دن گذر گئے اور پارٹی دلّی واپس چلی۔ ایڈیکانگ صاحبان خوش تھے کہ مہاراج کے حکم کی تعمیل بہ حسن وخوبی کر دی ہے۔

ایک موٹر میں ہم سوار تھے اور ایک موٹر میں ایڈیکانگ۔ کشمیر کا آخری ریسٹ ہاؤس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر رہ گیا ہوگا کہ ایڈیکانگوں نے ہمیں آزاد چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ آپ کے لئے شکار مار کر لاتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی سنسان جنگل میں کسی نے خواجہ صاحب کو دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ ایڈیکانگ صاحبان ریسٹ ہاؤس پہنچے

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر)

www.taemeernews.com

خواجہ صاحب کے اخلاق میں موہنی تھی۔ خواجہ صاحب سے مل کر انسان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ عوام کی گرویدگی نے خواص کو متوجہ کیا اور خواص میں رسوخ دیکھ کر عوام کی گرویدگی بڑھی۔

حرکت میں برکت ہے اور حرکت زندگی کا دوسرا نام ہے۔ خواجہ صاحب پر زندگی کی یہ تعریف بالکل صادق تھی۔ اللہ نے خواجہ صاحب کو جو عروج عطا فرمایا

(صفحہ ۳۴۲ کا بقیہ فٹ نوٹ) تو ریسٹ ہاؤس آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خواجہ صاحب ان سے باتیں کر رہے تھے۔ ایڈیکانگ صاحبان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ کی کرائی محنت خاک میں مل گئی۔

ریسٹ ہاؤس کے برابر ایک نہر تھی۔ میں اور بھتیجا نہر کے کنارے جا بیٹھے تھے۔ ایڈیکانگ صاحبان گھبرائے گھبرائے وہاں آئے اور بولے۔ غضب ہو گیا۔ خواجہ صاحب کو ہجوم نے پریشان کر دیا ہے۔ آپ ہجوم سے کہیے کہ خواجہ صاحب کے آرام میں خلل نہ ڈالے اور سب اپنے اپنے گھر جائیں۔ ہمیں مولوی اعف دین کا بیان یاد تھا۔ ہم نے خشک منہ بنا کر انھیں اطمینان دلایا کہ خواجہ صاحب تو ان بے آرامیوں کے عادی ہیں۔ باقی آپ انھیں رخصت کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں۔ بولے۔ ہمارے کہنے کا موقع نہیں ہے۔ ہم نے غفلت برتی۔ ہم ان کے آنے کے وقت یہاں ہوتے تو تھوڑے تھوڑے آدمیوں کو بھگا سکتے تھے۔

www.taemeernews.com

اس کی وہ ناشکری نہیں کرتے تھے۔ لیکن اُسے منتہا نہیں سمجھتے تھے۔ ٹانگیں توڑکر اور صحن میں سے خواجہ صاحب مرتے مرتے نہیں بیٹھے۔ مرتے مرتے اُن میں ایسی کیفیت موجود تھی جیسے زندگی تو اب شروع کرنی ہے۔

خواجہ صاحب کی محنت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اُن کا بس چلتا تو شاید رات کا سونا بھی ترک کر دیتے۔ اُن کے کاموں کو میں میر تقی اور مرزا غالب کے کلیات سے تشبیہ دیا کرتا ہوں۔ اتنا کام کرنے والے کے سارے کام ایک معیار پر نہیں اُتر سکتے۔ جس طرح میر تقی اور مرزا غالب کا سارا کلام ویسا نہیں تھا جیسا کہ اُن کا منتخب کلام ہے۔ اسی طرح خواجہ صاحب کے کاموں کے کلیات کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ انتخاب میں اِس قدر کام باقی رہ جائے گا کہ عصرِ حاضر میں اُس قدر کام کرنے کی مثال دستیاب نہیں ہوگی۔ خواجہ صاحب کو کام کرنے کا ہوکا تھا۔ چاہتے تھے کہ یہ بھی میں کرلوں اور وہ بھی میں کرلوں۔ خواجہ صاحب اِسے نہیں سوچتے تھے کہ کونسا کام اُن کے کرنے کا ہے اور کونسا کام اُن کے کرنے کا نہیں ہے۔

عرصہ دراز تک خواجہ صاحب کا عمل میں نے یہ دیکھا کہ اُن کے راستہ میں کانٹے بچھائے جاتے تھے اور وہ راستہ کاٹ کر ایسے نکل جاتے تھے جیسے کانٹے اُن کے واسطے بچھائے ہی نہیں گئے ہیں' اتفاقاً راستہ میں آگئے ہیں۔ خواجہ صاحب کو اپنے کام سے کام رہتا تھا۔ انھیں اس سے بحث نہیں تھی کہ کوئی کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ یہ وصف خواجہ صاحب نے آخر عمر میں کھو دیا تھا۔ آخر عمر

www.taemeernews.com

میں وہ کانٹوں سے اُلجھنے لگے تھے۔ پہلے خواجہ صاحب کو دوسروں کے نہ کانٹوں سے واسطہ تھا اور نہ پھولوں سے۔ دوسروں کا مقابلہ کرنے میں وقت نہ کھو کر خواجہ صاحب نے ترقی کی تھی اور دوسروں کے پھولوں میں نہ پھنس کر اس ترقی نے استحکام پایا تھا۔ پھولوں میں پھنسنے کی بجائے خواجہ صاحب کی توجہ کام کی طرف اور بڑھ جاتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پھول کام کی وجہ سے برسائے جاتے ہیں۔ میں کام چھوڑ دوں گا تو پھول مجھے چھوڑ دیں گے۔

خواجہ صاحب انجمنوں اور انجمن بازوں کے ساتھ شرکت کر کے کام نہیں کر سکتے تھے۔ انجمن باز اُن کے ساتھ چل ہی نہیں سکتے تھے۔ اُن کے کام کی رفتار بڑھاپے میں جوانوں کے کام کی رفتار سے زیادہ تھی۔ خواجہ صاحب اگر انجمن بازی کے چکر میں پڑ جاتے تو جس طرح ہزاروں انجمن باز اُبھرتے ہیں اور مٹتے ہیں اسی طرح اُن کا نام بھی مٹ جاتا۔ علیٰ ہذا مشایخ کے طور طریقوں کو بھی خواجہ صاحب نے اختیار نہیں کیا تھا۔ معتقدوں کا مجمع لئے بغیر وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ قوالیوں میں حال نہیں کھیلتے تھے۔ مریدوں کو اکٹھا کر کے توجہ نہیں دیتے تھے۔ پاندان اور چائے کا ساوار لئے لئے نہیں پھرتے تھے۔ لباس بھی درویشانہ نہیں تھا۔ جسم کا دُبلاپا چھپانے کے لئے لمبا کرتا بے شک پہن لیا تھا۔ اس کا رنگ گیروا نہیں ہوتا تھا۔ مدت تک ترکی ٹوپی اور انگریزی جوتی پہنی۔ پاجامہ ہمیشہ علی گڑھ تراش کا رہا۔

www.taemeernews.com

علی گڑھی تحریکوں میں حصہ لیتے تھے۔ دوسرے مشایخ کی طرح علی گڑھ سے بیزار نہیں تھے۔

مثل مشہور ہے کہ رونا اور گانا کسے نہیں آتا۔ مگر میں نے خواجہ صاحب کو روتے تو دیکھا ہے گاتے نہیں دیکھا۔ گاتے کیا، گنگناتے نہیں دیکھا۔ انھیں گنگنانے کی فرصت کہاں تھی۔ روتے بھی وہ اُن باتوں پر تھے جن پر عام طور سے نہیں رویا جاتا۔ اُن باتوں پر نہیں روتے تھے جن باتوں پر سب رویا کرتے ہیں۔

بقول مولانا حسرت موہانی خواجہ صاحب نثر کے شاعر تھے۔ لیکن نظم کا انھیں ایک مصرع بھی صحیح یاد نہیں رہتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں آپ نے اشعار نہ دیکھے ہوں گے۔ اکبر الٰہ آبادی کے دس بیس شعروں کے سوا انھیں کسی شاعر کا شعر یاد ہی نہیں تھا۔

موٹر میں بیٹھنا اور چھکڑے میں بیٹھنا اُن کے نزدیک یکساں تھا، بشرطیکہ چھکڑا موٹر کی طرح جلد پہنچا دے۔ خود بہت تیز چلتے تھے۔ نظر خراب ہوگئی تھی پھر بھی تیز چلتے تھے۔ کھانا تکلف کے ساتھ بھی کھا نا جانتے تھے اور باورچی خانہ میں یا اکڑوں بیٹھ کر اور چنگیر میں رکھ کر بھی کھا لیتے تھے۔ مزیدار کھانوں کا مزا معلوم تھا۔ مگر بدمزا کھانوں کو بدمزہ نہیں کہتے تھے۔ لباس کا بھی یہی حال تھا۔

مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی پر علما و مشایخ اور لیڈروں کا سلسلہ

www.taemeernews.com

ختم ہو گیا۔ مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی ہی سے میرے زمانہ کے ادیبوں کا دوسرا دور آجاتا ہے۔

صرف چھ ادیب او پر اور ہیں۔ انھیں چاہے منشی ذکاءاللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ شامل کر لیجیے، چاہے مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی کے ساتھ بعض دورِ اوّل میں شمار کیے جا سکتے ہیں، بعض دوسرے دور میں۔ یا سب کو درمیانی دور کا کہہ لیجیے۔

ایک میر ناصر علی۔ دوسرے حکیم میر ناصر نذیر فراق۔ تیسرے قاری سرفراز حسین۔ چوتھے مولوی اشرف حسین۔ پانچویں مولوی بشیرالدین احمد۔ چھٹے خان صاحب مولوی سید احمد۔

میر ناصر علی محکمہ نمک میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور قاری سرفراز حسین محکمہ کمسریٹ میں سپرنٹنڈنٹ۔ ملازمت کی مشغولیتوں کے باوجود ان دونوں کو لکھنے پڑھنے کا شوق رہا۔

خان بہادر میر ناصر علی نے پنشن پاتے ہی ماہنامہ صلائے عام جاری کیا اور اپنے قلم کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ میر ناصر علی کی تحریروں میں دل کشی تھی۔

میر ناصر علی کے پاس بہت اچھا کتب خانہ تھا وہ کتابوں کی تلاش میں روزانہ دو ڈھائی گھنٹے صرف کرتے تھے۔ شام کو کباڑیوں کے ہاں پہنچ جاتے تھے اور ان کی با

www.taemeernews.com

سے نادر کتابیں لے آتے تھے۔

قاری سرفراز حسین نے ملازمت کے ساتھ ساتھ دسیوں کتابیں لکھیں قاری صاحب ہر فن مولا تھے۔ ادیب کی جگہ ادیب۔ عالم کی جگہ عالم۔ عالم سند یافتہ مولوی کے معنی میں نہیں، بلکہ دینی اور دُنیاوی علوم کا مطالعہ اُنھوں نے بہت سے مولویوں اور بہت سے انگریزی دانوں سے زیادہ کیا تھا۔ چھٹی لے لے کر تبلیغ اسلام کرنے جاپان اور انگلستان گئے۔ انگریزی اور اُردو پر پورا قابو تھا، اور صرف مذہب ہی نہیں، ہر مضمون پر بول سکتے تھے، اور بولتے تھے۔ ہر مجلس پر چھا جاتے تھے۔ اس قدر پُر از معلومات باتیں کرتے تھے کہ سُننے والا ششدر رہ جاتا تھا اور ایسے دل چسپ انداز میں باتیں کرتے تھے کہ سُننے کو جی چاہتا تھا۔

قاری سرفراز حسین مولوی امیر حمزہ کی طرح میرے پھوپی زاد بھائی تھے۔ ایک کی والدہ میری دادی کی حقیقی بھتیجی تھیں اور ایک کی والدہ حقیقی بھانجی۔

مولوی اشرف حسین، ڈپٹی نذیر احمد کے نواسے داماد تھے ــــ پہلے بھی اُن سے رشتہ تھا۔ مولوی نہیں تھے۔ لیکن مولویوں کے خاندان سے تعلق تھا۔ اس واسطے بغیر مولوی کا لفظ لگائے پہچانے نہیں جا سکتے۔

مولوی اشرف حسین بھی سرکاری ملازم تھے۔ اُن کا نقطہ دیباچہ مثنوی بدر منیر (شایع کردہ شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن) پڑھ لیجیے۔ اندازہ ہو جائے گا کہ قلم میں کتنا زور تھا اور ذوق کیسا صحیح پایا تھا۔ مولوی اشرف حسین نے زیادہ

www.taemeernews.com

نہیں لکھا اور کم لکھا ہوا بھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔

میر ناصر نذیر فراق بہت زیادہ لکھنے والے تھے۔ اُن کے مضامین کی تعداد غالباً مرزا سلطان احمد فرزند مرزا غلام احمد قادیانی کے برابر ہوگی۔ مرزا سلطان احمد مضمون لکھنے سے کبھی انکار نہیں کیا کرتے تھے اِدھر مضمون مانگا جاتا تھا اُدھر مضمون آجاتا تھا۔ میر ناصر نذیر فراق کا بھی یہی حال تھا۔

میر ناصر نذیر فراق متعدد کتابوں کے مصنف ہیں دِلّی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔

مولوی بشیر الدین (ڈپٹی نذیر احمد کے فرزند) نے بھی بڑی بڑی ضخیم کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، واقعات دار الحکومت دہلی (تین جلدوں میں) اُن کی بڑی مشہور تصنیف تھی۔ مگر دِلی کے ساتھ دلی کی یہ تاریخ شاید بھارت ہی میں رہ گئی۔

مولوی سیّد احمد درمیانی دور کے ادیبوں میں سب سے معمر تھے۔ مجھے اُن کا نام آخر کی بجائے اوّل رکھنا چاہیئے تھا۔ مگر میں ترتیب کا زیادہ خیال نہیں کر رہا۔ جو یاد آتا جاتا ہے لکھتا چلا جاتا ہوں۔ فی الحال پیشِ نظر یہ ہے کہ جتنا مواد ممکن ہے جمع کر دوں۔ ترتیب کوئی اور دے لے گا۔ سولہ سترہ سو صفحے کا مواد حافظہ میں ہے۔ ترتیب کو سوچوں تو کتاب کا پہلا حصّہ بھی شایع نہ ہو سکے گا۔

خیر آپ سمجھ بھی گئے مولوی سیّد احمد کون ہیں؟ مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ اُنھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ مگر فرہنگ آصفیہ کی وجہ سے اُن کا نام رہتی

دنیا تک نہیں تو رہتی اُردو تک زندہ رہے گا۔

مولوی سید احمد بھولے بھالے اور سیدھے سادے انسان تھے۔ تاہم اُن کے تمام کاموں میں خاص ذوق کی جھلک تھی۔ خوش خط نہیں تھے لیکن کاغذ بہترین استعمال کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے پاس ذاتی پالکی گاڑی تھی۔ اُس کی سیٹیں دیکھنے میں تو سیٹیں تھیں مگر انھیں مولوی صاحب نے اس طرح بنوایا تھا کہ صندوق کا کام بھی دیتی تھیں۔ اپنے پیچھے کی سیٹ میں لکھنے پڑھنے کا سامان اور کتابوں کی کاپیاں یا چھاپہ خانہ، تھوڑا سا کاغذ پہنچانا ہوتا تو اُسے رکھ لیتے تھے۔ اور دوسری سیٹ میں آدھی سِلّی برف۔ درجن بھر سوڈا لیمن کی بوتلیں۔ سیر دو سیر موسمی پھل۔ اس سے اندازہ کیجیے۔ جو شخص گھر سے باہر اتنے انتظام کے ساتھ نکلتا تھا اُس کے گھر کا انتظام و انصرام کیسا ہوگا۔

یہی طبیعت تھی جس نے اُن سے فرہنگ آصفیہ جیسی لغت پیش کرا دی۔ مسٹر فالن (Fallon) جب انگریزی اُردو ڈکشنری تیار کر رہے ہیں تو علاوہ اور عملہ کے دلّی کے دو شخص اُن کے خصوصی مددگار تھے۔ ایک مولوی سید احمد اور ایک لالہ ٹھاکر داس، لالہ شمبو ناتھ مالک دلّی پرنٹنگ ورکس، حوض قاضی کے والد۔ مولوی سید احمد اُردو کا جتنا مواد مسٹر فالن کو دیتے تھے اُس کی نقل رکھتے جاتے تھے۔ وہی مواد فرہنگ آصفیہ کی شکل میں نمودار ہوگیا۔

www.taemeernews.com

مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی اور درمیانی ادیبوں کے بعد سب سے پہلے مجھے مولانا راشد الخیری کا تذکرہ کرنا چاہیئے۔ مولانا راشد الخیری ادیب کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی کی صف کے آدمی تھے۔ مولانا ابوالکلام اور خواجہ حسن نظامی کے طرز تحریر کا منہ کسی نہ کسی قدر چڑایا جا سکتا ہے۔ مولانا راشد الخیری کے طرز تحریر کی نقل ممکن نہیں ہے۔

شیخ عبدالقادر، جو بعد میں سر عبدالقادر ہوئے بیرسٹری پاس کر کے تشریف لائے تو انھوں نے پریکٹس دلّی میں شروع کی۔ ان کے ساتھ ان کا مشہور و معروف رسالہ مخزن بھی لاہور سے دلّی آگیا۔ شیخ صاحب کا دفتر و کالت کشمیری دروازہ میں، کچہری کے قریب تھا اور مخزن کا دفتر کوچہ چیلان میں میرے مکان کے پاس۔ کوچہ چیلان سے ملا ہوا ایک محلّہ ہے۔ کلاں محل۔ مولانا راشد الخیری وہاں رہتے تھے۔ مولانا کی کتاب "صالحات" شائع ہو چکی تھی اور مولانا کے مضامین مخزن لاہور میں نکلا کرتے تھے لیکن مخزن کے دلّی پہنچنے تک میں مولانا سے روشناس نہیں تھا۔ خیر میری تو اس وقت عمر اور بساط ہی کیا تھی۔ اور دلّی والے بھی نہیں جانتے تھے کہ کلاں محل کی گلیوں میں یہ جو شخص چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے، یہ کیا چیز ہے۔ خود مولانا کو خبر نہ تھی کہ ان کے اندر کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ علم و ادب کے جوہری شیخ عبدالقادر کی نظر

www.taemeernews.com

انتخاب مولانا پر پڑی اور شیخ صاحب نے انھیں گوشۂ گمنامی سے شہرت کے میدان میں لا کھڑا کیا۔

مولانا اُس زمانہ میں سرکاری ملازم تھے۔ میری نیازمندی کا شرف مولانا سے مجھے شیخ عبدالقادر کے طفیل حاصل ہوا۔ اور تعلقات بڑے خواجہ فضل احمد خاں شیدا کے ذریعہ جو مولانا کے ہم دفتر تھے۔

مولانا کی دو کتابیں "منازل السائرہ" اور "صبح زندگی" مخزن کے دور میں شایع ہوئیں۔ شیخ عبدالقادر کے فرمانے سے مولانا نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی تھی اور مخزن کی ایڈیٹری اختیار کر لی تھی اور مخزن کے ساتھ ساتھ شیخ محمد اکرام (شیخ عبدالقادر کے نایب اور بعدہ بیرسٹر) نے اور مولانا نے مل کر زنانہ رسالہ عصمت جاری کیا ــــ مخزن کے اور شیخ عبدالقادر کے یکایک لاہور چلے جانے سے مولانا صرف رسالہ عصمت کے ہو کر رہ گئے۔ کتاب کئی سال کوئی نہیں لکھی۔

ایک دن میں نے مولانا سے عرض کیا کہ زاہدہ خاتونؒ (میری بڑی لڑکی) کے لئے صبح زندگی کا دوسرا حصہ شامِ زندگی لکھ دیجیے۔ وہ اُس وقت دو ڈھائی برس کی تھی۔ مولانا میرے قابو میں تو کیا آتے ۔ البتہ لڑکی کا نام سن کر متاثر ہو گئے۔

لہ اہلیہ قیسی رام پوری۔

www.taemeernews.com

پھر بھی حسب عادت مہینوں ٹلاتے رہے اور اُڑان گھائیاں دیتے رہے۔ آخر عارف صاحب نے اور میں نے سازش کی، اور مولانا تشریف لائے تو اُنھیں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بٹھایا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس کوٹھری میں میز کرسی، آرام کرسی، اور لکھنے کا تمام سامان تھا، مولانا سے کہہ دیا گیا کہ لکھئے یا نہ لکھئے، کوٹھری دو گھنٹے سے پہلے نہیں کھلے گی۔ دو گھنٹے کے بعد مولانا برآمد ہوئے۔ پسینوں میں ڈوبے، مگر بہت شگفتہ، ہم نے کہا "سنائیے کیا لکھا ہے؟" مولانا نے پہلے روز زاہدہ سے خطاب کیا تھا کہ یہ کتاب میں تیرے لئے لکھ رہا ہوں۔ تجھے اس سے فائدہ اٹھانا نصیب ہو۔ تو اُس سے فائدہ اُٹھائے اور وہ شاید اُٹھائے۔ مولانا کے انتقال کے بعد جب میں نے مولانا کی تمام تصنیفات کا حق اشاعت مولانا کے فرزند رشید مسٹر رازق الخیری کو واپس کیا تو اُنھوں نے شام زندگی میں سے وہ خطاب نکال دیا۔ خدا معلوم کیوں۔ وہ خطاب تو تاریخی تحریر تھی۔ افسوس ہے کہ میں نے بھی اُسے محفوظ نہیں رکھا۔

خیر شام زندگی پوری اسی طرح لکھی گئی کہ مولانا کوٹھری میں بند کر دیئے جاتے اور دو گھنٹے کے بعد مسکراتے ہوئے نکلتے [illegible]۔ شام زندگی بائیس دن میں لکھی گئی تھی۔ بائیس دن یا چوالیس گھنٹے میں۔

عارف صاحب، خواجہ فضل احمد رشید اور لکھنے والے اور لکھوانے والے نے اوکھلے میں شام زندگی کا جشن منایا۔ کسی نے لکڑیاں جمع کیں۔ کسی نے

www.taemeernews.com

آگ سلگائی اور کسی نے کھانا پکایا۔

شامِ زندگی چھپنے سے پہلے تجارتِ کتب کے ماہر اور میرے مخلص بزرگ علامہ نظام الدین خاکسار مجھ سے کہا کرتے تھے۔ "کس چکر میں پڑے ہو۔ راشد کی شہرت تو دم توڑ چکی۔ اب اُن کے لکھے کو پوچھے گا کون۔" مگر شامِ زندگی کے چھپتے ہی میں نے رسالہ خطیب میں شامِ زندگی کا تھوڑا سا نمونہ شایع کیا، اس نمونہ کو پڑھ کر قریبًا پانچ سو فرمائشیں آگئیں۔ اس بات نے میرا بھی حوصلہ بڑھایا اور مولانا کا بھی۔ میں اور کتابیں لکھوانے پر آمادہ ہوگیا اور مولانا کوٹھری میں بند کئے جانے کے بغیر لکھنے لگے۔

مولانا کی تصنیفات کی کامیابی دیکھی تو اوروں نے بھی مولانا سے درخواست کی کہ ہمارے لئے بھی کچھ لکھ دیجیے۔ کسی نے ایک کتاب کا حقِ اشاعت خرید لیا۔ کسی نے دو کا۔ اس دور میں مولانا نے مضامین کم لکھے، کتابیں زیادہ لکھیں۔ اتنی زیادہ کہ کتابوں کا انبار لگادیا۔ اور مولانا کی دھوم مچ گئی۔

اس دور میں مولانا کلاں محل کی رہائش ترک کرکے میرے مکان کے قریب میرے ہی ایک مکان میں آگئے تھے۔ مجھ سے۔ مولانا عارف سے اور خواجہ فضل احمد رشید سے انھیں دلی تعلق تھا۔ عمر کے آخری چوبیس پچیس برس اُنھوں نے صرف ہم تین آدمیوں کی صحبت میں گزارے۔

مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو رونے رُلانے کے سوا

www.taemeernews.com

اور کچھ نہیں آتا تھا' بلکہ لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ مولانا بہت روتی شکل کے انسان تھے' لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مولانا سے بڑھ کر شگفتہ اور زندہ دل اور دل کش انسان دِلی بھر میں دو چار نکلیں گے۔ مولانا ملنے جلنے کے بے شک چور تھے۔ اور اسی لئے انھوں نے مجھے۔ مولانا عارف کو اور خواجہ فضل احمد کو اپنے ساتھ کے لئے منتخب کیا تھا۔ ہم تینوں بھی زیادہ ملنے جلنے سے گھبراتے تھے۔ لیکن مولانا جس سے ملتے تھے اُس سے اس طرح ملتے تھے کہ اُس کی روح خوش کر دیتے تھے۔ غیروں کے لئے مولانا کا دل دُکھتا تھا۔ لیکن اپنی تکلیف کی وہ پَروا نہیں کرتے تھے اور ہر حال میں بشاش رہتے تھے۔ خوشی کی شرکت کے لئے مولانا کو تامل۔ تکلف اور انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ خصوصاً بڑے آدمیوں کے نزدیک نہیں پھٹکتے تھے۔ لیکن غم کے شریک ہر چھوٹے بڑے اور ہر اپنے پرائے کے تھے اور چھوٹوں کو تو خوشی کے موقعوں پر بھی نوازا کرتے تھے۔

مولانا کو گرمی بہت ستاتی تھی۔ گھر میں خالی تہ بند باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ کوئی مشتاق ملاقات تشریف لاتے تو کرتا گلے میں ڈال باہر آتے اور پوچھتے۔ فرمایئے کیسے تکلیف فرمائی۔ وہ صاحب کہتے۔ فلاں شہر کا رہنے والا ہوں۔ آپ کے اشتیاق کا دیدار دِلی کھینچ لایا ہے۔ اب مولانا کھڑے ہیں اور مولانا کی عقل کام نہیں کرتی کہ ان تکلف کی باتوں کا کیا جواب دیں۔ اُن صاحب کو بھی نہیں سوجھتا کہ سلسلۂ گفتگو آگے کیونکر چلائیں۔ آخر مولانا

www.taemeernews.com

کہہ دیتے کہ اچھا۔ آپ کا اشتیاق پورا ہو گیا۔ شکریہ۔"

ان ہی روکھے اور خشک راشد الخیری کو اطلاع ملتی ہے کہ کھانا پکانے والی بڑی بی کا شوہر دم توڑ رہا ہے۔ بیگم راشد الخیری کو لے کر اُس کے گھر پہنچتے ہیں، اور شام سے مرنے والے کے سرہانے بیٹھتے ہیں تو صبح کر دیتے ہیں۔ یہی روکھے اور خشک راشد الخیری محلہ کے دوکانداروں اور محلہ کے تانگے والوں سے روز اُن کے بیوی بچوں کی خیریت پوچھتے ہیں اور اُنھیں جس مدد اور جس خدمت کی ضرورت ہوتی ہے اُسے انجام دیتے ہیں۔

مولانا اچھا کھانے کے شوقین تھے اور دوسروں کو کھلانے میں بھی اُنھیں مزا آتا تھا۔ رمضان المبارک میں روز دیگ چڑھواتے تھے اور رانڈوں اور یتیموں کو کھلاتے تھے۔ ایک بڑے میاں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ کھانا کھلایا اور ہاتھ میں ہاتھ لئے اور اُنھیں تھوڑی دور چھوڑنے گئے۔ وہ بڑے میاں مولانا کے بچپن کے یار تھے۔ بڑے میاں کو بس اتنا معلوم تھا کہ مولانا اُن کی نسبت مالدار ہیں۔ باقی وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مولانا کس درجہ اور مرتبہ پر پہنچ چکے ہیں۔ درجہ اور مرتبے کا تو خود مولانا کو احساس نہیں تھا۔ "بڑے لوگوں" کے مقابلہ میں ہو تو ہو۔ چھوٹے لوگوں کے مقابلہ میں یقیناً نہیں تھا۔

مولانا کی عادت تھی کہ دس پندرہ منٹ لکھتے تھے اور قلم رکھ دیتے تھے اور دس پندرہ منٹ میرے پاس یا اِدھر اُدھر گزار کر پھر لکھنا شروع کرتے تھے۔

www.taemeernews.com

اور پندرہ منٹ بعد پھر قلم رکھ دیتے تھے۔ اسی دفعہ میں ایک دن فیض بازار کی بیچ کی پٹری پر کھڑے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا عرس تھا۔ فیض بازار سے عرس کے آنے جانے والے گزر رہے تھے۔ ایک اور پرانے ساتھی، عبدالعزیز، نظر پڑ گئے۔ مولانا نے دریافت کیا "عبدالعزیز تم بھی کیا سلطان جی سے آرہے ہو؟" عبدالعزیز نے کہا "ہاں سلطان جی گیا تھا۔ میاں! حسن نظامی پر تو ہُن برس رہا ہے۔ ہُن۔" مولانا نے فرمایا۔ "عبدالعزیز تمھیں رشک کیوں ہے۔ تم بھی شاہ عبدالعزیز صاحب کی درگاہ کے متولی ہو۔ پیری مریدی کرنے لگو۔" عبدالعزیز ترش ہو کر بولے۔

لہ اس زمانے میں بیچ میں بہت چوڑی پٹری تھی۔

لہ عبدالعزیز حضرت شاہ عبدالرحیمؒ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ورثا کی طرف سے اُن کے خاندانی قبرستان "ہندیوں" کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ اُن کی ادائیں بھی قابلِ تحریر ہیں۔ ایک واقعہ عرض ہے: کوئی میت ہندیوں کے قبرستان میں گئی۔ عبدالعزیز نے قبر کے ساٹھ روپے مانگے۔ میت لانے والے میت کو کسی خاص جگہ دفن کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ دِلّی میں عام نرخ قبر کا مع اُجرت کھدائی اور پٹاو شاید دس روپے سے زیادہ نہیں تھا۔ میت لانے والے اُس خاص جگہ کی قیمت چالیس یا پچاس روپے دینی چاہتے تھے۔ عبدالعزیز نے کہا "میں پیسہ کم نہیں کروں گا۔ بڑی

(باقی صفحہ ۳۵۸ پر)

www.taemeernews.com

ہمیں رشک کیوں ہونے لگا۔ مولوی صاحب! تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا، اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ بندے۔ ایک سے لے کر ہزار تک گناہ کر کے آ۔ میں معاف کر دوں گا لیکن اگر تو نے شرک کیا تو پھر اپنی خیر نہ جان۔ ہڈا بگاڑ دوں گا"۔

(صفحہ ۳۵۷ کا بقیہ فٹ نوٹ) گفت و شنید کے بعد کسی کی زبان سے نکلا۔ شیخ صاحب تو ان کے بڑے مداح تھے۔ یہ تو بڑے سخت نکلے۔ عبدالعزیز نے پوچھا۔ کون شیخ صاحب؟ انھوں نے جواب دیا شیخ یعقوب۔ عبدالعزیز کا شیخ صاحب کے ہاں اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ اُن کا نام سُن کر عبدالعزیز بولے۔ میاں! تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا کہ شیخ صاحب کے بھیجے ہوئے آئے ہو۔ چلو دفن کرو۔ چنانچہ دفن کر دیا گیا اور عبدالعزیز کی خدمت میں پچاس روپے پیش کئے گئے۔ عبدالعزیز بولے۔ شیخ صاحب کے آدمی سے میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔ اب وہ اصرار کر رہے ہیں اور عبدالعزیز انکار کر رہے ہیں۔ آخر عبدالعزیز نے فتح پائی اور شیخ صاحب کے آدمی سے کچھ نہیں لیا۔ متولیان قبرستان سے کیونکر نمٹی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے۔ بہرحال عبدالعزیز نے دوست کا نام سُن کر اپنا اتنا نقصان کر لیا جتنا نقصان اُن جیسے غریب شخص کے لئے بہت تھا۔

شیخ محمد یعقوب کا ذکر پیچھے کہیں نہیں آیا۔ یہ بھی خوب آدمی تھے۔ ان کے تمام ملنے والوں پر ان کا بڑا اچھا اثر تھا۔ چھتہ لال میاں کے باشندے تھے اور دریا گنج میں ترکاری کی جو منڈی ہے اُس کے ممتاز ترین بیوپاری۔ خربوزوں تربوزوں کی فالیز الگ تھی۔

www.taemeernews.com

عبدالعزیز کے ان الفاظ سے کہ "تم نے قرآن تو پڑھا ہوگا، صاف ظاہر ہے کہ عبدالعزیز مولوی صاحب کو مولوی صاحب اس لئے کہہ رہے تھے کہ لوگوں کو مولوی صاحب ہی کہتے سنا تھا؛ ورنہ مولوی صاحب نے عبدالعزیز کو کبھی محسوس نہیں

(صفحہ ۳۵۰ کا بقیہ فٹ نوٹ) ہر سال، رات کے وقت، دوستوں کو فالیز پر بلاتے تھے اور خربوزے اور اعلا اعلا کھانے کھلاتے تھے۔ لقے تلتے آمدنی تھی، لقے تلتے خرچ تھا۔ کسی ساجھی نے شیخ صاحب کے ساتھ دغا کی اور انھیں ٹھک کر دیا۔ لیکن وہ مرتے مرتے وضع نبھاتے رہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے ہاں سترھویں کے مہمانوں کے واسطے شیخ صاحب ترکاری مفت بھیجا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اُن کی حالت زبوں دیکھی تو خواجہ بانو کے بھائی سید ابن عربی سے کہا کہ شیخ صاحب کو تکلیف مت دو، ترکاری بازار سے خرید لاؤ۔ عربی ترکاری خرید لائے۔ شیخ صاحب نے اُس کی سُن گن پالی۔ شیخ صاحب حسب معمول عرس میں آئے اور خواجہ صاحب کے پاس پہنچے۔ مگر بیٹھے نہیں ـــ غصے کی حالت میں شیخ صاحب کے کھڑے ہونے کا خاص انداز ہوتا تھا۔ سیدھی ٹانگ ڈھیلی چھوڑ کر اُس کی بجائے لکڑی کا سہارا لے لیتے تھے۔ یا بائیں ٹانگ پر جسم کا سارا بوجھ ڈال دیتے تھے۔ شیخ صاحب آئے اور اسی انداز سے کھڑے ہو گئے اور کہا "السلام علیکم" اور پھر فوراً ہی دوبارہ فرمایا۔ "السلام علیکم" ایک آنے کا سلام تھا۔ دوسرا جانے کا۔ دوسرا سلام کہہ کے یہ جا۔ وہ جا۔ عربی روکنے کے لئے دوڑے۔ عربی کے والد منانے گئے۔

(باقی صفحہ ۳۶۰ پر)

www.taemeernews.com

ہونے دیا کہ مولوی صاحب نے قرآن شریف بھی پڑھا ہے۔ دنیا مولانا کی کتنی عزت کرتی ہے، مولانا اسے سوچتے ہی نہیں تھے۔

مولانا نے جوانی میں ورزش کی تھی۔ ایک پہلوان اُن کے ہم سِن اُن کے بہت بعد مرے ہیں۔ اُن سے بس یہ وضع تھی کہ وہ دکھائی دیئے اور مولانا کا چہرہ کھِلا اور بغلیں کھُلیں اور سینہ اُبھارے آگے بڑھے اور بڑھ کر پہلوان کو گلے لگا لیا۔ چمٹا لیا، مزاج پُرسی کی۔ بال بچوں کا حال پوچھا۔ ایک آدھ ہنسی کی بات کہی اور

(صفحہ ۳۵۹ کا بقیہ فٹ نوٹ) لیکن شیخ صاحب نہ مانے اور کہتے رہے خواجہ صاحب نے مجھے ترکاری بھیجنے کے لائق بھی نہیں سمجھا۔ آخر چھ مہینے بعد دوسری سترھویں میں شیخ صاحب سے ترکاری منگائی گئی۔ تب شیخ صاحب کا غصہ دور ہوا۔

اسی بگڑے زمانے میں ایک مرتبہ خان نعمت اللہ خاں رحمٰن کی ڈاڑھی کی سالگرہ مشہور ہے) اجمیر شریف کے عرس کے سلسلے میں پچاس آدمیوں کا قافلہ لے کر آ گئے۔ انھیں علم نہیں تھا کہ شیخ صاحب کا وقت بگڑ چکا ہے۔ مگر شیخ صاحب نے اب بھی علم نہیں ہونے دیا اور خان صاحب کی قافلے کی قدیم دستور کے مطابق کئی دن مدارات کی۔ خدا معلوم کیونکر۔ ایسے شیخ صاحب کی بات ملنے والے کیا ٹال سکتے تھے۔ لالہ مدن موہن لال (دلی کلاتھ ملز والے) جیسے شخص کو ہندوؤں کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی تھی تو شیخ صاحب سے مدد مانگنے آیا کرتے تھے ہندو مدن موہن کو ٹال سکتے تھے۔ شیخ صاحب کو نہیں ٹال سکتے تھے۔

www.taemeernews.com

رخصت۔ اللہ اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے سوا مولانا نے کسی کی بڑائی کو نہیں گرانا اور کم حیثیت ہم جنسوں پر اپنی کبھی دھونس نہیں جمائی۔ بننے سے انھیں سخت نفرت تھی۔ نہ خود بنتے تھے۔ نہ دوسرے بننے والوں کو برداشت کرسکتے تھے۔ جو کیفیت اُن پر طاری ہوتی تھی اُسے ظاہر کر دینے میں انھیں باک نہ تھا۔ تحریر۔ تقریر۔ بات چیت میں ملاقات، سب موقعوں پر اس طبیعت کا اظہار ہوتا تھا۔ اپنے گھر کی چھوٹی سی ڈیوڑھی میں سلیپر نیچے رکھ کر بیٹھ جاتے اور ڈیوڑھی سے باہر کھڑے ہوئے آدمیوں سے باتیں کرتے رہتے۔ سلیپر پہنے پہنے دُور دُور ہو آتے۔ لباس جیسا بھی بن جاتا زیب تن کر لیتے۔

چالیس سال کی عمر تک مولانا دُبلے پتلے تھے۔ پھر جسم بھاری ہوتا گیا۔ لیکن بھدا نہیں۔ البتہ ڈھیلی اور لمبی شیروانی سے جسم کو بھدا بنا رکھا تھا۔

شیروانی پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ڈپٹی نذیر احمد مولانا کے حقیقی پھوپا تھے۔ مولانا نے ڈپٹی صاحب ہی کی دیکھا دیکھی لکھنا شروع کیا تھا اور طرز تحریر بھی ڈپٹی صاحب کا اختیار فرمایا تھا۔ بعد میں اپنا رنگ پختہ ہوگیا اور ایک نیا طرز ایجاد کر لیا۔ تاہم میں انھیں "جانشین ڈپٹی نذیر احمد" لکھا کرتا تھا۔ مولوی بشیر الدین فرزند ڈپٹی نذیر احمد کو یاروں نے جا لگایا کہ آپ بھی صاحب تصنیفات ہیں اور راشد الخیری سے بڑے ہیں، آپ کی موجودگی میں بیوی کے بھتیجے کو جانشین لکھنے کے کیا معنی ہیں۔ مولوی بشیر الدین سنجیدہ انسان تھے۔ وہ

www.taemeernews.com

اِن باتوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن ایک دن قاری سرفراز حسین نے مولانا کی ڈھیلی شیروانی کا ڈپٹی نذیر احمد کی جانشینی سے رشتہ جوڑ دیا۔

مولوی بشیرالدین کے سنجھلے لڑکے کی شادی تھی۔ برات میاں فرحت اللہ ابن منشی ذکاءاللہ کے ہاں ٹھیری تھی۔ میں اور قاری صاحب اور مولوی بشیرالدین ایک الگ کمرہ میں تھے۔ وہیں مولانا راشدالخیری وہی ڈھیلی اور لمبی شیروانی پہنے تشریف لے آئے۔ قاری صاحب نے مولوی بشیرالدین کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "آپ انکار کیا کریں۔ میں نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے یہ شیروانی ڈپٹی صاحب کے جسم پر دیکھی ہے۔ پھر راشد کے جانشین ڈپٹی صاحب ہونے میں شک کیا ہے۔ واحدی جانشین لکھتا ہے تو کیا غلط لکھتا ہے۔ بالکل ٹھیک لکھتا ہے۔"

مولانا کی آواز میں کھنکا تھا۔ اپنے لکھے ہوئے کو جیسا وہ پڑھتے تھے دوسرا نہیں پڑھ سکتا۔ ہماری تخلیہ کی مجلس میں مولانا کبھی کبھی مثنوی میرحسن کے اشعار سنایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ خواجہ فضل احمد نے داغ کا یہ شعر پڑھا۔ مگر ذرا غلط پڑھا ؎

خدا کی قسم اُس نے کھائی ہے آج
خدا کی قسم ہے مزا آگیا!

مولانا بے چین ہو کر بولے۔ "ابے۔ کیوں داغ کی روح کو تڑپاتا ہے۔ دوسرے

www.taemeernews.com

مصرع میں "قسم ہے خدا کی کہہ ــــ" "خدا کی قسم ہے" اور "قسم ہے خدا کی" میں جو فرق ہے اُسے خواجہ فضل احمد جیسے زبان داں نے اتفاقاً محسوس نہیں کیا تھا۔ مولانا نے پھر داغ کی پوری غزل بڑے مزے سے دوہرائی ؎

خدا کی قسم اُس نے کھائی ہے آج ۔۔۔ قسم ہے خدا کی مزا آ گیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو! ۔۔۔ یہ دل ہے، جدھر آگیا آگیا

کانوں نے آج تک مولانا کی آواز کا لطف فراموش نہیں کیا ہے۔

مولانا عارف کا انتقال مولانا کے انتقال سے پندرہ دن قبل ہوا تھا۔ عارف صاحب کے انتقال کی خبر مولانا کو نہیں دی گئی۔ عارف صاحب مولانا کو پوچھتے پوچھتے مر گئے اور مولانا نے عارف صاحب کو مرتے مرتے پوچھا۔ آخری دنوں میں مولانا سے خواجہ فضل احمد نے کہا۔ عارف اب بہتر ہے۔ مولانا نے فرمایا۔ "کیوں مجھے بناتے ہو۔ وہ بھلا بچنے والا تھا۔ وہ جا چکا۔ لیکن اکیلے اُس کا وہاں جی تھوڑا ہی لگے گا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک آدھ کو ضرور جانا پڑے گا۔ تمیں یا مجھے۔"

مولانا کے انتقال سے چار روز پہلے جارج پنجم کی رحلت کے متعلق کوئی صاحب گفتگو کر رہے تھے۔ ایک عقلمند نے کہا۔ "کیوں جی۔ اب بادشاہ کا بیٹا تخت پر بیٹھے گا۔ مولانا کی آنکھیں نقاہت کی وجہ سے بند تھیں، مگر اس دلچسپ سوال پر مولانا سے نہیں رہا گیا۔ آنکھیں کھول دیں اور فرمایا۔ "جی نہیں۔

www.taemeernews.com

آپ کے حق میں وصیت کر گئے ہیں۔"

مرتے وقت جو شخص ایسے پُرلطف فقرے بول سکتا ہو اُس کی شگفتہ مزاجی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

میرے ہاں کی نشست سے پہلے مولانا کا اُٹھنا بیٹھنا قاری سرفراز حسین۔ مولوی اشرف حسین اور مرزا محمد اشرف گورگانی کے ساتھ تھا۔ ایک دن شام کے وقت (حسب معمول) میں اور عارف صاحب اور مولانا ایڈورڈ پارک میں بیٹھے تھے کہ قاری سرفراز حسین بھی آنکلے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ قاری صاحب کا علم و فضل بھی مشہور ہے اور قاری صاحب کی زندہ دلی بھی مشہور ہے۔ مگر اُس دن قاری صاحب صرف علم و فضل کے موڈ میں تھے۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے باتیں کر رہے تھے۔ یکایک ایک بہت بوڑھا فقیر بھیک مانگتا سامنے آ کھڑا ہوا۔ مولانا نے بے ساختہ کہا۔ "آؤ جی قاری برکت اللہ۔ بڑی مدت میں شکل دکھائی۔ تمھارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں۔" قاری برکت اللہ قاری سرفراز حسین کے والد کا نام تھا۔ اور اُن کے انتقال کو پچاس سال گزر چکے تھے۔

قاری صاحب کا شیروانی والا لطیفہ آپ نے ابھی ابھی اوپر پڑھا ہے۔ قاری صاحب کے اور مولانا کے سب لطیفے لکھے جائیں تو اِس کے لئے الگ کتاب درکار ہے۔

عارف صاحب، خواجہ فضل احمد اور مولانا راشد الخیری اور میرے درمیان

www.taemeernews.com

سے جیسے دلی تعلقات تھے ویسے ہم میں سے کسی کے کسی اور سے نہیں تھے۔ میں خواجہ حسن نظامی کی جگہ دوسرے کو نہیں دے سکتا تو ان تینوں کی جگہ بھی خالی ہی رہے گی۔ عارف صاحب اور مولانا راشد الخیری کے انتقال کے بعد سے میرے دل کی دُنیا سُونی ہے۔ اُن کے بعد نہ معلوم کتنے انسانوں سے سابقہ پڑا لیکن اُن کا بدل مجھے نہیں ملا۔ عارف صاحب سیاسی آدمی ہو کر بھی میرے لئے بے سیاست تھے۔ اور مولانا راشد الخیری کو تو سیاست سے واسطہ ہی نہ تھا۔ عارف صاحب اور مولانا راشد الخیری، دونوں کے انتقال سے خواجہ فضل احمد جیتے جی مر گئے۔ اور میں بھی بیٹھا ہوا سانس ان سے مزار ہوں ؎

جیتا ہوں کمال کر رہا ہوں

اس دور کے چوتھے دہلوی ادیب، جنھوں نے نام پیدا کیا، مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں، یہ حیدر آباد دکن میں سشن جج تھے۔ ملازمت کے باوجود اِن کی ادبیت بے حد غالب رہی۔ مرزا صاحب نے صرف مضامین لکھ لکھ کر بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ مضامین کے چھ مجموعے چھوڑے ہیں۔ ایک مضمون اتنا طویل لکھا تھا کہ اُسے حضرت خواجہ حسن نظامی نے "دلّی کی آخری شمع" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ یہ مضمون ابو ظفر بہادر شاہ کے زمانے کے کسی مشاعرے کی تصویر ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر کو شروع کر دینے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں

www.taemeernews.com

رہا جاسکتا۔ ایسی ہی دل چسپ مرزا صاحب کی باتیں ہوتی تھیں۔ شعر بھی کہتے تھے۔ مگر شاعری نہیں چلی۔ لیکن سنا ہے دیوان شائع ہو چکا ہے۔

اس دور کا پانچواں دہلوی ادیب میں مسٹر عنایت اللہ ناظم دارالترجمہ حیدرآباد۔ دکن کو سمجھتا ہوں؛ جو منشی ذکاءاللہ کے منجھلے بیٹے تھے۔

جس طرح ڈپٹی نذیر احمد۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد، پہلے دور کے ادیبوں اور مولانا ابوالکلام۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا راشد الخیری۔ اور مرزا فرحت اللہ بیگ، دوسرے دور کے ادیبوں کے درمیان مولوی سید احمد، مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ خان بہادر میر ناصر علی۔ میر ناصر نذیر فراق۔ قاری سرفراز حسین۔ مولوی اشرف حسین۔ مرزا محمد اشرف گورگانی[1] اور مولوی بشیرالدین ہیں، اسی طرح دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان بھی کئی ایسے حضرات ہیں کہ حالات مساعدت کرتے تو وہ دوسرے دور کے ممتاز ادیبوں میں شامل ہو جاتے۔ مثلاً خواجہ فضل احمد خاں شیدا۔ پرنسپل مشتاق احمد زاہدی اور پرنسپل مرزا محمد سعید۔

خواجہ فضل احمد خاں شیدا۔ پرنسپل مشتاق احمد زاہدی۔ پرنسپل مرزا محمد سعید

---

[1] ان کا ذکر مولوی اشرف حسین وغیرہ کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ میں بھول گیا۔

مرزا حیرت، جنھیں گذشتہ صفحات میں متعارف کرایا جا چکا ہے اور سجاد مرزا بیگ مصنف

(بقیہ ۳۶۷ پر)

www.taemeernews.com

مولانا راشد الخیری کو موقع مل گیا۔ خواجہ فضل احمد کو موقع نہیں ملا۔ مولانا راشد الخیری سے اللہ تعالیٰ نے صحیح وقت پر نوکری چھڑوا دی۔ خواجہ فضل احمد نے پنشن لینے کے بعد، بڑھاپے میں لکھنے کا زور باندھا ہے۔

زاہدی صاحب خواجہ فضل احمد سے تین چار سال بڑے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے بالکل ہم سن۔ لکھنا شاید خواجہ صاحب سے پہلے شروع کر دیا

(صفحہ ۳۶۶ کا بقیہ فٹ نوٹ) حکمت علی اسی دور کے حضرات ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو کے دلی آجانے سے اور مولانا اسلم جیراج پوری اور مولوی عبدالحی فاروقی کو جامعہ ملیہ نے میرے حساب سے دہلوی بنا دیا تھا۔ انھیں اسی دور میں جگہ ملنی چاہیے۔ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، پروفیسر سینٹ سٹیفنز کالج کو بھی میں نے ہوش سنبھالنے کے وقت سے دلی ہی میں دیکھا۔ ان کے علمی اور ادبی ذوق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ خواجہ عبدالمجید پروفیسر سینٹ سٹیفنز کالج اور مولوی یٰسین علی پیرزادہ درگاہ حضرت سلطان المشائخ بھی اس دور کے قابلِ ذکر علمی اور ادبی بزرگ ہیں۔ پنڈت امرناتھ ساحر بھی اسی دور کے اہم شخص ہیں مگر وہ غالباً نثر نہیں لکھتے تھے۔ شاعر تھے اور شعر نواز۔ سیتارام کے بازار میں اُن کے ہاں مشاعرے پر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ پنڈت زار اور مرزا لبیب تیموری بھی اسی دور کے ممتاز شاعر ہیں۔

www.taemeernews.com

تھا۔ مگر خواجہ صاحب لکھنے ہی کے ہوگئے۔ زاہدی صاحب پروفیسری اور پرنسپلی بھی کرتے رہے۔ اب بڑھاپے میں جوانی کی نسبت زیادہ لکھتے ہیں۔ لیکن عمر بھر کی کسر کیسے نکال سکیں گے۔

مرزا محمد سعید کا بھی یہی حال ہے۔ اُن کے ساتھ پروفیسری اور پرنسپلی کے علاوہ ایک تقصہ اور لگا رہا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے نقاد ہیں اور ایسے نقاد کہ انھیں اپنا لکھا پسند نہیں آتا۔ ورنہ مرزا سعید تو اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کر سکتے تھے۔ مرزا محمد سعید کتاب کے کیڑے ہیں۔ انگریزی دانوں میں اُن سے زیادہ مطالعہ کم لوگوں نے کیا ہے۔

مرزا محمد سعید سر سید احمد خاں کے خاندان کے روشن چراغ ہیں۔ مرزا صاحب کی والدہ سید محمد خاں، برادرِ کلاں سر سید احمد خاں کی نواسی تھیں۔

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی کا خاندان بھی دلّی کا اعلیٰ خاندان ہے۔ عزیز الدین وکیل کی گلی والے عزیز الدین زاہدی صاحب کے نانا تھے۔

خواجہ فضل احمد خاں رشید کی والدہ عباسی بیگم میری دادی امداد بیگم کی ماموں زاد بہن تھیں۔ میرے دادا سید تھے اور میری دادی پٹھانی۔ سیدوں اور پٹھانوں میں رشتہ ہوتا رہتا تھا۔ میری دادی کے ماموں علی محمد خاں کی شادی نواب غلام نبی خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ نواب غلام نبی خاں، حکیم اجمل خاں کے ننیا سسرے تھے۔ پھر نواب غلام نبی خاں کے بیٹے نواب عبدالرحمٰن خاں

www.taemeernews.com

سرسید احمد خاں کے ماموں دبیرالدولہ زین العابدین کی پوتی سے بیاہے گئے۔

نواب عبدالرحمٰن خاں کا ایک واقعہ سنادوں، جس سے دِلّی کے قدیم امرا اور شرفا کی طبیعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی طبیعت بڑی حد تک عوام کی بھی تھی۔ جو اِس طبیعت کا نہ تھا وہ خالص دِلّی والا نہیں تھا۔ نواب عبدالرحمٰن خاں اس اعتبار سے دلّی والوں میں بھی منفرد تھے۔

نواب عبدالرحمٰن خاں کے والد نے بہت سے گاؤں اور کافی جائداد چھوڑی تھی۔ لیکن نواب عبدالرحمٰن خاں کیمیا سازی کی لت میں سب گاؤں اور ساری جائداد کھو بیٹھے۔ فقط رہنے کا مکان باقی رہ گیا جو اتنا وسیع اور شاندار تھا کہ سرسالار جنگ اوّل دِلّی تشریف لائے تو اُن کے میزبانوں نے انھیں اُس مکان میں ٹھیرایا۔ نواب عبدالرحمٰن خاں اوپر کی منزل میں چلے گئے اور نیچے کا پورا مکان سالار جنگ کو دے دیا۔ مگر نواب عبدالرحمٰن خاں سالار جنگ سے ملے نہیں۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا کہ نظام حیدر آباد، محبوب علی خاں تو لڑکے ہیں۔ حیدر آباد کی حکومت سالار جنگ کے ہاتھ میں ہے اور سالار جنگ پارس ہیں۔ ان سے چھو جانا سونا بن جانا ہے۔ یہ پارس اتفاق سے تمہارے گھر پہنچ گیا ہے، اِس سے مل لوگے تو دلدر دور ہو جائیں گے۔ لیکن نواب عبدالرحمٰن خاں نے مل کر نہ دیا۔ سالار جنگ مہینہ ڈیڑھ مہینے ٹھیرے تھے۔ اُن کے دورانِ قیام میں نواب عبدالرحمٰن خاں اوپر سے نیچے نہیں اُترے۔ اس طبیعت سے

www.taemeernews.com

قدیم دلّی والے ہمیشہ نقصان اٹھانے میں۔ مگر بہرحال یہ دلّی والوں کی طبیعت ہے۔

قاری سرفراز حسین اور مولوی امیر حمزہ بھی دادی ہی کی طرف سے میرے عزیز تھے۔ ایک صاحب کا میں نے اس کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے نکلے نکلے پچاس سال بعد دلّی آئے تھے۔ وہ میری دادی کی دوسری ماموں زاد بہن بادشاہ بیگم کے شوہر تھے۔ یعنی خواجہ فضل احمد خاں کے خالو۔ اُن کا نام وزیر محمد خاں تھا۔

سلطان حیدر جوش۔ مولوی احتشام الدین مُندر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ پروفیسر حبیب۔ بھیا احسان الحق۔ مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ مسٹر آصف علی۔ مولانا عارف ہسوی۔ مولانا ابوالخیر مودودی۔ مولانا ظہور احمد وحشی۔ منشی محمد الدین خلیق۔ رائے بہادر لالہ پارس داس۔ حافظ عزیز حسن بقائی۔ قاری عباس حسین۔ الیاس احمد مجیبی۔ ڈاکٹر سید احمد بریلوی۔ مولانا ابوالکمال ماہر۔ قاضی عباس حسین ظریف۔ افضل حسین مضحک۔ ڈاکٹر سید سجاد سب دوسرے اور تیسرے دور کے درمیانی ادیب ہیں۔ مجھے بھی ادیبوں میں تو خیر کیا، اگر سیدھا سادہ لکھنے والوں میں شمار کر لیا جائے تو میں دوسرے دور کا ضمیمہ ہوں۔

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش کے والد دہلوی نہیں تھے لیکن اُن کی والدہ دلی کی تھیں۔ حکیم احسن اللہ خاں کے خاندان سے۔ سلطان حیدر دلی میں پلے بڑھے۔ دلی میں تعلیم پائی۔ میرے ہم مدرسہ تھے۔ ایک دو جماعت آگے۔ طالب علمی کے زمانہ سے ادبی ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔

انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ کالج چلے گئے۔ بی۔ اے نہیں کیا مگر تحصیلداری مل گئی اور ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لی۔

پنشن لے کر علی گڑھ میں مسکن بنایا اور وہیں انتقال کیا۔ وجیہہ اور شاندار آدمی تھے۔ ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی اور شوخی فطرت میں داخل۔

ابو مسلم (ایک ناول) اور بانی شیخوپورہ[1] محتشم خاں نواب فرید کی سوانحعمری، دو کتابیں اور لاتعداد مضامین اور مختصر افسانے یادگار ہیں۔

مولوی احتشام الدین

احتشام الدین نام۔ منّو عرف۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نسل۔ پھاٹک مفتی والاں میں اُن کا مکان تھا جہاں حضرت شیخ کی ساری اولاد رہتی تھی۔ علی گڑھ کالج سے ایم۔ اے کر کے علی گڑھ کالج ہی میں نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے تھے۔ باقی زندگی لکھنے پڑھنے میں صرف کی۔

---

[1] شیخوپورہ (بدایوں)، سلطان حیدر جوش کا ددھیالی وطن تھا۔

www.taemeernews.com

گلی مفتی والان میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں نے مولوی احتشام الدین مُنذر کو مسلسل دیکھا۔ بے نیاز طبیعت کے انسان تھے۔ نہ دولت کے طلبگار، نہ عزت و شہرت کے خواہاں۔ اُس قسم کے انسان، جس قسم کے انسان کو اِس زمانہ میں دولت اور عزت و شہرت حاصل کرنے کا حق نہیں ہے۔

مُدت زمانے سے کُل ہند انجمن ترقی اُردو کے ساتھ وابستہ تھے۔ اور انجمن کے لئے کتابوں کا مواد فراہم کرتے تھے۔ اُن کے فرزند شان الحق حقی، ایم۔ اے بھی ماشاءاللہ ادیب ہیں اور شاعر بھی۔ مگر ادب اور شاعری کی نحوست سے محفوظ۔ پاکستان کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین کو کون نہیں جانتا۔ جامعہ ملیہ دلّی کے کرتا دھرتا۔ جنھوں نے تقسیم ملک سے پہلے جامعہ کی خاطر وزارت ٹھکرا دی تھی اور تقسیم کے بعد چارج لیا بھی تھا تو مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کا چارج لیا تھا۔ اب تک تعلیمی کاموں ہی میں منہمک رہے۔ تعلیم کے سوا ڈاکٹر صاحب کسی قضیے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر آجکل بہار کے گورنر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا کم ہے۔ لیکن جتنا لکھا ہے خوب لکھا ہے اور جب وہ بولتے ہیں تو بہت اچھا بولتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی قلم اور زبان کے ساتھ دل شامل ہوتا ہے اور اُن کی تحریر و تقریر دوسرے کے دل پر اثر کرتی ہے۔

www.taemeernews.com

پروفیسر مجیب

ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر مجیب بھی جامعہ ملیہ کے ایثار پیشہ عملے کے افراد میں ہیں۔ قریبًا ڈاکٹر ذاکر حسین کے برابر قابل اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے برابر مخلص اور لکھنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے بڑھ کر۔ لیکن سلیقے میں ذرا کم۔

بھیا احسان الحق

بھیا احسان الحق کی خدمت میں مجھے اُس وقت سے نیاز حاصل ہے جس وقت سے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ جس سال میں خواجہ صاحب سے ملا ہوں، بھیا بھی خواجہ صاحب سے اُسی سال ملے تھے اور خواجہ صاحب کے ذریعہ، ہم دونوں کا تعارف ہوا تھا۔

بھیا خواجہ صاحب کی پارٹی کے قابل ترین ممبر تھے۔ باعتبار علم و فضل پارٹی کا کوئی ممبر مجھ سمیت اُن کا ہم مرتبہ نہیں تھا۔

بھیا، میرٹھ کے مشہور رئیس خان بہادر شیخ وحید الدین سی۔ آئی۔ ای کے بھانجے اور داماد ہیں۔ بھیا کے والد شیخ سبحان بخش دلی میں میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔

بھیا نے مشرقی اور مذہبی علوم امرا کی اولاد کی طرح جید علماء سے گھر پر پڑھے۔ درس نظامی کی تکمیل کی۔ مغربی تعلیم کے لئے وہ مدرسہ اور کالج میں بھیجے گئے اور بی۔ اے تک پہنچے۔ بی۔ اے کی ڈگری نہیں لے سکے۔ مگر مغربی علوم پر دسترس۔ بی۔ اے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ بھیا کا مطالعہ

www.taemeernews.com

وسیع ہے۔ ہزارہا روپیہ اُنھوں نے کتابوں پر خرچ کیا۔ اُن کا کتب خانہ دیکھنے دکھانے کے لایق تھا۔ انقلاب ۱۹۴۷ء کی بھینٹ چڑھ گیا۔

بھیانے کئی کتابیں لکھی تھیں مگر اُن کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب آگیا۔ بھیا سیتارام کے بازار میں رہتے تھے، جو انقلاب سے پہلے بھی ہندوؤں کی بستی تھی۔ بھرا ہوا گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اُمی جی کے بعد قدیم ہندو پڑوسیوں نے بتایا کہ جن شرنارتھی صاحب نے آپ کے گھر پر قبضہ جمایا ہے وہ نرے جاہل اور کھد ہیں۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود آپ کے مسودے جلا جلا کر آگ سُلگاتے رہے اور مطبوعہ کتابیں کوڑیوں کے مول بیچ ڈالیں۔

مجھ میں اور اُن میں کامل ہم آہنگی ہے۔ خواجہ صاحب ہم دونوں پر کچھ بھروسہ کرتے تھے اور ہم دونوں نے خواجہ صاحب کو کبھی کوئی ایسا مشورہ نہیں دیا جس میں ہم دونوں کے درمیان اختلاف ہوا ہو۔

کتابوں کے مسودے جل جانے کی وجہ سے بھیا کی کھوس ادبی یادگار باقی نہیں رہی۔ ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے اور خواجہ غلام الثقلین پانی پتی نے میرٹھ سے ہفتہ وار اخبار توحید نکالا تھا جسے حضرت خواجہ حسن نظامی ایڈٹ کرتے تھے اور جس میں خواجہ صاحب کا ایک مضمون "کہو تکبیر" چھپ کر بہت مشہور و مقبول ہوا تھا۔ پھر بھیا ہی نے دلّی سے رسالہ دین و دنیا جاری کرایا۔ رسالہ

www.taemeernews.com

دین و دنیا کے ایڈیٹر اور مالک اب مفتی شوکت فہمی ہیں۔ لیکن اس کے بانی بھیا اور انوار ہاشمی تھے۔ ایک آدھ ماہنامہ سے اور بھی بھیا کا تعلق رہا ہے۔ روزنامہ رعیت میں، میں، وہ اور سردار دیوان سنگھ مفتوں شریک تھے۔

آپ شاید کہیں کہ بھیا کا ذکر اخبار نویسوں اور صحافیوں میں ہونا چاہیئے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ بھیا اخبار نویس کم ہیں اور ادیب زیادہ ہیں۔

بحیثیت انسان بھیا کی شخصیت مثالی شخصیت ہے۔ مذہب کا مظاہرہ کرکے مذہب کے مطابق عمل نہ کرنے والوں نے اُن پر ذرا ضرورت سے زیادہ بُرا اثر کیا ہے، ورنہ میں انھیں ولی کہہ دیتا۔ نیک سیرت انسان وہ بہرحال ہیں اور معاملات میں اکثر مدعیانِ مذہب سے بڑھ کر پابندِ مذہب۔

ضیاء الدین احمد برنی

مسٹر ضیاء الدین احمد برنی، خوش نویسی کے استاد منشی محمد دین کے فرزند ہیں۔ منشی صاحب ضلع گوجرانوالہ کے باشندہ تھے۔ لیکن چالیس پچاس برس دلی میں رہے۔ برنی صاحب کی پیدائش دلی کی ہے۔ اُن کے برادر اکبر منشی عبدالقدیر سرتاپا پنجابی ہیں، مگر برنی صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی محمد یوسف (مشہور و معروف خوش نویس) پر پنجاب کا اُتنا ہی اثر ہے جتنا اثر ہے۔ ویسے بھی اب پنجاب اور دلی کا ایسا ساتھ ہے جیسے چولی اور دامن کا۔

برنی صاحب میرے ہم محلہ، ہم مدرسہ اور ہم جماعت تھے۔ میں کالج کی

www.taemeernews.com

صورت بھی نہ دیکھ سکا، انھوں نے بی۔ اے کرلیا۔ ملازمت اخباروں اور رسالوں کو پڑھنے اور کہیں کہیں سے اُن کا ترجمہ کرنے کی ملی۔ میرے ساتھ حضرت خواجہ حسن نظامی کی صحبت میں وہ پہنچ چکے تھے۔ برنی خطاب خواجہ صاحب ہی کا دیا ہوا ہے۔ ادبی ذوق خواجہ صاحب کی ہم نشینی نے عطا کیا تھا اور ذوق کی تکمیل مناسبِ ذوق ملازمت نے کردی۔ پنشن کے بعد سے متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں اور شایع کر چکے ہیں۔

مسٹر آصف علی۔ مولانا عارف ہسوی۔ حافظ عزیز حسن بقائی، قاری عباس حسین اور مولانا ابوالکمال ماہر کا ذکر کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں کے زیرِ عنوان گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ آصف صاحب شاعر بھی تھے اور نثار بھی لیکن مجھے اُن کی گفتگو اور تقریر بہ نسبت تحریر کی اچھی معلوم ہوتی تھی۔

عارف صاحب کی گفتگو اور تقریر معمولی تھی اور تحریر اعلیٰ۔ اخبار نویسی سے ادبیت ماند پڑجاتی ہے۔ مولانا ابوالکلام۔ قاضی عبدالغفار مرادآبادی اور مولانا عارف ہسوی چند اخبار نویس ایسے گزرے ہیں، جنھوں نے اخبار کی جلدی اور گھبراہٹ سے بھی اپنی ادبیت کو ماند نہیں پڑنے دیا۔ عارف صاحب زندہ رہتے اور سیاست اُن کا پیچھا چھوڑ دیتی تو بحیثیت ادیب نیاز فتحپوری کے ہم پایہ ہوتے۔ عارف صاحب اور نیاز صاحب ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست تھے۔

حافظ عزیز حسن بقائی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور قاری عباس حسین نے بھی دو ایک کتابیں پیش کی ہیں اور اخباروں کے علاوہ رسالوں میں بہت لکھا ہے۔ مولانا ابو الکمال ماہر کی ۔ رؤف الرحیم ۔ خاصی ضخیم کتاب ہے۔

مولانا ابو الخیر مودودی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامیہ پاکستان کے بڑے بھائی ہیں۔ نہیں بڑے بھائی ابو محمد تھے۔ ابو الخیر منجھلے بھائی ہیں۔ ابو الخیر صاحب کا طرز نگارش نہایت شگفتہ ہے۔

مولانا ظہور احمد وحشی مسلمہ اور مشہور و معروف ادیب تھے۔ علیٰ ہذا منشی محمد الدین خلیقی بھی۔ وحشی صاحب سے خواجہ صاحب کے ذریعہ میرا ملنا جلنا رہا اور خلیقی صاحب سے جناب نیاز فتحپوری کے ذریعہ۔

نیاز صاحب کی مجلس خالص ادبی مجلس ہوتی تھی۔ خلیقی، عارف ہسوی، ظفر احسن علوی۔ حکیم مجیب الدین بقائی اور نیاز فتحپوری میرے ہاں مل کر بیٹھ جاتے تھے تو ایسا معلوم ہونے لگتا تھا جیسے چمن میں مہکتے ہوئے پھول کھل گئے ہ

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ چکے ہیں

رائے بہادر لالہ پارس داس، گورنمنٹ ہائی اسکول میں میرے ہم جماعت تھے۔ وہ تعلق اُنھوں نے مدت العمر نباہا۔ خود بھی لکھتے تھے اور دوسرے لکھنے والوں کی قدر و حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

الیاس احمد مجیبی

الیاس احمد مجیبی، بچوں کے مصنف ہے، آپ ضرور واقف ہوں گے۔ بچوں کے لئے مجیبی صاحب نے بڑی کامیاب کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ بچوں کی طبیعت کو سمجھنے کے مجیبی صاحب ماہر تھے۔

آخری کتاب مجیبی صاحب نے بچوں کی بجائے بڑوں کے لئے لکھی تھی۔ اس کا نام ہے "دلی جو ایک شہر تھا"۔ افسوس اُن کی زندگی میں وہ کتاب چھپ نہیں سکی۔ مکمل کر چکے تھے بلکہ اُسی کی اشاعت کے سلسلہ میں اُنھوں نے دِلی کا سفر کیا تھا۔ اُس میں میر تقی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے دہلوی شاعروں اور ادیبوں کے مختصر مختصر حالات اور نظم و نثر کے نمونے جمع کئے گئے تھے۔

مجیبی صاحب اصل رہنے والے قایم گنج (یو۔پی) کے تھے۔ لیکن مدت دراز سے دِلی میں مقیم تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی روزنامہ ہمدرد کے زمانہ سے دِلی میں تھے۔ ہمدرد کے ایڈیٹوریل اسٹاف سے تعلق تھا۔ ادبی ذوق نے اُن کی ڈاکٹری کو ہمیشہ دبائے رکھا، ورنہ طبیب کچھ کم اچھے نہیں تھے۔ متعدد کتابیں لکھ گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

قاضی عباس حسین ظریف اور افضل حسین مضحک ایک دوسرے کے نسبتی بھائی ہیں۔ دونوں میرے ہم جماعت تھے۔ دونوں کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے ہے۔

ظریف صاحب پنشن لینے کے بعد میرے ہم محلہ بھی ہو گئے تھے۔ کوچہ چیلان میں "گوشۂ عافیت" کے نام سے عظیم الشان حویلی تعمیر کرائی تھی۔ کراچی میں بھی اتفاق سے ہم محلہ یا ہم لائن ہیں۔ آمنے سامنے قیام ہے۔ دلی میں ظریف صاحب کے ظریفانہ کلام کی دھوم تھی۔ یہاں گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔

افضل حسین کے تخلص مضحک سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شعر کس رنگ کے کہتے ہوں گے۔

ڈاکٹر سید سجاد اور سید شوکت اور سید مبارک تین بھائی میرے مکان کے پچھواڑے رہتے تھے۔ سید مبارک، بی۔ اے کا نام مسلم لیگی ورکروں میں کیا گیا ہے۔ سید شوکت رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے پرسنل اسسٹنٹ تھے اور ڈاکٹر سید سجاد، حیدرآباد دکن میں اردو کے پروفیسر۔ حیدرآباد میں انھوں نے بڑی عزت پائی۔ مگر کراچی میں پرسش نہیں ہوئی۔ بھائی۔ بہن اور بیوی سے دور تکلیف کی زندگی گزار کر دنیا کو خیرباد کہا۔ سید سجاد لٹریچر کے ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر یعنی علامہ۔ یہ ڈگری انھوں نے جرمنی سے لی تھی۔ بیوی بھی اُن کی

www.taemeernews.com

جرمن تھیں۔

ڈاکٹر ایم-ایچ-سجاد

ڈاکٹر سجاد دلی کے ایک اور بھی ہیں۔ ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ سجاد۔ مگر یہ ڈاکٹر آف لٹریچر نہیں ہیں، ڈاکٹر آف ڈنٹل سرجری ہیں (D.D.S.) مغربی اور مشرقی پاکستان میں ان کے مقابلے کا ڈنٹل سرجن شاید ہی کوئی ہو۔ کراچی میں بڑا کامیاب مطب ہے۔ دلی میں بھی کامیاب تھے۔

مندرجہ بالا ادیبوں کے ہم عصر شعرا حسب ذیل ہیں :۔ اکبر خاں اکبر حیدری۔ جلال الدین المتخلص بہ حیدر۔ لائق حسین قوی امروہوی۔ (قوی صاحب کا مستقل قیام دلی میں تھا) عبد الخالق خلیق۔ مقرب حسین مقرب۔ اخلاق حسین اخلاق (جوہری) اشتیاق حسین شوق (نبیرہ حضرت ظہیر دہلوی) بہار الحق بہار برق۔ لالہ چندی پرشاد شیدا پیارے لال رونق۔ جگیشور پرشاد مایل۔ ڈاکٹر اشرف الحق ، ریاست حیدر آباد۔ دکن میں ڈاکٹر نائیڈو (شوہر مسز نائیڈو) کے بعد ان کا عہدہ تھا۔ لفٹنٹ کرنل تھے۔ عریاں تخلص تھا۔ ہزلیہ اشعار کہتے تھے۔ سنا ہے دو دیوان چھپ گئے ہیں۔ عبد الواحد یکتا۔ خضر حسین خضر۔ تیصر۔ نہال سیوہاروی۔ (یہ بھی دلی میں رہنے لگے تھے) قاضی عباس حسین ظریف اور افضل حسین مضحک (ظریف اور مضحک نثار بھی ہیں اور شاعر بھی) محمد الیاس آثم۔ ابو الکمال ماہر۔

www.taemeernews.com

اب یہاں یاد آرہا ہے۔ دور اول کے اور دور اول و دور ثانی کے درمیانی زمانے کے بعض شعرا کے نام غالباً میں لکھنے بھول گیا ہوں۔ مثلاً:۔ نواب احمد سعید خاں طالب۔ امیر الملک مرزا ابلاقی۔ محمد علی بیگ مایل رجو جے پور میں جا بسے تھے)

میں نے پہلے اور دوسرے دور کے ادیبوں اور شاعروں کی بابت جس قدر لکھ دیا ہے اُس قدر تیسرے دور کے ادیبوں اور شاعروں کی بابت نہیں لکھ سکتا۔ پہلے دور والے میری زندگی پر اثر انداز ہوئے۔ اُن کا دور میرے اپنے ذوق کے اُبھار کا دور تھا۔ اور دوسرے دور والوں سے مجھے براہ راست واسطہ رہا۔ مگر تیسرے دور کے آتے آتے میں بوڑھا ہو چکا تھا اور اب تو ہجری حساب سے ستّرویں سال میں چل رہا ہوں۔ حافظہ روز بروز بگڑتا جاتا ہے۔ بالکل ممکن ہے پہلے اور دوسرے دور والوں میں بھی ایک آدھ کو بھول گیا ہوں۔ لیکن تیسرے دور کے تو اکثر ادیبوں اور شاعروں سے شناسائی ہی نہیں ہے۔ فقط مندرجہ ذیل حضرات کو جانتا ہوں:۔ آغا حیدر حسن۔ خواجہ محمد شفیع۔ اشرف صبوحی۔ سید یوسف بخاری۔ ایس۔ اے۔ خالق۔ شاہد احمد۔ رازق الخیری۔ صادق الخیری۔ انصار ناصری۔ شفیع الدین نیر۔ شوکت فہمی۔ آغا اشرف۔ لالہ مرلی دھر شاد۔ مسعود تابش۔ قیسی رام پوری۔ فضل حق قریشی۔

مظہر انصاری۔ منور حسین زیب۔ جمیل الدین عالی۔ احترام اللہ۔ شان الحق حقی۔
آغا آفتاب قزلباش۔ آغا سرخوش قزلباش۔ سحاب قزلباش۔ خواجہ حسن ثانی نظامی۔

آغا حیدر

آغا حیدر حسن دلی کی بیگماتی زبان بے مثل لکھتے ہیں۔ اس میں اُن کا کوئی مد مقابل نہیں ہے۔ جو وقت زبان سیکھنے کا ہوتا ہے اُس وقت آغا حیدر بیگمات کے پاس زیادہ اُٹھے بیٹھے، بچپن پورا بیگمات کی صحبت میں گزرا۔ اس لئے اُنھیں بیگماتی زبان خوب آتی ہے۔ اُن کا خاندان دلی کے ممتاز خاندانوں میں ہے۔

آغا حیدر حسن ۱۹۴۷ء تک حیدر آباد دکن میں پروفیسر تھے۔ آجکل کی خبر نہیں، کہاں ہیں۔ جہاں ہوں خوش ہوں۔ بڑی محبت کے آدمی ہیں۔

خواجہ محمد شفیع

خواجہ محمد شفیع، مرحوم اُردو مجلس کے بانی، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دلی کے رؤسا میں تھے۔ انقلاب ۱۹۴۷ء لاہور لے آیا۔ وہاں بھی لکھنے پڑھنے ہی کا شغل ہے۔ مگر غالباً اُردو مجلس کو زندہ نہیں کر سکے۔ دلی کی اُردو مجلس میں حضرت خواجہ حسن نظامی کے ساتھ میں بھی بارہا گیا ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا اجتماع ہوتا تھا۔ مسٹر ایس۔ اے خالق۔ مسٹر احترام اللہ۔ اشرف

اشرف صبوحی

صبوحی۔ حیرت شملوی۔ عرش ملسیانی۔ نہال سیوہاروی۔ مجاز لکھنوی۔ معین احسن جذبی۔ سید محمد جعفری۔ اختر الایمان۔ اور خدا جانے کون کون اپنا کلام نثر و نظم سناتے تھے۔

خواجہ شفیع۔ اشرف صبوحی۔ اور یوسف بخاری تینوں صاحب طرز ادیب ہیں۔

ایس۔ اے خالق۔ دلی کے پنجابی سوداگروں میں سے تھے۔ اُن کا ہر مضمون کاروباری رنگ لیے ہوئے ہوتا تھا۔ لیکن اُسے وہ اتنا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ انسان اُس سے لُطف بھی اٹھاتا تھا اور فائدہ بھی حاصل کرتا تھا۔

ایس۔اے۔ خالق کا ایک اخبار نکلتا تھا۔ روپیہ اخبار اُس کا نام تھا۔ زیادہ تر اسی میں لکھتے تھے۔ "ذرایع نہ ہونے پر ذرایع پیدا کرو" انکی بڑی مفید کتاب ہے۔[1] ایس۔ اے۔ خالق سے پہلے پنجابی برادری کے ایک صاحب شیخ محمد ایوب صبر کو بھی لکھنے کا شوق ہوا تھا۔ میری نوجوانی کے زمانے میں۔ یا اب حافظ شیخ محمد یوسف نے رسالہ شمع جاری کر رکھا ہے۔ شیخ صاحب بھی پنجابی سوداگر ہیں۔ شیخ محمد ایوب صبر اخباروں کی نامہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے۔ شیخ محمد یوسف نے شمع کی اشاعت لاکھوں تک پہنچا دینے کا کمال دکھایا ہے۔ آج کل دینی کتابیں بھی بڑے اہتمام سے شایع کر رہے ہیں۔

مسٹر شاہد احمد ادیب ابن ادیب ابن ادیب ہیں۔ اِن کے والد، مولوی بشیر الدین احمد بھی ادیب اور مصنف تھے اور اِن کے دادا، مولوی نذیر احمد کا تو کہنا کیا ہے۔ شاہد احمد بھی صاحب تصنیفات ہیں اور رسالہ ساقی کے مالک وایڈیٹر ہیں۔

مولانا رازق الخیری علامہ راشد الخیری کے فرزند اکبر ہیں۔ رسالہ عصمت کے کرتا دھرتا۔ کئی کتابوں کے مصنف۔

مسٹر صادق الخیری علامہ راشد الخیری کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ بہت سی کتابیں

---

[1] روپیہ کلب ۱۳۱۰ سیور روڈ۔ نہر کابل، دھرم پورہ، لاہور نے شایع کی ہے۔

www.taemeernews.com

لکھ چکے ہیں۔

مسٹر انصار ناصری - پروفیسر شفیع الدین نیر

مسٹر انصار ناصری خان بہادر میر ناصر علی کے پوتے ہیں۔ اور ریڈیو پاکستان میں کسی جگہ اسٹیشن ڈائرکٹر ہیں۔

پروفیسر شفیع الدین نیرؔ جامعہ ملیہ (دلی) میں پروفیسر ہیں۔ بچّوں کے لئے نظمیں لکھنے کے اعتبار سے اُن کی ویسی ہی شہرت ہے جیسی الیاس احمد مجیبی کی بچّوں کے لئے نثر لکھنے کے اعتبار سے تھی۔

مفتی شوکت فہمی - آغا محمد اشرف

مفتی شوکت فہمی، ایڈیٹر دین و دنیا کی تصنیفات نہایت مقبول ہیں۔

آغا محمد اشرف، شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے پوتے ہیں۔ کئی سال یو۔ این۔ او کی طرف سے پاکستان میں ڈائرکٹر آف انفارمیشن رہے۔ اب نیویارک امریکہ میں یو۔ این۔ او کے اوورسیز سیکشن کے محکمہ پبلک انسٹرکشنز کے چیف ہیں۔ کم لکھتے ہیں۔ لیکن جب لکھتے ہیں تو بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اِن کے منجھلے بھائی ڈاکٹر محمد باقر ان سے زیادہ لکھتے ہیں۔ مگر انھیں دہلوی کی بجائے لاہوری کہنا چاہیئے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی آغا محمد طاہر انتقال کے وقت تک دِلی میں رہے۔ وہ لکھتے نہیں تھے بولتے تھے اور بلبلِ ہزار داستان تھے۔ (۲۳ جون ۱۹۵۰ء کو آغا طاہر کا انتقال ہو گیا)

لالہ مرلی دھر شاد

لالہ مرلی دھر شاد، سرشری رام (دلی کلاتھ ملز والوں) کے فرزندِ رشید تھے اور لائلپور کاٹن ملز کے انچارج۔ لاہور سے اُس ہوائی جہاز میں کراچی آ رہے تھے

www.taemeernews.com

ن نے ہم سے عالمِ اسلام کی بارہ تیرہ ممتاز شخصیتوں کو چھینا تھا۔ اُسی جہاز کے حادثے کا مُرلی دھر بھی شکار ہو گئے۔

لالہ مُرلی دھر غیر متعصب انسان تھے ۔ دوسرے جگن ناتھ آزاد۔ موجودہ سیاست میں ایسے غیر متعصب ہندو مسلمان نوجوان کم پائے جاتے ہیں۔

مسعود تابش سے ریڈیو پر اُردو خبریں آپ روز سنتے ہوں گے۔

قیصی رام پوری مشہور ناولسٹ، قدیم باشندے رام پور کے ہیں جیسا کہ رام پوری کے لفظ سے عیاں ہے۔ رامپوری اِن کے نام کا جُز ہے، لیکن اِن کی شادی میری بڑی لڑکی سے ہوئی ہے۔ شادی کے بعد یہ مسلسل دِلّی میں رہے اور دِلّی ہی سے کراچی آئے۔

جو اپنے آپ کو مسلمان کہے میں اُسے مسلمان تسلیم کرنے میں میں میخ نہیں نکالتا، اسی طرح جو دِلّی کو وطن بنائے وہ میرے نزدیک دِلّی کا ہے۔ قیصی صاحب نے جتنے ناول لکھے ہیں اُن کی زیادہ تعداد دِلّی میں لکھی گئی ہے۔ لہذا اُن کا شمار دِلّی کے ادیبوں میں ہونا چاہیے۔

فضل حق قریشی ۔ مظہر انصاری ۔ احترام اللہ ۔ شان الحق حقی سب اعلیٰ پایہ کے ادیب ہیں۔

فضل حق قریشی یو۔ این۔ او کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن متعینہ پاکستان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

مظہر انصاری لاہور پہنچ کر رسالہ ہمایوں کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ اب بھی لاہور میں ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں اور کتابیں بیچتے ہیں۔ دکان کر لی ہے۔

منور حسین زیب جے پور میں سپرنٹنڈنٹ دفتر کار خاص ہیں۔ یہ میرے بھانجے اور خواجہ فضل احمد شیدا کے داماد ہیں۔

نواب جمیل الدین عالی کراچی میں انکم ٹیکس افسر ہیں۔

احترام اللہ ٹھیکہ داری کرتے ہیں۔ شان الحق حقی۔ مولوی احتشام الدین مُنذر کے فرزند ہیں۔ اُن کا ذکر مُنذر صاحب کے ذکر میں پڑھیے۔

آغا آفتاب اور آغا مرغوب آغا شاعر قزلباش کے فرزند ہیں اور سحاب قزلباش آغا شاعر کی دختر۔

حسن ثانی نظامی حضرت خواجہ حسن نظامی کے پانچ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے ہیں۔ سب سے بڑے حسین نظامی۔ دوسرے علی نظامی۔ تیسرے زید نظامی۔ چوتھے حسن ثانی نظامی۔ پانچویں مہدی نظامی۔

حسین نظامی میں خواجہ صاحب کی کاروباری صلاحیت بدرجہ اتم آئی ہے۔ وہ انشاءاللہ ایک دن پاکستان کے نمبر ایک کے کاروباری ہوں گے۔ حسن ثانی نظامی ادبی اعتبار سے خواجہ صاحب کے جانشین ہیں۔ انھوں نے رسالہ منادی کو خوب سنبھالا ہے اور خواجہ صاحب کی خواجہ صاحبیت اُن کے دم سے زندہ ہے۔

علی نظامی حسین نظامی کے ساتھ پاکستان میں ہیں اور حسین نظامی کے

احترام اللہ۔ جمیل الدین عالی۔ منور حسین زیب۔ مظہر انصاری

حسن ثانی نظامی۔ شان الحق حقی۔ سحاب قزلباش

آغا مرغوب قزلباش

آغا آفتاب قزلباش

www.taemeernews.com

مددگار ہیں۔ زید نظامی دلی میں ہیں اور حسن ثانی نظامی کو مدد دیتے ہیں۔ بعد کی نظامی دلی میں ہیں۔ یہ بھی پڑھتے ہیں۔

اب میں اپنے زمانے کے اخبار نویسوں اور صحافیوں یا اخبار اور رسالوں کا ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

جس اخبار کو دیکھ کر میں اخبار کے لفظ سے واقف ہوا وہ اشرف الاخبار تھا۔ اشرف الاخبار کا دفتر کوچہ چیلان میں میرے مکان کے برابر تھا۔ اشرف الاخبار سے پہلے میں نے کوئی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اشرف الاخبار محمد مرزا شان نکالتے تھے جن کا ذکر کسی اور موقع پر پہلے کر چکا ہوں۔ جنھیں طوالت عمر کی وجہ سے لوگ نوح کہا کرتے تھے۔

اشرف الاخبار کے علاوہ میرے لڑکپن میں حویلی اعظم خاں سے مرزا عبدالغنی بیگ کا افضل الاخبار نکلتا تھا اور بلی ماران سے اکمل الاخبار۔ اکمل الاخبار حکیم غلام رضا خاں (شریف خانی) کا اخبار تھا۔ حکیم اجمل خاں کچھ عرصہ اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔

میرے زمانے کی دلی کا پہلا اخبار نویس حقیقتاً میر بشارت علی جالب کو کہنا چاہیے۔ اگرچہ جالب صاحب کی ابتدائی عمر لاہور میں بسر ہوئی۔ اخبار نویسی کے اعتبار سے لاہور ہی پر تھا۔ شروع شروع جالب صاحب نے

www.taemeernews.com

لاہور کے معمولی اخباروں میں کام کیا۔ مثلاً "شریف" محمد شریف آئی ڈاکٹر کے ٹرٰ میں۔ پھر مشہور روزنامہ "پیسہ اخبار" سے منسلک ہوگئے۔ وہاں اُن کے جوہر کھلے پیسہ اخبار سے قبل جالب صاحب نے وکیل امرتسر میں بھی کام کیا تھا۔

انگریزی اخبارات جس جس نوع کے مضامین چھاپتے ہیں، ہر نوع کے لیے جداگانہ ایڈیٹر رکھتے ہیں۔ اُس نوع کا وہ ایڈیٹر ماہر ہوتا ہے۔ اُردو اخبارات آج بھی اتنا اہتمام نہیں کر سکتے اور اُس زمانہ میں تو روزنامہ پیسہ اخبار کے چیف ایڈیٹر میر جالب سالہا سال کی ترقیوں کے بعد ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ مگر میر جالب کی معلومات کا یہ عالم تھا کہ ہر نوع کے مضامین میں سیر حاصل اور تازہ بتازہ مواد اکھٹا کر دیتے تھے۔

میر صاحب کی سی معلومات کا ایڈیٹر اُردو اخبارات کو اب تک اور کوئی میسر نہیں آیا۔ لکھنے والے میر صاحب سے بہتر آپ بتا سکتے ہیں، صاحب معلومات میر صاحب جیسا نہیں بتا سکیں گے۔ میر صاحب صحیح معنوں میں اُردو اخبار نویسی کے بابا آدم تھے۔ اُن کے متعدد شاگرد اُن کے سامنے اور اُن کے بعد کامیاب اخبار نویس ہوئے۔ شاگردوں میں سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر "ریاست" اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اُردو آرگن "منشور" کے ایڈیٹر حسن ریاض اور کانگریسی اخبار "حقیقت" کے ایڈیٹر انیس احمد عباسی مشہور ہیں۔

میر صاحب سیدھے سادے، ہیر کھیر، چھل بٹّا اور چھل چھدّر سے پاک۔

www.taemeernews.com

سچی بات کہنے والے اور بے لاگ کہنے والے انسان تھے۔ لکھنے بیٹھتے تو لکھنے میں غرق ہو جاتے۔ غل شور اُن کے لکھنے میں خلل نہیں ڈالتا تھا۔ بولنا شروع کر دیتے تو انھیں خبر نہ رہتی کہ سُننا بھی جا رہا ہے یا نہیں۔

رسالہ مولوی کے ایڈیٹر عبدالحمید خاں ایک زمانے میں میرے مددگار تھے۔ ایک دن وہ کسی کام کے واسطے دفتر نظام المشائخ سے باہر گئے۔ میر جالب اُس وقت دفتر روزنامہ ہمدرد جا رہے تھے۔ عبدالحمید صاحب نے اُن سے کوئی سوال کر لیا کہ میر صاحب! یہ بات کیونکر ہے۔ بس دفتر کھُل گیا۔ میر صاحب نے گردن نیچی کر کے نگاہ سڑک پر جمائی اور بولنا شروع کر دیا۔ دیر لگنے لگی تو عبدالحمید صاحب کو خیال ہوا کہ میں کہیں نہ کہوں اتنی دیر کہاں کی۔ عبدالحمید صاحب جس کام کے واسطے نکلے تھے اُسے کرنے چل دیئے اور میر صاحب کو خبر نہیں ہوئی۔ واپس لوٹے تو میر صاحب کی تقریر جاری تھی۔ آخر عبدالحمید صاحب نے میر صاحب سے کہا کہ میر صاحب! تشریف لیجائیے میرا دفتر نظام المشائخ میں انتظار ہو رہا ہوگا اور آپ کا دفتر ہمدرد میں۔ امیر بخش نام کے ایک صاحب کوچہ چیلان میں کاٹ کباڑ کے معمولی دوکاندار تھے۔ میر صاحب کی اور اُن کی بچپن کی دوستی تھی۔ یہ صاحب دفتر ہمدرد جاتے ہوئے امیر بخش کے ہاں روزانہ دس پانچ منٹ کی ٹیکی لیتے تھے۔

مولانا محمد علی نے روزنامہ ہمدرد نکالا تو مولوی عبدالحلیم شرر کو بُلایا کہ ہمدرد کی ادارت سنبھالیں۔ یہ انتخاب غلط تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر بے نظیر ناول نویس

ضرور تھے، مگر اخبار نویس نہیں تھے۔ دوسری نظر مولانا محمد علی کی میر جالب پر پڑی۔ اُن کے ماتحت قاضی عبد الغفار مراد آبادی۔ مولانا عارف ہسوی۔ قاری عباس حسین دہلوی اور محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری کو رکھا گیا۔ اخبار چمک اٹھا۔ زمزمہ، پیسہ اخبار نے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ تک پہنچایا تھا۔ مولانا محمد علی نے چھوٹتے ہی ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرمائی۔

ہمدرد کے بند ہونے کے بعد میر جالب لکھنؤ کے رئیس آنریبل شیخ شاہد حسین قدوائی بیرسٹر و تعلقہ دار گدیہ ضلع بارہ بنکی کی دعوت پر لکھنؤ پہنچے اور روزنامہ ہمدم کے کل کلاں مختار بنا دیئے گئے۔ پھر میر صاحب نے خود روزنامہ ہمت جاری کیا اور ہمت الکٹرک پریس کھولا۔ لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۰ء تک رہے۔ حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بیعت کرلی تھی اور اُن کے ہاں خاص تقرب حاصل تھا۔

میر جالب ہمیشہ اپنے آپ کو "جالب ناکام" لکھا کرتے تھے۔ بس یہ تھوڑا سا زمانہ کامیاب رہا۔ آخر زمانہ پھر تلخیوں میں گزرا۔

رام رچھپال سنگھ شیدا

رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی بھی بلند پایہ اخبار نویس تھے اور میر جالب کے ہم عمر۔ شیدا صاحب نے لاہور میں اتنا وقت گزارا کہ لوگوں کو شاید استعجاب ہو گا جب وہ پڑھیں گے کہ شیدا صاحب دہلی نژاد تھے۔ لاہور کے اخبار ہندوستان کی ایڈیٹری کا دور اُن کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ جب لکھنے پڑھنے کے قابل

www.taemeernews.com

نہیں رہے تھے تو دلی آ گئے تھے۔

روزنامہ ہمدرد سے قبل کا کوئی روزنامہ میرے حافظے میں محفوظ نہیں ہے۔ ہمدرد کے بعد لالہ دیش بندھو گپتا نے روزنامہ تیج جاری کیا اس کے ایڈیٹر اب لالہ دھرم پال گپتا ہیں۔ لالہ شنکر لال (انشورنس والوں) نے روزنامہ کانگریس نکالا۔ جس کے ایڈیٹر عارف ہسوی تھے۔ میں نے اور بھیا احسان الحق اور سردار دیوان سنگھ مفتوں نے روزنامہ رعیت جاری کیا، جس کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری تھے۔ پھر مسٹر سید محمد جعفری کا روزنامہ ملت نکلا۔ ماسٹر ہلال احمد زبیری کا روزنامہ انصاری۔ شیخ عثمان آزاد کا روزنامہ انجام۔ اور مسٹر خلیل الرحمن کا روزنامہ جنگ۔ لالہ شیونرائن بھٹناگر کا روزنامہ وطن۔ حافظ عزیز حسن بقائی کا روزنامہ حریت۔ سید عبد العزیز کا روزنامہ منصف۔ مسٹر محمد مرزا کا روزنامہ اقدام۔ سید سجاد حسین کیف کا روزنامہ خادم اور مولانا مظہر الدین کا روزنامہ وحدت۔ وحدت کے ایڈیٹر سید عاشق علی اور مسٹر حمید شملوی تھے۔

جمعیتہ العلمائے ہند کا آرگن الجمعیتہ بھی شاید چند روز کے لئے روزانہ ہو گیا تھا۔

روزنامہ تیج اور روزنامہ وطن تادم تحریر زندہ ہیں۔ روزنامہ کانگریس اور اس کے مالک اور ایڈیٹر سب اللہ کے ہاں جا چکے۔ روزنامہ ملت کے جعفری صاحب سنی مجلس اوقاف (دلی) کے ناظم ہیں۔ روزنامہ انصاری کے زبیری صاحب کو ریاست خیرپور (پاکستان)

میں کپڑا بننے کی فیکٹری مل گئی ہے۔ باقی اور روزناموں کی عمر کم رہی۔ روزنامہ اقدام کے ایڈیٹر مسٹر محمد مرزا اسی مجلس ادقاف کے نائب ناظم ہیں۔ روزنامہ انجام اور روزنامہ جنگ کراچی سے بہ آب و تاب نکل رہے ہیں۔ مسٹر حمید شملوی مسٹر جی۔ اے چودھری کے ساتھ روزنامہ "نئی روشنی" کراچی مرتب کرتے ہیں۔ مسٹر محمد مرزا نے ایک سہ روزہ اخبار بھی نکالا تھا۔ اُس کا نام دستور تھا۔

ہفتہ وار اخبار مرزا حیرت کا کرزن گزٹ تھا اور سید سجاد حسین کیف کا دہلی گزٹ۔ کیف صاحب کے نواسے اختر انصاری اکبر آبادی نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ کیف صاحب حیدر آباد سندھ میں ہیں۔ اُن کی عمر نوے سے اوپر ہوگی۔

مولانا مظہر الدین کا ہفتہ وار الامان اُن کے روزنامہ وحدت سے بہت زیادہ مقبول رہا۔ ہفتہ وار الجمعیۃ انقلاب ۱۹۴۷ء کے وقت ہفتہ وار تھا۔ آجکل خدا معلوم ہفتہ وار ہے یا روزانہ۔ اُس کا نام کبھی کبھی کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔

لالہ شیو نرائن بھٹناگر نے بھی ایک ہفتہ وار اخبار نکالا تھا۔ "سوراجیہ" آجکل سوراجیہ نام کا اخبار پروفیسر شمبھو ناتھ چوپڑہ نکال رہے ہیں۔ ایک ہفتہ وار پرچہ مسٹر آر۔ سی۔ لہری کا تھا "خبردار" ایک ہفتہ وار پرچہ چودھری احمد بخش کا تھا "جنرل نیوز" ایک ہفتہ وار پرچہ ڈاکٹر شفیع احمد کا تھا "دستکاری"[1] اور ایک ہفتہ وار پرچہ مسٹر دیپ چند

---

[1] دستکاری اب لاہور سے نکل رہا ہے۔ بیگم شفیع احمد اُس کی ایڈیٹر ہیں۔ ڈاکٹر شفیع احمد کا انتقال ہو گیا۔

جین کا تھا۔ جین سنسار، اور سب ہفتہ وار پرچوں کا سردار تھا سردار دیوان سنگھ مفتون کا۔ "ریاست" اخبار ریاست بہت ہی شاندار پرچہ تھا۔ اس زمانے کا سب سے اعلیٰ اردو ہفتہ وار اخبار الہلال تھا جسے مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ سے نکالتے تھے ویسا اخبار بھلا کون نکال سکتا ہے لیکن ظاہری شان میں الہلال ریاست سے بڑھا ہوا نہیں تھا۔ صرف اشتہاروں سے ریاست کی آمدنی ہزار ہا روپے ماہانہ تھی، سردار دیوان سنگھ جتنا شاندار پرچہ نکالتے کم تھا۔ پھر سردار صاحب کی تحریر کی ایک خصوصیت ہے۔ ریاست سردار صاحب نے جوانی میں نکالا تھا اور اب سردار صاحب عمر کی [illegible] ستر منزلیں طے کر چکے ہیں لیکن تحریر بدستور جوان ہے۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ سردار صاحب کی تحریر ہی کا نہیں، خود سردار صاحب کا وصف بے ساختہ پن ہے۔ سردار صاحب خود بھی بناوٹ اور تصنع نہیں جانتے اور سردار صاحب کا قلم بھی بناوٹ اور تصنع نہیں جانتا۔ سردار صاحب اپنے آپ کو اور اپنے خیالات کو بچر بچر کے سامنے نہیں پیش کرتے۔ اس بات نے سردار صاحب کی تحریر میں ایسا زور بھر دیا ہے جو اُن سے اچھا لکھنے والوں کی تحریر میں نہیں ہوتا اور ایسی پختگی بخش دی ہے جس کی بنا پر سردار صاحب کو قطعی صاحب طرز لکھنے والا کہا جا سکتا ہے۔

ریاست کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں بڑے بڑے اہل قلم اور زبان داں صاحبان اور اور مضامین لکھتے تھے یا اوروں کے مضامین کی اصلاح کرتے تھے۔ ریاست کا ایڈیٹوریل ہمیشہ سردار صاحب نے لکھا۔ کبھی سردار صاحب بیمار پڑ جاتے تھے اور ایڈیٹوریل

www.taemeernews.com

کوئی دوسرا لکھتا تھا تو ریاست پھیکا اور پھُس پھُسا سمجھا جاتا تھا اور پڑھنے والوں کو مزا نہ آتا تھا۔ سردار صاحب کے کسی خلاف محاورہ فقرے کا ہلا دینا ایڈیٹوریل مضمون کی جان سلب کر لینا تھا۔

ریاست کے بعد سید محمد انوار ہاشمی اور مفتی شوکت فہمی کا ہفتہ وار اخبار بھی کافی شاندار تھا۔ اس کا نام میں بھول گیا۔ شاید دین و دُنیا ہی ہفتہ وار نکلتا تھا۔ یاد آگیا! عادل نام تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کا منادی بھی کچھ دن ہفتہ وار رہا۔ بھتیجا احسان الحق ہفتہ وار منادی کو ایڈٹ کرتے تھے۔ اب منادی بھی ماہوار ہے اور دین و دنیا بھی ماہوار۔ دین و دنیا کے ایڈیٹر تنہا فہمی صاحب ہیں۔ ہاشمی صاحب پاکستان آگئے اور رسالہ منادی کے ایڈیٹر خواجہ حسن ثانی نظامی ہیں۔

ہفتہ وار درویش میرا اور منشی عبدالحمید خاں کا پرچہ تھا اور ہفتہ وار عادل مفتی شوکت فہمی کا۔ ہفتہ وار انقلاب میرا دوہ پرچہ تھا جسے مولانا عارف ہسوی ایڈٹ کرتے تھے۔ ہفتہ وار خطیب بھی میرا پرچہ تھا۔ اُسے میں خود ایڈٹ کرتا تھا۔

مندرجہ ذیل ماہنامے شروع سے ماہنامے تھے اور ماہنامے ہی رہے۔ دلی کا سب سے پہلا اُردو ماہنامہ "زبان" تھا جو لالہ چند ولال چاول والے کی ملکیت تھا اور لالہ جنیشور پرشاد مایل اس کے ایڈیٹر تھے۔ جنیشور پرشاد مایل آغا شاعر کے شاگرد تھے۔ ماہنامہ زبان سے پہلے گلدستوں کا زور تھا۔ جیسے مذاق سخن مولانا راسخ کا گلدستہ تھا۔ مولانا راسخ اپنے ہاں مہینے کے مہینے مشاعرہ کرتے تھے اور مشاعرے کی طرح

www.taemeernews.com

غزلیں ماہوار مذاق سخن میں چھاپ دیتے تھے۔ مذاق سخن میں میری بھی ایک دو غزلیں چھپی تھیں اور ماہنامہ تبان میں میرے افسانے چھپتے تھے۔ ماہنامہ زبان لاہور کے ماہنامہ مخزن کا چربہ تھا۔

پھر لاہور کا ماہنامہ مخزن خود دلی آگیا اور کئی سال دلی سے نکلا۔ شیخ عبدالقادر بیرسٹر جو بعد میں سر عبدالقادر کہلائے اور ہائی کورٹ کے جج۔ وزیر ہند کے مشیر اور خدا معلوم کیا کیا ہوئے مخزن کے ایڈیٹر تھے اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ شیخ محمد اکرام نے بھی قیام دلی کے دوران میں بیرسٹری پاس کرلی تھی۔ شیخ محمد اکرام تادم آخر دلی میں رہے ۱۹۴۳ء تک زندہ تھے۔

مخزن جب دلی آیا تو شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اکرام نے مولانا راشد الخیری کو اپنا مددگار بنالیا اور جون ۱۹۰۸ء میں شیخ محمد اکرام اور مولانا راشد الخیری نے زنانہ ماہنامہ عصمت جاری کیا۔ شیخ محمد اکرام بیرسٹر ہوگئے تو عصمت مولانا راشد الخیری نے تنہا چلایا۔ اب مولانا رازق الخیری اس کے مالک اور ایڈیٹر ہیں۔ عصمت کامیاب رسالہ ہے۔

جولائی ۱۹۰۹ء میں خواجہ حسن نظامی نے اور میں نے ماہنامہ نظام المشائخ کی بنیاد رکھی۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب مصر، شام، حجاز کا سفر کرکے واپس آئے تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم میری عدم موجودگی میں نظام المشائخ کو سنبھال سکتے تھے تو میری موجودگی میں بھی سنبھال سکتے ہو۔ لہٰذا آج سے تم جانو اور نظام المشائخ جانے۔ تم ہی اس کے مالک اور تم ہی اس کے ایڈیٹر

www.taemeernews.com

میں نے خواجہ صاحب کا نام بحیثیت سرپرست لکھوا دیا اور اپنا نام بحیثیت ایڈیٹر۔ آج کل میں نظام المشایخ کا صرف مجاور ہوں اور اپنے اور خواجہ صاحب کے تعلق کی یادگار سمجھ کر اُسے سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔ دِلّی میں منجھلا لڑکا سید علی مقتدیٰ واحدی، ایڈٹ کرتا تھا، کراچی میں سنجھلا لڑکا سید موسیٰ رضا واحدی ایڈٹ کرتا ہے اور چھوٹا لڑکا سید عیسیٰ رضا واحدی بھائی کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

ماہنامہ ساقی مسٹر شاہد احمد، بی۔ اے نے جاری کیا۔ عصمت خواتین کے مطلب کا رسالہ ہے۔ نظام المشایخ میں دینی چاشنی غالب ہے۔ ساقی خالص ادب کا علمبردار ہے اور دِلّی ہی کے نہیں تمام مُلک کے اُردو ماہناموں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ دِلّی چھوڑ کر کراچی ساقی کو بھی آنا پڑا ہے۔ لیکن اُس کی آن بان میں فرق نہیں آیا ہے۔ ماہنامہ عصمت کی آن بان بھی بدستور ہے۔

ہاں مولانا راشد الخیری نے ایک ماہنامہ "تمدن" جاری کیا تھا۔ یہ ادبی پرچہ تھا۔ مولانا راشد الخیری کا "تمدن" بند ہو گیا تو قاری عباس حسین نے اُسے پھر نکالا لیکن اُن کا "تمدن" بھی زیادہ دن نہ جیا۔

مخزن جب دِلّی میں تھا تو ساڑھے تین ہزار چھپتا تھا۔ اُس وقت کسی ماہنامے کا ساڑھے تین ہزار چھپنا بہت بڑی بات خیال کی جاتی تھی۔ لیکن ماہنامہ مولوی پینتیس اور چالیس ہزار تک پہنچا اور ماہنامہ پیشوا بھی دس بارہ ہزار چھپنے لگا تھا۔

مولوی سعید احمد اکبرآبادی۔ ایم۔ اے کا بُرہان غالباً ۱۹۴۲ء سے پہلے یعنی

میرے زمانے کی دلی میں جاری ہو چکا تھا۔ یہ معارف اعظم گڑھ کے درجہ کا ماہنامہ ہے۔
میں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون۔ منشی عبدالحمید خاں اور حافظ عزیز حسن بقائی قریباً ہم عمر صحافی ہیں۔ اور جس ترتیب سے میں نے اپنا اور باقی تینوں کا نام لکھا ہے اسی ترتیب سے آگے پیچھے ہم چاروں نے میدان صحافت میں قدم رکھا تھا اور بفضلہ چاروں کامیاب صحافی رہے۔ جی، ہاں، ناکام میں بھی نہیں رہا۔ کچھ نہ کچھ صحافت سے میں نے بھی حاصل کیا۔ روپیہ بھی اور ساکھ بھی اور سردار دیوان سنگھ مفتون اور منشی عبدالحمید خاں کی کامیابی کا تو کیا ٹھکانا تھا۔ لیکن اب ہم چاروں نے کندھوں پر سے جُوا اُتار پھینکا ہے۔ کامیابی کبھی ہمارے پیچھے پیچھے دوڑتی تھی اور اب ہم کامیابی کے پیچھے دوڑتے ہیں اور کامیابی اس طرح آگے نکل جاتی ہے جس طرح انسان کا سایہ آگے نکل جاتا ہے اور اُن کے ہاتھ نہیں آتا۔

حافظ عزیز حسن بقائی مرنے سے دو سال پہلے پیشوا کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ منشی عبدالحمید خاں نے رسالہ مولوی کو صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی مدیر آستانہ و پیام مشرق کی نذر کر دیا تھا۔ فاروقی صاحب نظر بند نہ ہو جاتے اور جیل میں نہ ڈال دیئے جاتے تو مولوی اُن کے زیر اہتمام نکلنے والا تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون اعلان کر رہے ہیں کہ ریاست بس چھ مہینے کا اور مہمان ہے۔ موجودہ ریاست کو قدیم ریاست سے وہ نسبت بھی نہیں ہے جو موجودہ نظام المشائخ کو قدیم نظام المشائخ سے ہے۔ میری اور سردار صاحب کی لکھنے کی قابلیت سلب نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ یہ قابلیت تو الحمد للہ ترقی پر ہے۔ لیکن کامیاب بننے کا جذبہ ہم سے سلب کر لیا گیا ہے اور تو اور، یہ جذبہ یا یہ جوش خواجہ حسن نظامی جیسے حوصلہ مند اور

ف اس معاملے کے رُک جانے نے منشی عبدالحمید صاحب میں پھر جان پیدا کر دی ہے اور اب وہ بڑی مستعدی سے رسالہ مولوی اور کتابوں کا کاروبار چلا رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

باہمت انسان کا کم ہو گیا تھا۔ سردار صاحب غالباً اتفاق نہیں کریں گے لیکن میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جو کامیابی زیر بحث ہے اُس کامیابی کا ہملا وقت ختم ہو چکا ہے۔ کوئی دوسری کامیابی ہمیں میسّر آنی ممکن ہے لیکن زیر بحث کامیابی کا خیال ہمیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ زیر بحث کامیابی اب نوجوانوں کا حصّہ ہے اور نوجوان اُس سے محروم نہیں ہیں۔ اُردو کی کساد بازاری کے باوجود رسالہ شمع دہلی لاکھ سوا لاکھ چھپتا ہے اور آستانہ دہلی کی بھی ساٹھ پینسٹھ ہزار اشاعت ہے۔[1]

میں نے اور مسٹر فصیح الدین، ایم۔ اے نے ایک ادبی رسالہ "ادیب" کے نام سے نکالا تھا۔ فصیح الدین کے مر جانے سے وہ بھی مر گیا۔ خاصے عرصے نکلا اور ٹھاٹھ سے نکلا۔ روپیہ اُس پر فصیح الدین لگاتے تھے اور فصیح الدین کو روپیہ لگانا اور روپیہ کمانا آتا تھا۔ میں تو ادیب کے زمانے میں بھی روپے سے بیزار سا تھا۔

اور ماہوار رسالے دِلّی کے یاد نہیں رہے۔ رسالہ آستانہ میرے زمانہ میں نہیں نکلا تھا۔ میرے ترکِ وطن کے بعد نکلا ہے۔ انور صاحب کا رسالہ ہا نو بھی میرے کراچی آجانے کے بعد نکلا تھا۔ ہاں رسالہ شمع نکل چکا تھا۔ دو رسالے پیر جی عبداللہ فاروقی نکالتے تھے۔ ایک محشر خیال۔ دوسرا خاتون مشرق۔ اب بھی نکالتے ہیں۔

اُردوئے معلّٰی منشی قربان علی بسمل کا رسالہ تھا۔ شاہجہاں سیّد دہمی آہر کا۔ ہونہار، فیاض حسین کا۔ تحفہ، ایس۔ ایم۔ یوسف کا۔ طبی دنیا خواجہ محبوب علی کا۔ رہبر خواجہ عشرت حسین کا۔ بچے، ایس۔ عبداللہ قریشی محمود کا۔ اور سوراجیہ، دیوان شمبوناتھ

---

[1] جس وقت میں نے یہ سطریں لکھی تھیں اُس وقت خدا معلوم طبیعت پر کیا اثر تھا۔ لیکن یہ سطریں چھپنے کے لئے جانے لگیں تو سردار صاحب کی کتاب ناقابل فراموش نے پہنچ کر میرے خیال کو بدل دیا۔ سردار صاحب میں بفضلہ تعالیٰ کافی زندگی باقی ہے۔ بڑھاپے کا داؤں اُن پر نہیں چلا ہے۔ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت ابھی موجود ہے۔

www.taemeernews.com

چوپڑہ کا رسوا جیہ اب غالباً ہفتہ وار ہے)۔ مسٹر ظفر نیازی جن کا ماہنامہ نقاد کراچی میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ دلی میں رسالہ کامیاب نکالتے تھے۔ کامیاب بھی کامیاب رسالہ تھا۔

حکیم حافظ محمد سعید کا ماہنامہ ہمدرد صحت دلی میں بھی آب و تاب سے نکلتا تھا اور کراچی میں بھی آب و تاب سے نکل رہا ہے۔ حکیم عبد الحمید مالک ہمدرد دواخانہ دہلی اور حکیم محمد سعید مالک ہمدرد دواخانہ کراچی، دونوں بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیاوی تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ نعمتوں میں ایک نعمت یہ ہے کہ دونوں خلقۃً ادیب ہیں۔ دونوں صرف لکھنے کا شغل اختیار کر لیتے تو بے مثل ادیب ہوتے۔ حکیم محمد سعید اپنے طبی رسالہ کو اتنا دلچسپ اور کارآمد بنا دیتے ہیں کہ دوسرا نہیں بنا سکتا۔ ہمدرد صحت کراچی زبان و بیان کے اعتبار سے معیاری رسالہ ہے۔ ہمدرد صحت دلی اب نظر سے نہیں گزرتا۔ سنا ہے شایع ہوتا ہے۔

حافظ عزیز حسن تھانوی نے رسالہ پیشوا کا گلا گھونٹا تھا۔ میں اب اس مضمون کا گلا گھونٹتا ہوں۔ جس دھوم دھام سے اسے شروع کیا تھا، اور شروع کیا گیا تھا، برابر لکھتا رہا۔ اُس طرح آجکل نہیں لکھا جاتا۔ مجھے (Low Blood Pressure) یعنی خون کا دباؤ کم پڑ جانے کا مرض ہے۔ کسی کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، میرا گھٹ جاتا ہے۔ یہ انسان کو کام کا نہیں رکھتا۔ آنکھوں میں پانی اُترنے کی میں نے پرواہ نہیں کی۔ لکھے گیا۔ مگر اب تو لکھنے کی اُمنگ ہی غایب ہے۔ آجکل مرض کا دورہ نہیں، دور دورہ ہے ؎

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

میرے زمانے کی دلی کا مواد دماغ میں اتنا ہے کہ مضمون چار پانچ گُنا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تندرستی دیدی اور تکمیل کی طاقت بخشی تو کتاب کا دوسرا، تیسرا، چوتھا حصہ شایع کروں گا۔ ورنہ اللہ حافظ۔

میر ممتاز علی رسوئی والوں والے) حکیم علی رضا خاں (کوچہ چیلان) حکیم علی رضا خاں (فراش خانہ)۔ مولوی عبد الحکیم (ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول، ماسٹر الفت رائے

ماسٹر امیر چند۔ نواب مصلح الدین۔ نواب فخر الدین۔ کپتان سید حامد۔ جسٹس سید محمود۔ سر راس مسعود۔ مولوی شمس الاسلام۔ سید مناظر علی تحصیلدار۔ حاجی شیخ عطاء الرحمٰن ربانی مدرسہ اہلحدیث) میر انوار احمد (محلہ بلی ماران) مسٹر نور الدین بیرسٹر۔ سید رضا مرزا وکیل۔ مسٹر عظمت اللہ وکیل۔ تمیز الدین خاں میونسپل کمشنر۔ مسٹر محمد اسماعیل صوفی (اسسٹنٹ پرائیویٹ سکریٹری وزیر اعظم پاکستان) پادری احمد مسیح۔ قاضی حشمت اللہ۔ لالہ مدن موہن لال (دلی کلاتھ ملز) سر شنکر لال (دلی کلاتھ ملز) لالہ راج نراین کھنہ۔ لالہ گھاسی رام۔ سید محمد یعقوب (مرحوم امام جامع مسجد کے بھتیجے) شیخ یعقوب (سبزی منڈی والے) جیسے بے شمار حضرات کا تذکرہ باقی ہے۔ اور دِلّی کی دستکاریوں۔ دِلّی کی رسموں اور دِلّی کی متعدد خصوصیات پر لکھنا ہے اور تلک الایام نداولہا بین الناس کا نقشہ دکھانا ہے اور سمجھانا ہے کہ ؎

زرنج و راحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل
کہ آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

شروع میں جن اور مضامین کی فہرست دی گئی تھی وہ موجود ہیں لیکن فی الحال اُنھیں چھوڑ دیجئے۔ اُن سے زیادہ ضروری حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی سوانح عمری ہے۔ اُس کا ایک حصّہ مکمل کر چکا ہوں۔ دوسرا حصّہ سوانح عمری کا بھی لکھنا مشکل ہے۔ اب تو لکھوں گا تو صرف حیات سرورِ کائناتؐ کے اگلے حصّے لکھوں گا۔ یا ایک کتاب۔ "اللہ کا اسلامی تصوّر" شروع کر رکھی ہے وہ جہاں تک چل سکے گی چلاؤں گا۔ باقی جو کچھ چھپے سمجھ لیجیے کہ پہلے کا لکھا سمیٹا جا رہا ہے۔

بھارت میں "میرے زمانے کی دِلّی" شائع کرنے کا حق سردار دیوان سنگھ مفتوں، ایڈیٹر ریاست دہلی کو ہے۔ کوئی اور صاحب اسے چھاپنا چاہیں تو اُن سے اجازت لے لیں۔

م۔ا۔ واحدی نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس۔ کراچی میں چھپوا کر دفتر نظام المشائخ ۱۲۴ جیکب لائنز کراچی نمبر ۳ سے شائع کیا۔

www.taemeernews.com

اکثر شبِ تنہائی میں   کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں   بیتے ہوئے دِن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی

دِلّی کا پھیرا

از

ملّا واحدی دہلوی

مکرم گستر۔ سلام علیکم:۔

آپ کے ورودِ دہلی کی خبر سُن کر دل تڑپ گیا تھا۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر پہنچوں اور جس حسرت و تمنّا سے آپ اپنی دہلی کو دیکھ رہے ہوں گے بس اُس کا نظارہ کرکے واپس آجاؤں ؎

ہم دیکھنے والے کی نظر دیکھ رہے ہیں

اِس کا بھی تو ایک مرتبہ اور مقام ہے۔

دعاگو و دعا خواہ: عبدالماجد (دریابادی)

قیمت دس آنے

www.taemeernews.com

یہ مختصر سا سفرنامہ سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب
کے نام معنون کرتا ہوں، جو دلّی میں اب میرے سب سے
پُرانے ساتھی ہیں اور دِلّی کی واقعی آخری شمع ہیں۔

واحدی

۵۔ ربیع الاوّل ۱۳۷۹ھ

۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

www.taemeernews.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دلّی کا پھیرا

۱۲ / اپریل ۱۹۵۹ء ۱۲ / اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دِلّی سے چلا تھا۔ جب سے دِلّی چھٹی ہے دل میں خوشی کی لہر نہیں اُٹھی اور آنکھوں میں مسرت کے آنسو نہیں آئے۔

قلبِ مضطر کوئی یوں ہر دم نہیں رہتا نڈھال
پھول بھی ہم نے بہت دیکھے ہیں کمھلائے ہوئے

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آج گیارہ سال، پانچ مہینے، تئیس دن گزار کر دلّی جا رہا ہوں۔ خوشی کی لہر، اور مسرت کے آنسو ڈھونڈنے۔ لیکن یہ اب میری قسمت میں کہاں!

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

سفر کی عادت نہیں ہے۔ سفر کے تصور سے جی گھبراتا ہے۔ دو بڑی لڑکیاں، ماں کے مرنے کے بعد سے پھوپا پھوپی کے پاس اجمیر شریف تھیں۔ وہیں اُن کی شادیوں کی تقریبیں ہوئیں۔ میں ایک لڑکی کی شادی میں گیا تو

www.taemeernews.com

میرے منجھلے بھانجے فرید احمد میرے ہاں تھے۔ انھوں نے سفر کی گھبراہٹ دیکھ لی۔ دوسری لڑکی کی شادی کے وقت ہوئی۔ خاں صاحب سید احمد صاحب نے لکھ دیا کہ آپ مت آئیے ــــ مگر اے دلی! تیرے لئے میں اتنے طویل سفر پر آمادہ ہو گیا ہوں۔

ٹھوکریں کھاتا ہوں لیکن جا رہا ہوں سوئے دوست
دیکھتا ہی کچھ نہیں ہوں اس سفر کے سامنے

توبہ توبہ شکایت نہیں کرتا۔ ناشکرگزار نہیں ہوں۔ دلی کے فراق سے مجھے بہت سی نعمتیں ملی ہیں۔

غمِ عشق سی چیز مجھ کو فلک
ملی اور پھر کس قدر مل گئی

ایک کیفیت ہے، جو ساڑھے گیارہ سال سے طاری ہے۔ دلی جاکر دوبارہ چرکا کھانا چاہتا ہوں، تاکہ اس کیفیت میں کمی نہ پڑ جائے اور باقی زندگی اسی کیفیت میں گزر جائے۔

زخمِ دل مظہر مبادا بہ غود آگاہ باش
کایں جراحت یادگار ناوکِ مژگان اوست

کیفیت سے دست بردار ہونے کی کوئی صورت ہے تو فقط یہ کہ مدینہ منوّرہ حاضر ہو جاؤں اور وہاں کی فضا میں اپنے آپ کو گم کر دوں۔ ورنہ

بڑھا وصل سے اور بھی سوزِ عشق
یہ رونا رہا عمر بھر کے لئے

دلّی کا سفر پُر لطف ہوتا اگر سارا گھر جاتا۔ فقط میاں علی مقتدیٰ دادری سنبھالنے کی غرض سے ہمراہ ہیں۔ بچپن میں انھیں لئے لئے پھرتا تھا۔ اب یہ

www.taemeernews.com

مجھے سنبھالیں گے۔ ذٰلک فضل اللّٰہ۔

خیر عید کے تیسرے دن پونے چار بجے تیزگام میں سوار ہوا اور تیزگام نے لاہور کا رُخ کیا۔

مولانا ماہرالقادری۔ مولانا ماہر دہلوی۔ مولانا رازق الخیری۔ مسٹر صادق الخیری۔ قاری عباس حسین۔ خواجہ علی نظامی۔ مسٹر انیس ہاشمی قیسی رامپوری۔ ڈاکٹر محمد الیاس، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیلتھ سروسز۔ مسٹر لطیف الرحمٰن صدیقی۔ مسٹر محمود احمد خاں۔ ڈاکٹر ایم، ایچ سجاد، ڈی۔ڈی۔ ایس۔ مسٹر رضا، سکریٹری ڈاکٹر سجاد صاحب۔ مسٹر بدرالاسلام، اسسٹنٹ رجسٹرار کراچی یونیورسٹی۔ بھائی وحید مرزا۔ رسالدار میجر حاجی کامیاب خاں رخصتی ملاقاتیں کرنے آئے۔ خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن او۔بی۔ای۔ نواب قمرالاسلام۔ حمید شاہ خاں۔ محمد شریف خاں۔ احمد مجتبیٰ واحدی۔ موسیٰ رضا واحدی۔ عیسیٰ رضا واحدی۔ مسٹر خورشید احمد۔ مسٹر یامین۔ مسٹر احمد مصطفےٰ خاں۔ محمد علی۔ رخسانہ۔ سیما اور عبدالرحیم بن ہر نظامی نے ریلوے اسٹیشن تک مشایعت فرمائی۔ حسن ہر نظامی صاحب ایک اسٹیشن آگے تک ساتھ رہے۔ ان سب کی یاد شریک سفر ہے۔

۱۳ اپریل ۱۹۵۹ء ریل میں وقت آرام سے کٹا۔ تیزگام کے انٹرکلاس کی تعریف سُنی تھی اور اُسی کی سیٹوں کو ریزرو کرایا تھا، جیسا سُنا تھا ویسا پایا۔ ایسا انٹرکلاس انگریزوں کے زمانے میں نہیں ہوتا تھا۔ بعض اعتبار سے یہ انٹرکلاس سیکنڈ سے اچھا ہے۔ کراچی اور لاہور کے درمیان ریگستان ہے۔ موجودہ انٹرکلاس کے شیشے کچھ اس طرح چڑھائے گئے ہیں کہ خاک نے بہت کم ستایا۔

www.taemeernews.com

روانگی سے قبل ڈبے صاف بھی خوب تھے۔ لیکن صبح آنکھ کھلی تو صفائی باقی نہیں رہی تھی۔ ریل کا عملہ شاید صفائی کی طرف صبح شام توجہ کرنی ضروری نہیں سمجھتا۔ ڈائننگ کار کا انتظام بھی خراب ہے۔ کل شام خالی چاء کی دو پیالیاں ساڑھے دس آنے میں ملی تھیں۔ آج ناشتے کا بکس تین روپے ایک آنہ چارج کیا گیا۔ چاء شام کی بھی بدمزہ تھی اور صبح کی بھی۔ صبح دودھ جو لایا گیا وہ پھٹ چکا تھا، مگر اُسے ڈائننگ کار والوں نے بدل ضرور دیا۔ رات کو ریگستان کا اندھیرا اور دن کو ریگستان دیکھتے دن کے ساڑھے بارہ بجے لاہور پہنچے ــــــ ریگستان کی چاندنی راتیں بھی دیکھنے کے لائق ہیں، اور ریگستان کی اندھیری راتیں بھی۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر خواجہ فضل احمد خاں رشیدا۔ قاضی عبدالواحد سابق کسٹوڈین شاہی قلعہ لاہور۔ پرنس خیرالدین خورشید جاہ۔ ہیڈ آف دی ایکس مغل رائل فیملی اور میاں ممتاز احمد موجود تھے۔ اسٹیشن سے میاں احمد حسین کے ہاں گلبرگ کالونی آئے۔ احمد حسین میرے سب سے بڑے بھانجے ہیں اور ممتاز احمد سب سے چھوٹے بھانجے۔ پرنس خیرالدین صاحب نے کراچی تار بھی بھیجا تھا اور آج بھی اصرار فرمایا کہ میرے ہاں قیام کیجیے۔ میں نے عرض کیا کہ قیام تو یہیں رہنے دیجیے۔ اپنے ذمے لاہور کا دکھانا اور جن جن سے میں یہاں ملنا چاہتا ہوں، اُن سے ملانا رکھیے۔ کل علی الصباح وہ اور قاضی صاحب اور رشیدا صاحب آئیں گے اور ہم لاہور کا گشت کرنے نکلیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

۱۴ اپریل ۱۹۵۹ء پچاس برس پرانی بات ہے میں ایک دفعہ لاہور آیا تھا۔ جب (سر) شیخ عبدالقادر نے دفتر وکالت دلّی سے لاہور منتقل کیا ہے اور ڈاکٹر محمد اقبال نے نئی نئی وکالت

www.taemeernews.com

شروع فرمائی ہے۔ مجھے اور حضرت خواجہ حسن نظامی کو غلام غوث صمدانی (سابق اسٹیٹ انجینئر بہاولپور) کی شادی میں جالندھر جانا پڑا تھا۔ صمدانی صاحب اُن دنوں علی گڑھ کالج کے طالبعلم تھے، اور ہم لوگوں کے دوست تھے۔

جالندھر میں خواجہ صاحب نے کہا، ڈاکٹر صاحب اور شیخ صاحب سے ملتے چلیں۔ ہم گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے دفتر پہنچے۔ شیخ صاحب کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ دو پہر سے رات تک چاروں دفتر میں بند بیٹھے رہے۔ جو انارکلی بازار میں تھا۔ رات کے نو بجے ڈاکٹر صاحب اور شیخ صاحب ہمیں اسٹیشن پہنچا گئے۔ انارکلی بازار کا تو تھوڑا سا تصور ہے۔ لیکن اسٹیشن سے انارکلی اور انارکلی سے اسٹیشن کا مطلق تصور نہیں۔ لہٰذا اس آنے کو نہ آنا ہی سمجھنا چاہیئے اور میں لاہور دیکھنے گویا آج پہلی دفعہ نکل رہا ہوں۔

سوا آٹھ بجے پرنس خیرالدین اور بھائی فضل احمد صاحب تشریف لے آئے۔ اُن دونوں کے ہمراہ ہم دونوں (باپ بیٹے) شاہی مسجد پہنچے۔ شاہی مسجد کے دروازے پر ایک طرف علامہ اقبال مدفون ہیں اور دوسری طرف سر سکندر حیات۔

میں تربت اقبال کے سامنے کھڑا ہوں اور مجھے ۱۹۰۵ء کا وہ دن یاد آرہا ہے کہ اقبال تکمیل علوم و فنون کرنے یورپ جا رہے ہیں۔ میر غلام بھیک نیرنگ اور شیخ محمد اکرام (معاون مدیر مخزن) نے اُن کا لاہور سے دلی تک ساتھ دیا اور دلی میں منشی نذر محمد (ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، دلی) اور خواجہ حسن نظامی ریلوے اسٹیشن پر پیشوائی کو پہنچے۔ ریل سے اتر کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اقبال نذر محمد صاحب کے مکان میں ٹھیرے جو ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا۔ وہاں سے قافلہ درگاہ آسمان پائے گاہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ میں حاضر ہوا اور اقبال نے مزار کے پاس تخلیہ کرا کر مندرجہ ذیل نظم پڑھی

اور پارٹی کی خاطر باہر کھڑے ہو کر اسے دوبارہ سُنایا ہے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر[1] سے اونچا مقام ہے تیرا

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق
دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

کرم کرم، کہ غریب الدّیار ہے اقبال
مُرید پیرِ نجف ہے، غلام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہار توام

کیا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو
مجھے ہزار مبارک، مری زباں مجھ کو

ملا ہو زو نوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بیکراں مجھ کو

فلک نشین صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

رہوں میں خادمِ خلقِ خدا جیوں جب تک
نہیں ہے آرزوئے عمرِ جاوداں مجھ کو

قسم ہے اپنے دلِ دردمند کی آقا!
تری تمنا کے لئے حق نے دی زباں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کی آواز میں درد اور لہجے میں رقّت ہے۔ احباب، اور دوسرے حاضرین بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص آفرین اور آمین پکارنے لگتا ہے۔ درگاہ سے پارٹی خواجہ حسن نظامی کے گھر جاتی ہے اور لنگر کا کھانا کھاتی ہے۔ خوش گلو قوال ولایت خاں[2] جو ابھی نو عمر ہے، غالب کی غزلیں گا تا رہتا ہے۔

[1] شاعرانہ مبالغہ ہے [2] مرحوم۔

www.taemeernews.com

خواجہ صاحب کے ہاں سے سب مرقدِ غالب پر جاتے ہیں۔ میر نیرنگ مرقد کے سرھانے لوحِ مرقد پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ اُن کے دائیں جانب اقبال عالمِ محویت میں سرنگوں ہیں۔ باقی حضرات مرقد کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ہیں۔ دو بجے کا وقت۔ ستمبر کا مہینہ۔ دھوپ تیز اور ہوا بند۔ مگر کسی کو گرمی کا خیال نہیں آتا۔ ولایت دست بستہ عرض کرتا ہے۔ حضور! مرزا صاحب کی ایک غزل اجازت ہو تو پیش کروں۔ سرود بہ مستاں یاد دہانیدن۔ یہاں کے سعد معلّم صاحب نے کہا۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی	دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی

اور ان دو شعروں نے ہلچل مچا دی ؎

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے، بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

غزل ختم ہوئی اور کئی منٹ میں ہوش بجا ہوئے تو باری باری اقبال نے غالب کی لوحِ تربت کو بوسہ دیا اور دلّی ریلوے اسٹیشن کا راستہ لیا۔

میں نے مزارِ اقبال پر فاتحہ پڑھ کر شاہی مسجد کے اندر قدم رکھا۔ اورنگ زیب کی اِس یادگار نے شاہجہاں کی یادگار کا نقشہ سامنے لا کھڑا کیا۔ فرق فقط اتنا ہے کہ شاہجہاں کی جامع مسجد میں ایک انچ بڑھنے اور ایک انچ گھٹنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اورنگ زیب کی جامع مسجد کا صحن ذرا غیر متناسب ہے۔ جامع مسجد لاہور کی بابت بھائی فضل احمد صاحب نے بتایا کہ جب بہ سلسلہ ملازمت ۱۹۰۱ء میں وہ لاہور آئے تو صحن کی تینوں سمتیں کھنڈر ہو رہی تھیں۔ اُنھوں نے کچھ حصّے دکھائے جو آج بھی کھنڈر ہیں اور فرمایا کہ تینوں سمت یہ حالت تھی۔ اللہ سکندر حیات کو کروٹ کروٹ جنّت

www.taemeernews.com

عطا فرمائے اُس نے توجہ کی اور اتنا روپیہ جمع کر دیا اور ایسا بندوبست کیا کہ مرمت ہو رہی ہے اور مسجد دُلہن بنی جاتی ہے۔ مسجد سے باہر آ کر مرقد سر سکندر حیات پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔ علامہ اقبال سے عمر بھر تعلق رہا۔ سر سکندر سے صرف ایک مرتبہ سر شری رام (دلّی کلاتھ ملز) کے کسی ایٹ ہوم میں ملا تھا۔

شاہی مسجد سے اپنے خالہ زاد بھائی سیّد معین الدین کے ہاں گیا۔ اُن کے مکان کے نیچے ڈاکخانہ ہے۔ مسٹر ولی اشرف صبوحی دہلوی، اُردو کے مشہور و معروف افسانہ نویس اور ادیب وہاں پوسٹ ماسٹر ہیں، اُن سے مِلا۔ پھر مسٹر مظہر انصاری کے پاس پہنچا۔ مظہر انصاری صاحب بھی دِلّی کے پرانے لکھنے والے ہیں۔ قندیل لاہور اور رہنمائے لاہور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اب کتابوں کی دوکان کر لی ہے۔ دوپہر کا کھانا پرنس خیر الدین کے ساتھ کھایا۔ کھانا کھا کر بھائی فضل احمد کے ہاں دو گھنٹے ٹھیرا۔ بھائی صاحب کے مکان اور پرنس کی کوٹھی میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ پھر بھائی فضل احمد کی بیٹی صغیرہ اور داماد سیّد افضال حیدر زیدی کے ہاں ہوتا اور پروفیسر سیّد صغیر علی فریدآبادی۔ مولوی شمس الاسلام حقّی۔ مسٹر حمید نظامی اور خواجہ محمد شفیع سے ملتا قیام گاہ آگیا۔

آج چوہدری نذیر احمد خاں صاحب (پریسیڈنٹ بار ایسوسی ایشن لاہور)[1] نے مجھے، میرے لڑکے علی مقتدیٰ واحدی اور میرے بھانجے احمد حسین کو شام کے کھانے کی دعوت دی تھی۔ احمد حسین طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے نہیں جا سکے۔ کھانے میں کراچی کے سابق میئر اور سندھ کے رئیس مسٹر حاتم علوی بھی شریک تھے، انھوں نے ہی ہمیں واپس قیام گاہ پہنچایا۔

---

[1] قائد ملّت لیاقت علی خاں کے زمانے میں وزیر صنعت تھے۔ اب جنرل محمد ایوب خاں نے پاکستان کا اٹارنی جنرل مقرر کیا ہے۔

www.taemeernews.com

۵ ار اپریل ۱۹۵۹ء دو روز سے یہ ہو رہا ہے کہ پرنس خیرالدین اور بھائی فضل احمد صبح آٹھ بجے آجاتے ہیں۔ پرنس تھوڑی دیر ساتھ پھرتے ہیں۔ پھر موٹر ہمارے حوالے کرکے خود کرائے کی سواری میں اپنے کاموں کے لئے چلے جاتے ہیں۔ بھائی فضل احمد صاحب شام تک رہتے ہیں۔ بھائی مجھ سے آٹھ نو سال بڑے ہیں۔ اسّی سے اوپر عمر ہے۔ انھیں میں نے تھکا مارا ہے۔ میں بھی خلاف معمول مصروفیت سے تھک جاتا ہوں۔ لیکن لاہور کب کب آؤں گا اور دلی کب کب جاؤں گا۔

تھک کر مر بھی جاؤں تو کیا ہے اور بھائی صاحب کی اسی طرح لکھی ہے، تو اسے کون روک سکتا ہے۔

آج اول حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں حاضر ہوئے۔ وہاں سے پرنس کو رخصت کیا اور بھائی کو پکڑے رکھا۔ اُن کے بغیر لاہور دیکھ کیسے سکتا ہوں۔ لاہور دیکھنا ہے تو انھیں تکلیف دینی ہی پڑے گی۔ انھیں فہرست دے دی ہے کہ ان ان صاحبان سے ملنا چاہتا ہوں۔ جن کا مکان راستے میں آجائے گاڑی رکوائیے، اور ملوا دیجئے۔

آج ملنے فقط آغا شورش کاشمیری سے گیا تھا۔ مولانا محمد ادریس (برادر سحبان الہند مولانا احمد سعید) کی دکان شورش صاحب کے پڑوس میں ہے۔ مگر ادریس صاحب دلی گئے ہوئے تھے۔

شورش صاحب کے ہاں سے جہانگیر کے مقبرے گیا۔ جہانگیر کا مقبرہ ہمایوں کے مقبرے سے بڑا ہے لیکن اس کی وضع قطع ہمایوں کے مقبرے اور منصور کے مقبرے کے مشابہ ہے۔ شاہی مسجد نے دلی کی جامع مسجد کو سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی درگاہ نے حضرت سلطان المشائخؒ کی درگاہ کا نقشہ کھینچ دیا۔ جہانگیر کے

www.taemeernews.com

مقبرے میں ہمایوں اور منصور کے مقبروں کی فضا ہے۔ چرکوں کی ابتدا ہو گئی۔ درگاہ حضرت داتا گنج بخشؒ میں خواجہ غریب نواز سلطان الہند حضرت معین الدین اجمیریؒ کا چلّہ ہے۔ جہاں خواجہ خواجگان معتکف رہے ہوں، وہاں کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش کی درگاہ میں جو مسجد ہے اُس کی پیشانی پر اس قسم کے ارشادات مرقوم ہیں:

۱۔ جس کام میں نفسانی غرض شامل ہو جائے اُس سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔

۲۔ "نماز ایسی عبادت ہے کہ طالبانِ حق اللہ تعالیٰ کی راہ میں ابتداء سے لے کر انتہا تک اِس ذریعے سے راستہ پاتے ہیں"۔

یہ ارشادات داتا صاحب کے ہیں۔

جہانگیر کے مقبرے کے برابر آصف خاں کا مقبرہ ہے، اور اُس کے برابر نور جہاں کا مقبرہ۔ نور جہاں، جس کا نام جہانگیر کے نام کے ساتھ سکّہ پر کندہ کیا جاتا تھا۔ جہانگیر سے ذرا دور سو رہی ہے۔ قبر شکستہ ہو گئی تھی۔ حکیم اجمل خاں نے اسے درست کرایا۔ حکیم صاحب کی طرف سے ایک کتبہ بھی لگا ہوا ہے۔ مگر قبر سے الگ گنبد کی دیوار میں۔ قبریں گنبد کے نیچے دو ہیں۔ خدا معلوم نور جہاں کی قبر کونسی ہے۔ ممکن ہے حکیم صاحب کو بھی معلوم نہ ہو، اور اسی لئے لوحِ مزار، مزار پر نہ لگائی ہو۔

آصف خاں، نور جہاں کا وہ بھائی تھا جس کی بیٹی ممتاز محل شاہجہاں کی ملکہ تھی۔ آصف خاں نے شاہجہاں کو تخت دلانے میں نور جہاں کا مقابلہ کیا تھا۔ نور جہاں شہریار کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی جو اُس کا داماد تھا۔ شیر افگن سے جو بیٹی ہوئی تھی وہ شاہزادہ شہریار سے منسوب تھی۔

جہانگیر کے مقبرے میں رونق ہے۔ آصف خاں اور نور جہاں کی قبریں عالمِ کس پرسی میں ہیں۔ جہانگیر اور نور جہاں دونوں لاہور کے عاشق تھے۔ یہاں کی مٹی کو دارالسلطنت آگرہ کی مٹی پر دونوں نے ترجیح دی تھی۔ نور جہاں کا ایک شعر

www.taemeernews.com

صلاح الدین صاحب (ایڈیٹر ادبی دُنیا) نے سُنایا کہتی ہے ۔

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم

جان دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

بارہ بجے قیام گاہ لوٹ آئے ۔ بھائی فضل احمد صاحب کو آرام کرنے کی مہلت دے دی ۔ میں بھی کچھ لکھتا رہا، کچھ سوتا رہا ۔ چار بجے پرنس خیرالدین صاحب نے فون کیا کہ موٹر بگڑ گئی ہے ۔ ورکشاپ بھیج رکھی ہے ۔ آپ کوئی اور انتظام کر کے حمید نظامی صاحب کے ہاں چلے جائیے ۔ حمید نظامی صاحب (ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت) نے مجھے چاء نوشی کے لئے بلایا ہے ۔ پانچ بجے اُن کے ہاں ہونا چاہئے ۔ اب کیا کروں ۔

گلبرگ لاہور کی ایسی کالونی ہے جہاں کا ہر مکین موٹر نشین ہے ۔ کرایہ کی سواری یہاں آسانی سے نہیں ملتی ۔ میرے بھانجے سیّد احمد حسین کے پاس بھی موٹر ہے ۔ لیکن وہ ہمہ وقت اُن کے کام میں رہتی ہے ۔ احمد حسین کی طبیعت آج کل اچھی نہیں ہے ۔ اس کے باوجود انہیں مسلسل مصروف دیکھتا ہوں ۔ ابھی دفتر میں ہیں ابھی ایرپورٹ ۔ احمد حسین پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کی لاہور برانچ کے منیجر ہیں ۔

خیر میں نے احمد حسین کے بیٹے اور اپنے پوتے آصف کو رہنما بنایا اور بس اور تانگے کی تلاش میں نکلا ۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک خالی تانگہ دکھائی دیا جو کسی کو پہنچا کر واپس جا رہا تھا ۔ میل ڈیڑھ میل کا سفر طے کیا ہوگا کہ پرنس کی موٹر تعاقب کرتی آگئی اور موٹر نے ٹھیک پانچ بجے حمید نظامی صاحب کی کوٹھی میں جا اتارا ۔ بھائی فضل احمد صاحب پرنس کے ساتھ تھے ۔

حمید نظامی صاحب نے میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں (سابق سفیر پاکستان برائے ترکی) ڈاکٹر جاوید اقبال ، بیرسٹر (فرزند علامہ اقبال) مسٹر صلاح الدین ایڈیٹر ادبی دنیا ، آغا شورش کاشمیری ، ایڈیٹر اخبار چٹان ، خواجہ عبدالرحیم بیرسٹر (سکریٹری بزم اقبال لاہور) اور کئی

www.taemeernews.com

اور حضرات کو مدعو کیا تھا۔ میری طبیعت کے مطابق اجتماع تھا۔ یہ اجتماع کافی دیر رہا۔

۱۶۔اپریل ۱۹۵۹ء آج دوپہر کا کھانا بھائی فضل احمد صاحب کے ہاں کھانا ہے۔ اس لئے وہ تشریف نہیں لا سکے۔ اُن کے ہاں جانے سے قبل میں چوہدری غلام احمد صاحب پرویز سے ملا۔ پھر میاں سلطان احمد صاحب وجودی کے گھر گیا۔ وجودی صاحب موجود نہیں تھے۔ وجودی صاحب کے گھر سے حضرت شاہ ابوالمعانی کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ اس درگاہ کو لوگوں نے بے غور اچھوڑ رکھا ہے۔ گیارہ بجے تک جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ گنبد کی چھت کِھل کِھل ہو رہی ہے۔ مقبرہ جہانگیر کے منارے کی طرح نہ جانے کب گر پڑے اور کب دو چار جانیں لے لے۔

دوپہر کو بھائی فضل احمد کے ہاں دعوت تھی اور شام کو آغا شورش کاشمیری کے ہاں۔ آغا صاحب نے متعدد نئے حضرات سے ملاقات کا موقع دیا۔ خواجہ عبدالرحیم اور مسٹر حمید نظامی کی بھی ایک دفعہ اور صورت دیکھ لی۔ مرحوم جرنلسٹ سید حبیب شاہ کے برادر زادے سید عنایت شاہ اور ڈائرکٹر نوڈ، میاں محمد شفیع بھی شریک طعام تھے۔ سید عنایت شاہ پاکستان کے مشہور فلمساز ہیں۔

۱۷۔اپریل ۱۹۵۹ء احمد حسین کی طبیعت آج اتنی مضمحل ہے کہ دفتر نہیں جا سکے۔ اُن کی دلہن میری ہر بات کا خیال رکھتی ہیں۔ کل اُنھوں نے احمد حسین سے کہا، ماموں صاحب کا اور بڑے بَنّا کا ملنا رہا جاتا ہے۔ بڑے بَنّا یعنی خان بہادر سید محمد، میرے چچا زاد اور میرے بہنوئی خاں صاحب سید احمد کے حقیقی بڑے بھائی۔

مجھے علم نہ تھا کہ خان بہادر صاحب لاہور کی سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ محکمہ نمک کی اسسٹنٹ کمشنری سے پنشن لینے کے بعد وہ دِلّی کلاتھ مل والوں کے

www.taemeernews.com

محکمہ شکر سازی (دو سال ۲ کے منیجر ہو گئے تھے اور وہاں سے ۱۹۴۷ء میں لائلپور کاٹن مل آ گئے تھے۔ میں احمد حسین کی موٹر لے کر صبح سوا آٹھ بجے بھائی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میجر رفیق بھائی صاحب کے منجھلے داماد بھی تشریف فرما تھے۔ رفیق صاحب میرے دوست خواجہ احمد اللہ مرحوم کے فرزند ہیں۔

ڈیڑھ بجے پرنس خیر الدین۔ قاضی عبد الواحد اور خواجہ فضل احمد خاں شیدا آ گئے اور ہم سب نماز جمعہ کے لئے گئے۔ پرنس نماز جمعہ درگاہ حضرت داتا صاحب کی مسجد میں پڑھا کرتے ہیں۔ وہ وہاں اُتر پڑے۔ ہم شاہی مسجد پہنچے۔ شاہی مسجد میں ولی اشرف صبوحی منتظر تھے۔ اُنھیں بھی ساتھ لیا اور شاہی قلعہ دیکھنے چلے۔

قاضی عبد الواحد صاحب محکمہ آثار قدیمہ کے آدمی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے اسی شاہی قلعہ کے کسٹوڈین تھے۔ پچھلے سال پنشن ہوئی ہے۔ قلعہ کو دکھانے والا ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ قلعہ کا چپہ چپہ دکھایا۔ قلعہ میں اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور عالمگیر کی یادگاریں ہیں اور کہیں کہیں عہد رنجیت سنگھ کے نشانات بھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کی خواب گاہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ شاہجہاں کی لاہوری خوابگاہ کا دلی کے لال قلعہ میں بھی جواب نہیں ہے۔ باقی عمارتوں کی نسبت قاضی صاحب کا یہ ریمارک لکھ دینا کافی ہے کہ شاہجہاں نے یہاں اپنے طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی اور دلی اور آگرہ میں اُس کی تکمیل کر دی۔

میں تو یہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں ؎

اے گل بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

شاہی قلعہ میں قلعہ کے ہیڈ کلرک صاحب نے چاء پلائی۔

شاہی قلعہ سے شالامار باغ پہنچے۔ شالامار میں ہماری خاطر فوارے چلا دیے گئے تھے اور شالامار کی بہار کو مکمل کر دیا گیا تھا۔ عصر کی نماز شالامار کے مخملی

www.taemeernews.com

نوش فرمائی۔

شالامار باغ سے درگاہ حضرت میاں میرؒ گئے۔ حضرت کے مزار پر اور حور بانو بنت خواجہ حسن نظامی کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ درگاہ حضرت سلطان المشائخ کی حور بانو درگاہ حضرت میاں میرؒ میں دفن ہیں۔

درگاہ حضرت میاں میرؒ سے پرنس خیرالدین کی کوٹھی آئے۔ بے ضابطہ تو اُن کا دسترخوان ہر وقت بچھا رہا لیکن آج باضابطہ دعوت ہے۔ مسٹر حمید نظامی۔ آغا شورش کاشمیری۔ سید احمد حسین۔ خواجہ فیض احمد شیدا۔ خواجہ ظہیر احمد اور قاضی عبدالواحد وغیرہ بلائے گئے ہیں۔ میرے ساتھ علی مقتدیٰ واحدی تو ہر جگہ ہوتے ہی ہیں۔

۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء آج انشاء اللہ دلّی روانہ ہونا ہے۔ لاہور سے جا رہا ہوں۔ مجھے لاہور بہت پسند آیا۔ کراچی کی بے آبی اور بے گیاہی کا لاہور بدل ہے۔ پاکستان میں بہ حیثیت مجموعی اس جیسا شہر دوسرا نہیں۔ افسوس میں نے اسے پہلے کیوں نہ دیکھا۔ بار بار دیکھنے کے لائق شہر ہے۔ مگر میں اب بار بار کہاں دیکھ سکتا ہوں۔ لاہور باغوں کا شہر ہے اور یہاں کے لوگوں میں زندگی ہے۔ لاہور میں پنجاب کے تمام اوصاف سمٹ کر جمع ہو گئے ہیں اور تعلیم نے اُن پر صیقل کر دی ہے۔ لاہور والوں کے پاس آنکھیں ہیں، جن سے وہ دیکھتے ہیں، دل ہے، جس سے وہ محسوس کرتے ہیں، دماغ ہے جس سے وہ سوچتے ہیں۔ تندرستی ہے، جو اُن سے عمل کراتی ہے۔ وہ سوچتے نہیں رہ جاتے، کر کے دکھاتے ہیں۔

اُردو کا مستقبل اہلِ پنجاب کے ہاتھ میں ہے، وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں، مسلمان ہوں یا ہندو اور سکھ۔ لاہور پنجاب کا دل ہے۔ اچھا

www.taemeernews.com

لاہور خدا حافظ۔ تجھے معلوم رہے کہ میں اُس دور میں پیدا ہوا تھا جب دلّی صوبہ پنجاب میں تھی۔ اور ۱۹۱۱ء کے بعد بھی مجھے جن باہر والوں سے واسطہ رہا ہے وہ سب پنجاب کے تھے۔

ساڑھے بارہ بجے احمد حسین کی کوٹھی سے رخصت ہوا۔

کراچی میں میری ایک پوتی ہے۔ میرے لڑکے 'محمد مجتبیٰ واحدی کی بیٹی۔ اُسے میں نے مینا کا خطاب دیا ہے۔ لاہور میں بھی مجھے ایک پوتی مل گئی۔ میرے بھانجے احمد حسین کی بیٹی۔ وہ ماشاء اللہ بُلبُلِ ثانی ہے۔ بُلبُل میں اُس کی پھوپی یعنی اپنی بھانجی اُمتہ النصیر کو کہا کرتا تھا۔ بُلبُلِ ثانی کو غالباً اللہ میاں نے بتا دیا ہے کہ دادا ابا صرف اُسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اُن کی طرف توجہ کرنے میں پہل کرے۔ میں اپنے دل پر بُلبُلِ ثانی کا نقش لیے جاتا ہوں۔

آج صبح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملا تھا۔

بھائی فضل احمد اور پرنس خیر الدین ٹرین میں سوار کرانے آئے۔

بھارت کے مسافروں کو ٹرین میں سوار ہونے سے قبل ایک برزخ سے سابقہ پڑتا ہے، جسے قبر تو نہیں کہتے، چیک پوسٹ کہتے ہیں، لیکن مجھے یہی محسوس ہوا کہ قبر میں پہنچا دیا گیا ہوں اور ساتھی منکر نکیر کے حوالے کر کے واپس چل دیئے ہیں۔ پرنس نے غالباً میرے احساس کو محسوس کیا اور وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بھائی صاحب سمیت چیک پوسٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کی فضا ایسی تھی کہ میرا جی چاہا کہ دلّی کا خیال ترک کر دوں اور کراچی کے ٹکٹ منگالوں۔

مسٹر سلیم الدین، انجنیئر ہم سفر ہیں۔ سلیم صاحب فرسٹ کلاس میں ہیں اور ہم سکنڈ کلاس میں۔ سلیم صاحب ہمارے پاس برابر پھیرے کرتے رہے۔ اُن سے کافی مدد ملی اور تقویت رہی۔

www.taemeernews.com

امرت سر چک پوسٹ کا منظر بھی لاہور چک پوسٹ جیسا تھا۔ ہم کراچی سے قریباً بے سامان آئے ہیں اور انشاء اللہ دلی سے بے سامان جائیں گے اور شاید ہماری صورتوں پر یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ چک پوسٹ لاہور میں ہم سے فقط اتنا پوچھا گیا کہ پاکستانی روپے کتنے ہیں۔ پاکستانی روپے ہمارے ہاتھ میں تھے۔ ہم نے سامنے رکھ دیئے۔ امرتسر چک پوسٹ میں اتنا بھی نہیں پوچھا گیا۔

چک پوسٹوں کو پل صراط بنانے والے عملے سے زیادہ مسافر ہوتے ہیں۔ خصوصاً مسافر عورتیں۔

امرتسر میں دو میاں بیوی تشریف لائے۔ خاصی اچھی حیثیت کے۔ بیوی نے چک کرنے والے کو بتایا کہ میرے شوہر پنشنر ڈپٹی پوسٹماسٹر ہیں۔ میاں زیادہ بوڑھے تھے۔ بیوی بھی بوڑھی تھیں، مگر شاید دوسری بیوی ہوں۔ بیوی نے چک کرنے والے سے بات چیت کی۔ میاں سعادتمند شوہر بنے خاموش کھڑے رہے۔ بیوی کے نزدیک قانون کی خلاف ورزی کرلینی معمولی چیز تھی۔ اُنھوں نے اپنی بھی مٹی پلید کرائی اور معصوم شوہر کو بھی ذلیل کرایا۔

لاہور سے دلی تک کے سفر میں ہمیں ویسا آرام نہیں ملا۔ جیسا کراچی سے لاہور تک کے سفر میں ملا تھا، حالانکہ لاہور تک ہم انٹر کلاس میں آئے تھے۔ اور لاہور سے دلی تک سیکنڈ کلاس میں آئے۔ تیز گام کا انٹر فرنٹیر میل کے سیکنڈ سے زیادہ صاف ستھرا اور آرام دہ ہے۔

۱۹ر اپریل ۱۹۵۹ء

کیا مرا چاند نکلنے کو ہے اے ہم سفرو!
میری پلکوں پہ ستارے سے یہ لرزاں کیوں ہیں

آنکھ کھلی تو میرٹھ کا اسٹیشن پیش نظر تھا۔ میرٹھ ہم اور خواجہ حسن نظامی صاحب اکثر آیا کرتے تھے۔ جب بھیا احسان الحق میرٹھ کے

www.taemeernews.com

رئیس تھے، میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ راستے کا ہر اسٹیشن جانا پہچانا تھا۔ اتر انہیں، ریل میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ اسٹیشنوں کی عمارتیں نہیں بدلی ہیں۔ تختیاں بدلی گئی ہیں۔ اُردو کو اُن پر سے ہٹا دیا ہے۔ دلّی کا اسٹیشن بھی حسب سابق تھا۔ اضافے ہوئے ہوں گے تو دور ہوئے ہوں گے۔

میرے پھوپی زاد بھائی قاری سرفراز حسین مرحوم کے فرزند قاری اخلاق حسین اور میرے خالہ زاد بھائی خاں صاحب سیّد محمد ادریس کے فرزند مطیع احمد اور دوسرے خالہ زاد بھائی سیّد محمد اسحاق کے فرزند رئیس احمد[ل] موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ ۱۵ اپریل سے تینوں روزانہ آرہے ہیں۔ اور صاحبان بھی آتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی سلطان جی سے آ کر مایوس گئے۔ خواجہ انیس حسن بقائی سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور شاہ صابر حسین سجادہ نشین درگاہ حضرت صابر بخشؒ اور حکیم عبدالسلام زبیری کی بابت بھی سُنا کہ آتے رہے۔

میں نے لکھ دیا تھا کہ عنقریب دلّی پہنچوں گا۔ یہ نہیں لکھا تھا کہ کس دن اور کس وقت پہنچوں گا۔ میں احباب کو تکلیف سے بچانا چاہتا تھا۔ مگر انہیں اُلٹی زیادہ تکلیف ہوئی۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ میرے اندازے کی غلطی تھی۔

میرا خیال تھا کہ معتقدی بھائی ادریس صاحب کے ہاں اخلاق حسین صاحب کی موٹر میں چلے جائیں گے اور میں صبح کی واکنگ کرتا گڑھیا پہنچوں گا۔ لیکن اسٹیشن سے باہر نکلا تو دلّی کی دُنیا تبدیل پائی۔ راستہ نہ سمجھ سکا۔ لہٰذا موٹر میں

ل مطیع احمد اور رئیس احمد کو میں نے نہیں پہچانا تو رشتے یوں منقطع ہوا کرتے ہیں، ورنہ دنیا میں کون ہے جس سے کہیں نہ کہیں پہنچ کر میرا اور آپ کا تعلق نہ نکل آئے گا۔
خیر ابھی ہمارے رشتہ داروں کی اور ہماری صرف قومیت میں فرق پڑا ہے۔ وہ بھارتی اور ہم پاکستانی۔ سب ایک قوم نہیں رہے۔

www.taemeernews.com

بیٹھ گیا۔ اوّل سیدھا چاندنی محل گیا۔ جہاں کبھی تحصیل تھی، وہاں اب پاکستان سے جامع مسجد کی طرف آنے والوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اپنی حاضری درج کرانی ہوتی ہے۔ وہ کمرہ دیکھتا رہا جس میں میرے مرحوم دوست میر محمد حسنین، تحصیلدار عدالت کیا کرتے تھے۔ خاص اسی کمرے میں رپورٹ درج کی جاتی ہے۔

چاندنی محل سے بھائی محمد ادریس صاحب کے ہاں پہنچا۔ غسل کیا۔ چائے پی۔ اور فوراً جامع مسجد جا کر دو نفل پڑھے۔ مولوی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ مولوی آ گئے تھے، وہ ہمراہ تھے۔ پھر مولوی اسرار حسن خاں صاحب تشریف لے آئے۔ وہ ریلوے اسٹیشن بھی گئے تھے۔ پیرزادہ عبدالحق فاروقی آ گئے۔ جامع مسجد سے پوری پارٹی مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مزارات پر حاضر ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک وسیع کٹہرے میں، خوشنما چھت کے نیچے آرام فرما ہیں۔ چاروں جانب سرسبز لان ہے اور پانی سے بھرے حوض ہیں۔

راستے میں ڈکٹوریا زنانہ ہسپتال رُکا۔ بھتیجی صابرہ کی عیادت کی اور بھاوج کو سلام کیا۔ ہسپتال کے قریب عزیز محمد خاں حسن پوری مل گئے۔

اب میں پہلے مُردوں سے ملوں گا۔ درگاہ صابریہ[1]، دریا گنج میں حضرت شاہ صابر بخش اور حضرت شاہ میر عبداللہ کے مزارات پر فاتحہ خوانی کی۔ اِن حضرات کے

---

[1] اس درگاہ سے مجھے قسم قسم کی دلچسپی ہے۔ بچپن میں اسی درگاہ کے آگے میں کھیلا کرتا تھا۔ درگاہ کے دروازے کے پاس درخت کے نیچے ایک بہت بڑا پتھر رکھا رہتا تھا۔ کھیلتے کھیلتے تھک جاتا تو اس پر جا بیٹھتا تھا۔ وہ پتھر اور وہ درخت دونوں اب بھی موجود ہیں، میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر وہ ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

دوم یہ کہ حضرت شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ میری پردادی کے والد میر نجف علی خاں (آخری فوجدار شاہان مغلیہ) کے پیر تھے۔ شاہ صاحب کی رحلت کے وقت اُن کے

(باقی نوٹ صفحہ ۴۲۱ پر)

www.taemeernews.com

سجادہ نشین شاہ صابر حسین صاحب اور اُن کے فرزند ناصر میاں اور ایک پُرانے ہم محلہ محمد حسین صاحب موجود تھے۔ پھر مہندیوں کے قبرستان پہنچا یہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کی اور ہمارے خاندان کی ہرواڑہ ہے۔ میری والدہ، دادا۔ دادی، کئی چچا۔ کئی پھوپیاں۔ پہلی بیوی اور متعدد عزیز یہاں ہیں۔ مہندیوں سے جدید قبرستان گیا۔ اس میں عزیز بھی ہیں اور دوست بھی۔ مولانا راشد الخیری۔ مولانا عارف ہسوی۔ مسٹر فصیح الدین۔ شیخ یعقوب۔ منشی قربان علی بسمل۔ خواجہ فضل احمد شیدا کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد احمد اور لڑکیاں حمیدہ اور نعیمہ جدید قبرستان میں ہیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۱۷) فرزند حضرت شاہ میر عبداللہ صاحب آٹھ نو برس کے ہوں گے۔ شاہ صاحب نے انھیں میر نجف علی خاں کے سپرد فرمایا تھا۔ میر نجف علی خاں اپنے پیرزادے سے کس طرح پیش آتے تھے یہ لکھنے کی بات ہے۔ پیرزادہ صاحب ناشتہ کرتے تو، اور پیرزادہ صاحب کھانا کھاتے تو، میر نجف علی خاں ضرور حاضر رہتے۔ ناشتہ اور کھانا ملازم پیش کرتا لیکن میر نجف علی پیرزادہ صاحب کے سامنے دوزانو اور دست بستہ بیٹھے ہوئے ملازم کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔ آٹھ سالہ پیرزادہ صاحب مسند پر تشریف فرما ہوتے تھے اور ساٹھ سالہ میر نجف علی خاں مسند سے باہر۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ میر نجف علی خاں صاحب نے میر عبداللہ صاحب کی کیا کیا کچھ خدمت نہ کی ہوگی۔ میر عبداللہ صاحب کی اولاد میر نجف علی خاں کی خدمات کو آج تک سراہتی ہے اور میر نجف علی خاں کی اولاد سے دلی لگاؤ رکھتی ہے۔ موجودہ سجادہ نشین کے پردادا حضرت میاں امیر حسین صاحب عید کے دن ہمارے سب چھوٹے بڑوں کو عیدی دیا کرتے تھے۔ چھوٹوں کو ایک ایک پیسہ اور بڑوں کو دو دو پیسے۔ میں نے بھی یہ ایک پیسہ بارہا لیا ہے اور آج بھی میرا جی چاہ رہا تھا کہ پرانی رسم کو تازہ کروں۔ عید کا مہینہ تو ہے ہی، صابر میاں سے کہوں کہ عیدی دلوائیے۔

www.taemeernews.com

گُل ملول، افسردہ سبزہ، شمع گُل، بالیں اُداس
جی بھر آیا حالتِ گورِ غریباں دیکھ کر

قبرستان سے نکلا تو حکیم عبدالسلام صاحب زئی بھی سینہ چاکانِ چمن سے آملے اور پوری پارٹی درگاہ حضرت سلطان المشائخ روانہ ہوئی۔ اوّل حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں خبر پاتے ہی خواجہ صاحب کے صاحبزادگان خواجہ زید نظامی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی، خواجہ مہدی نظامی اور بھتیجے، خواجہ حسن مثنیٰ اور پیرزادہ اسلام الدین امام مسجد درگاہ۔ ڈاکٹر ناصر الدین۔ قاضی صفدر علی۔ خواجہ ابوحامد وغیرہ آ گئے۔

خواجہ صاحب کے مزار پر خواجہ صاحب کا خود نوشتہ کتبہ لگا ہوا ہے۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہ قبر ایک مسلمان کی ہے۔ اس خاک میں وہ سوتا ہے جس نے دُنیا کی بیداری میں سونے والوں کو جگانے کی خاطر اچھی اور بری موت کا فرق قلم کی بجلی سے زندہ کر کے دکھا دیا۔

چار دن کی شہرت پر گھمنڈ نہ کرنا کہ یہ بھی بہت مشہور تھا۔ قوتِ تحریر و تقریر کا غرور دل میں نہ لانا کہ اس کی طاقتِ انشا پردازی نے بھی تمام ہندوستان میں دھاک بٹھا دی تھی۔ مگر آج وہ ساری دھوم اس تودۂ خاک میں چُپ چاپ پڑی ہے۔

یہ اُس کی قبر ہے جس نے الواحِ قبور اُس وقت لکھیں جب کہ دُنیا کی کسی زبان میں اُن کی نظیر موجود نہ تھی۔ لیکن یہ بے مثال باتیں ایجاد کرنے والا بھی آخر مر گیا اور کہہ گیا کہ کام آخرت کی نیت سے کرنا۔ جس کا نتیجہ لازوال ہے، اِس زندگی کے لئے نہیں، جہاں کا رہنا

www.taemeernews.com

چند ساعت کا خواب و خیال ہے۔"

خواجہ صاحب کے مزار پر فاتحہ خوانی کر کے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور پھر حضرت سلطان المشائخؒ کے مزار پر تھوڑی دیر خواجہ صاحبؒ کے مکان میں بیٹھا۔

درگاہ سے واپسی کے بعد خواجہ انیس حسن نقائی۔ گردھاری لال بقال۔ سحبان الہند مولانا احمد سعید۔ لالہ داتا رام۔ حکیم مطلوب احمد۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں۔ حکیم عبدالحمید، متولی ہمدرد دواخانہ۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی۔ قاری زید احمد اور حسنی خاکروب سے ملا۔ جسے دیکھتا ہوں وہ یہ شعر یاد دلا دیتا ہے:۔

یہ کس کی نظر سے نظر مل گئی
دلِ گم شدہ کی خبر مل گئی

۲۰ اپریل ۱۹۵۹ء صبح چار بجے بیدار ہوا۔ پونے پانچ بجے حکیم عبد السّلام زبی تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ جامع مسجد گیا۔ نماز فجر ادا کی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے دِلّی کے ایک طیلچی کا قصہ لکھا ہے جو بیل گاڑی میں سوار حیدر آباد دکن جا رہا تھا۔ گاڑی جامع مسجد کے قریب پہنچی تو اُس کی مت پلٹ گئی اور اُس نے کہا ؎

کیا ہمسری ہو اِس کی بھلا کیا مجال ہے — اِس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی وضع میں یہ نرالی جہان سے — اُتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسمان سے

سب شعر یاد نہیں۔ اور جتنے یاد ہیں اُن کی صحت میں شبہ ہے لیکن آخری بند غالباً اس طرح تھا ؎

اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑی بان پھیر — اب پھیرے دنیاں سے تو قسمت کا جان پھیر

www.taemeernews.com

دِلّی سا شہر چھوڑ دکن کو نہ جائیں گے ساری یہاں نہ کھائیں گے آدھی ہی کھائیں گے

کیا کہنے ہیں اُس طبلہ بجانے والے کے جس نے وطن کی محبّت کے آگے خلعتِ فاخرہ کی پرواہ نہ کی تھی۔

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

صفحۂ روزگار پر دِلّی کی جامع مسجد فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہے ؎

گر ز طاق و قبّۂ ایں مقصورہ جوئی نشاں

ہیچ نتواں گفت غیر از کہکشانِ آسماں

زر بودے قبّۂ گر گردوں نبودے ثانیش

طاق بودے قبّۂ گر گردوں نبودے سائباں

جامع مسجد سے گاندھی سمادی گیا۔ گاندھی سمادی سے پانچ منٹ کے فاصلے پر پنڈت نیلو رام کا مکان ہے۔ پنڈت جی نے میرے اور میر حسنین تحصیلدار کے ساتھ بیس برس مسلسل صبح کی ہوا خوری کی ہے۔ مگر ساڑھے گیارہ برس کی جدائی میں پنڈت جی میری صورت بھول گئے تھے۔ مگر جب پہچانا تو اخلاص کا قدیمی رنگ عود کر آیا۔ محبّت مجسم بن کر گلے لگا لیا۔

راستے میں لیاقت علی، داروغہ صفائی اور مشہور روشنائی والے لطف خاں کے نواسے نواب محمد ادریس ملے۔ پھر سید محمد جعفری صاحب سابق ایڈیٹر ہمدرد کے ہاں گیا۔ جعفری صاحب میرے دوست بھی ہیں اور پڑوسی بھی۔ کوچہ چیلان میں۔ دریا گنج والے نکڑ سے تراہا بیرم خاں تک یہ اکیلے مسلمان ہیں۔ اِس لمبی سڑک کی گلیوں میں دو، دو، چار، چار گھر مسلمانوں کے ادھتائے گئے۔ ایک گھر گلی گڑھیا میں میرے خالہ زاد بھائی محمد اسحٰق صاحب کا بھی ہے۔ اسی سڑک پر وہ مکان ہے

www.taemeernews.com

جو کبھی میرا کہلاتا تھا اور جسے میں اپنا سمجھتا تھا۔ اُسے دیکھتا اور بھائی فضل احمد۔ رسالدار میجر کامیاب خاں۔ سید بدر الاسلام (یونیورسٹی والے) میر محمد حسنین۔ (تحصیلدار) میر محمد حسین (میونسپل کمشنر) محمود احمد خاں۔ آغا محمد طاہر۔ قاضی لطیف الحق حقی۔ رضا ء اللہ (انجنیر) کپتان حبیب الرحمٰن سی۔ آئی۔ ای۔ مسٹر آصف علی۔ قاضی عباس حسین ظریف شیخ محمد یعقوب۔ مسٹر فصیح الدین (سکرٹری ہارڈنگ لائبریری) پروفیسر مرزا محمد سعید۔ بھیّا احسان الحق۔ مسٹر عظمت اللہ وکیل اور بابو محمد دین ملنسار کے مکانوں پر صدا لگاتا آگے بڑھ گیا ؎

جس گھر پہ پکارا، آئی ندا
اِس گھر میں تمہارا کوئی نہیں

اِن مکانوں کے پرانے مکیں کچھ پاکستان چلے گئے اور کچھ قبرستان میں جا سوئے۔

دریا گنج کا بازار بڑی رونق پکڑ گیا ہے۔ لیکن دریا گنج سے میں کوچہ چیلان میں داخل ہوا تو کوچہ چیلان کی حالت برعکس دیکھی۔ کوچہ چیلان کے تمام مکان اور کوچہ چیلان کی تمام دکانیں مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ اس لئے اُن کی مرمّت نہ ہونے سے چھجے غائب ہو گئے ہیں۔ سفیدی نہ ہونے سے اندھیرا اندھیرا سا ہے، اور مکینوں کے بدل جانے سے فضا بدل گئی ہے۔ مرگھٹ کا سا نظارہ ہے۔

میں سوچا کرتا تھا خواجہ صاحب کے مدفن اور اپنی رہائش گاہ کو دیکھ کر قوّتِ برداشت کہیں جواب نہ دے دے۔ مگر خواجہ صاحب کے مزار پر تو عدم یکسوئی نے حفاظت کی۔ بہت سے کرم فرما آ گئے تھے اور رہائش گاہ کے سامنے پہنچا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ سمجھ ہی نہ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن ؎

میرے سکوت سے مجھے بے حس نہ جانئے　　لفظوں ہی کی کمی ہے خیالات کی نہیں

www.taemeernews.com

قلب میں اک آگ سی بھڑکی بھڑک کر رہ گئی

اور

اس گھٹا میں برق سی چمکی چمک کر رہ گئی

وطن میں آج آ کے چشمِ عبرت خوب روئی ہے — یہ گلیاں وہ ہیں طفلی و جوانی جن میں کھوئی ہے

زباں ساکت، نظر محوِ فغاں ہے

یہ اپنا اپنا اندازِ بیاں ہے

حضرت مفتی کفایت اللہؒ کے فرزند مولوی حفیظ الرحمٰن مہتمم مدرسہ امینیہ دلّی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے لڑکوں اور بھانجوں اور بہنوئی مولوی سمیع اللہ اور ملک یونین کے سکریٹری عبدالستار، اور میونسپل کمشنر چودھری عبدالستار نیز مولانا امداد صابری۔ اسمٰعیل غوری۔ مولانا محمد سعید ممبر کارپوریشن۔ مسٹر منعیم الدین فاروقی جنرل سکریٹری کمیونسٹ پارٹی صوبہ دہلی۔ پیرزادہ عبداللہ فاروقی، ایڈیٹر خاتونِ مشرق۔ پیرزادہ عبدالحق فاروقی۔ مرزا صدیق بیگ، مالک و مہتمم محبوب المطابع اور گاماں دفتری کے ہاں ہوتا درگاہ صابرؒ پہنچا اور کھانا سجادہ نشین صاحب کے ساتھ کھایا۔ جعفری صاحب اور فاروقی برادران بھی شریکِ طعام تھے۔ حسینی اور میری بیٹی درگاہ میں ملنے آئیں۔ انھوں نے مجھے اور مقتدیٰ واحدی کو ہار پہنائے۔ یہ دونوں وہی مہترانیاں ہیں جن کی تعریف میں اپنی کتاب "میرے زمانے کی دلّی" میں لکھ چکا ہوں۔ بڑی وفا شعار ماں بیٹیاں ہیں ہمیں دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

گھر پہنچ کر سُنا کہ داروغہ اختر حسین تھوڑی دیر میں آئیں گے اور رپورٹ درج کرانے سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر لے جائیں گے۔ پاکستانیوں کو پولیس چوکی اور سی۔ آئی۔ ڈی کے دفتر دونوں جگہ آمد کی رپورٹ کرنی پڑتی ہے۔

اختر حسین ہمدرد دواخانہ میں ملازم ہیں۔ پہلے پولیس میں تھے۔ اُنھوں نے دفتر سی آئی ڈی کا کام آسانی سے کرا دیا۔

سی آئی ڈی کے دفتر سے حوض قاضی پہنچا اور لالہ شمبھو ناتھ صاحب سے ملا۔ پھر مولانا عبدالسّلام صاحب منشی عبدالقدیر صاحب اور رشید خاں صاحب، پریسیڈنٹ کانگریس کمیٹی وارڈ نمبر ۹ کے ہاں گیا۔

رات کو بعد مغرب محمد مرزا صاحب، سابق ایڈیٹر دستور، خواجہ ہلال قطبی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ مولوی عبدالحمید صاحب' ایڈیٹر رسالہ مولوی۔ اسرار حسن خاں صاحب اور اُن کے فرزند سلطان حسن خاں تشریف لائے۔ دن میں بھی لوگ آتے رہے لیکن دو روز سے میرے پاؤں میں مسلسل چکر رہے' دن کے آنے والوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں رات کو ماشو کی اماں بھی آئی تھیں۔ یہ ۱۹۴۷ء سے قبل میرے ہاں کھانا پکایا کرتی تھیں۔

۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء

لکھنا یاد نہیں۔ ہاں مفتی شوکت فہمی صاحب' ایڈیٹر دین و دُنیا سے بھی ملا تھا اور وہاں سے مسٹر راج نرائن کھنہ کے ہاں حاضر ہوا تھا۔ کھنہ جی میونسپل کمیٹی کے ساتھی تھے۔ انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کے بھائی گنیش جی تشریف رکھتے تھے۔ گنیش جی کے ٹیلیفون سے مسز ارونا آصف علی کو اپنی آمد کی اطلاع کرائی تھی۔ وہ اُس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں۔ آج صبح مولانا احمد سعید صاحب کا خط آیا کہ مسز آصف علی نے فون کیا ہے۔ تین بجے گھر پر انتظار کریں گی۔ پہلے تین بجے تک میں گھر سے نہیں نکلا۔ حکیم عبدالحمید صاحب، متولی ہمدرد دواخانہ۔ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب' صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری۔ خواجہ انیس حسن صاحب اور عبدالمجید صاحب آرٹسٹ تشریف لائے۔ ٹھیک تین بجے مقتدیٔ واحدی کو لے کر مسز آصف علی کے

www.taemeernews.com

ہاں پہنچا۔ حکیم عبدالسّلام صاحب زنّی رہنمائی کے لئے ساتھ تھے۔

مسز آصف علی کا خدمت گار رواجد دروازے سے لگا منتظر کھڑا تھا۔ وہ ہم میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ مگر بڑا سمجھ دار آدمی ہے' ہمیں دیکھ کر اُس نے فوراً کہا۔ آئیے اور لفٹ کے ذریعہ چند سکنڈ میں مسز آصف علی کے پاس پہنچا دیا۔

دِلّی دروازے سے اجمیری دروازے تک شاہجہان آباد دِلّی کی فصیل توڑ کر ایک نہایت خوبصورت بازار بنایا گیا ہے۔ نیچے دُکانیں ہیں' اوپر کئی منزلہ سکنی مکانات۔ نہیں کے ایک فلیٹ میں مسز آصف علی رہتی ہیں۔ اس بازار کا نام آصف علی بازار ہے۔ بازار کے شروع میں مسٹر آصف علی کا اسٹیچو ہے۔ مسٹر آصف علی کے انتقال کے بعد حکومت مسز آصف علی کو صوبہ بنگال کی گورنری دینی چاہتی تھی۔ لیکن اُنھیں مسٹر آصف علی کا عہدہ قبول کرنا پسند نہیں تھا۔ خود گورنری کیا قبول کرتیں؟ میونسپل کارپوریشن کی میئر ہیں۔ میئر کا الاؤنس دو ہزار روپے ماہانہ ہوتا ہے۔ مگر مسز آصف علی یہ الاؤنس نہیں لیتیں۔ میئر کو موٹر اور کوٹھی کارپوریشن کی طرف سے ملتی ہے۔ مسز آصف علی نے اِن دونوں چیزوں کو بھی رد کر دیا۔ میں پرانی وضع کا مسلمان ہوں۔ آصف صاحب کی زندگی میں' میں نے مسز آصف علی سے کبھی گفتگو نہیں کی۔ لیکن آج مجبور تھا۔ آصف علی صاحب کی قبر پر ہو آیا' آصف صاحب کی نشانی سے ملنا بھی ضروری سمجھا۔

ارادہ دس منٹ ٹھہرنے کا تھا۔ مگر مسز آصف علی نے ڈیڑھ گھنٹے بٹھائے رکھا۔ آصف صاحب کے لڑکپن اور جوانی کے قصّے سنتی رہیں' کئی دفعہ آبدیدہ ہو ہو گئیں۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اُٹھنے کی اجازت دی اور فرمایا۔ کسی دن کارپوریشن آئیے۔ آپ کے زمانے کے افسروں سے ملاؤں گی۔ میں نے کہا یہ تو میرے پروگرام کا ایک جزو ہے۔ میں حاضر ہوں گا۔ مجھے کارپوریشن کے ڈپٹی کمشنر مسٹر الیشور دیال اور

www.taemeernews.com

سپرنٹنڈنٹ مسٹر نگم سے خاص طور پر ملنا ہے۔ فرمایا۔ نگم تو پڑوسی ہیں۔ ابھی بلائے دیتی ہوں۔ چنانچہ نگم صاحب سے مسز آصف علی ہی کے ہاں ملاقات ہو گئی۔

مسز آصف علی سے رخصت ہو کر ماسٹر جگت سنگھ صاحب ایڈیٹر رہنمائے تعلیم اور سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون، ایڈیٹر ریاست کے ہاں گیا۔ ماسٹر جگت سنگھ صاحب آج کل دِلّی میں نہیں ہیں۔ ماسٹر صاحب کے صاحبزادے تھے۔ اُن سے مسٹر سرور تونسوی کو فون کرایا۔ اُن کا بھی جواب نہیں آیا۔ سردار دیوان سنگھ صاحب کے پاس کافی دیر ٹھہرا رہا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان خواجہ بلال قطبی۔ رئیس احمد۔ اسرار حسن خاں۔ سعید الودود خاں، اور عبد الشکور مغل تشریف لائے۔

۲۳ اپریل ۱۹۵۹ء

صبح کا ٹہلنا جاری ہے۔ صبح کی نماز جامع مسجد میں پڑھتا ہوں۔ جامع مسجد قیامگاہ سے چار پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہ سونے کا ہوتا ہے، ورنہ آج کل یک سوئی مفقود ہے۔ اِس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بھی روز سنتا ہوں کہ کچھ حضرات آئے تھے۔ روزنامچہ لکھنے کی لاہور میں مہلت مل جاتی تھی۔ دِلّی سے دو سطری خط کراچی نہیں بھیج سکا۔ آج فیصلہ کیا ہے کہ خط بھی لکھوں گا اور روزنامچہ بھی لکھوں گا۔

گیارہ بجے تک لکھتا بھی رہا اور کرم فرماؤں سے ملاقات بھی کرتا رہا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی۔ علامہ انور صابری۔ اسرار حسن خاں اور الاثر دہلوی تشریف لائے۔ گیارہ بجے بھائی محمد اسحٰق کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واپسی پر قاری اخلاق حسین کے ہاں رُکا اور اُن کی بہو، بنت قاری عباس حسین سے کہہ آیا کہ کل علی الصباح آؤں گا اور چاء اخلاق صاحب کے ساتھ پیوں گا۔ اخلاق صاحب گھر پر صبح ہی ملتے ہیں۔ پھر ہمدرد دواخانہ

www.taemeernews.com

چلے جاتے ہیں، جہاں کسی ڈیپارٹمنٹ کا انتظام اُن کے سپرد ہے۔

راستے میں عبدالمجید صاحب، تاجر عطر و تیل اور امیر بخش مرحوم کے بھانجے اور ننھے کالے سے بھی ملا تھا۔

۲۳ راپریل ۱۹۵۹ء ناشتہ قاری اخلاق حسین صاحب اور اُن کے بیٹے جمال میاں کے ساتھ کیا۔ قبل دوپہر پنڈت تیلو رام صاحب۔ پیرزادہ عبدالحق فاروقی صاحب اور مولانا خالد اعظمی صاحب تشریف لائے۔

شام کو پانچ بجے چوہدری احمد بخش صاحب، ایڈیٹر جنرل نیوز سے ملنے نکلا۔ جامع مسجد کے قریب پیرزادہ عبداللہ فاروقی صاحب نظر آ گئے۔ انھیں ہمراہ لے لیا۔ بلّی ماران میں چوہدری احمد بخش صاحب کے علاوہ حکیم ذکی احمد صاحب سے ملا۔ اور حافظ محمد سعید صاحب وکیل کے ہاں پہنچا۔ وہ کچہری سے نہیں پلٹے تھے، واپسی میں ہارڈنگ لائبریری گیا۔ پنڈت کرشن گوپال صاحب لائبریرین نے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک لائبریری کی گورننگ باڈی میں رہ چکا ہوں۔ ویسے لائبریری کا اُس کے قیام کے وقت یعنی ۱۹۱۰ء سے ممبر تھا۔

مغرب کی نماز جامع مسجد میں ادا کی۔ شام کا کھانا خواجہ الیس حسن بقائی کے ساتھ کھایا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی، مفتی شوکت فہمی۔ صاحبزادہ محتشم فاروقی۔ مولوی عبدالحمید۔ مسٹر انور دہلوی۔ حافظ عبدالمنان۔ جمال میاں اور اسرار حسن خاں شریک طعام تھے۔

کھانے کے بعد مسٹر ہری چند اختر کی لڑکی کی شادی میں گیا۔ خبر گرم تھی کہ کنور مہندر سنگھ بیدی ڈپٹی کمشنر، سنگرور آج وہاں ہوں گے۔ مسٹر عرش ملسیانی ملے۔ انھوں نے فرمایا۔ کنور صاحب کل آئیں گے۔

۲۴ راپریل ۱۹۵۹ء دس بجے ٹاؤن ہال پہنچا۔ مسز آصف علی دفتر کے کمرے

www.taemeernews.com

میں تھیں۔ مجھے ملنے کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ جہاں خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب، او، بی، ای۔ میونسپل کمیٹی کے پہلے غیر سرکاری پریسیڈنٹ کی شاندار تصویر آویزاں ہے۔ خان بہادر صاحب اب میری طرح کراچی ہیں۔ خان بہادر صاحب کے بعد ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ اور لالہ شام ناتھ جی پریسیڈنٹ چنے گئے تھے۔ اُن دونوں کی تصویریں بھی خان بہادر صاحب کے دائیں بائیں ہیں۔

ملنے کے کمرے میں بیٹھتے ہی موتی رام لئیسن افسر (LIAISON OFFICER) آ گئے۔ یہ میرے زمانے میں اخبار ہندوستان ٹائمز کے رپورٹر تھے۔ موتی رام صاحب کے پیچھے، پیچھے مسز آصف علی تشریف لے آئیں۔ باتوں باتوں میں فرمایا۔ بدھ کے دن شام کے پانچ بجے پھر آنا ہوگا۔ میرا اپنے عملے سے تو آج مل لیجے، بدھ کی شام کو آپ کے ساتھی ممبروں سے ملانا ہے۔ کہئے تو غیر ممبر دوستوں کو بھی بُلا لیا جائے۔ مثلاً لالہ گوپی ناتھ امن۔

سوا گیارہ بجے مسز آصف علی نے اپنی کار میں روانہ کیا۔ نبی احمد اُن کا ڈرائیور ہے، جو میرے زمانے میں ملک امین الدین مرحوم، اسسٹنٹ سکریٹری، میونسپل کمیٹی کا ڈرائیور تھا۔

افسوس ہے ایشور دیال صاحب، ڈپٹی کمشنر، میونسپل کارپوریشن سے ملاقات نہیں ہو سکی، وہ علیل ہیں۔

دوپہر کا کھانا حسنیؒ کے ہاں کھایا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا محمد سعید صاحب، میونسپل کونسلر اور جعفری صاحب سابق میونسپل کمشنر میر مشتاق احمد صاحب۔ حاجی سلیم صاحب فرزند حاجی صالح صاحب۔ شہزاد بہاری صاحب ماتھر۔ حکیم عبدالسلام صاحب زنی۔ بھائی محمد ادریس صاحب اور عبدالستار صاحب میلک یونین والے اور کئی اور حضرات شریک طعام تھے۔

www.taemeernews.com

حُسنیٰ وہی خاکروب ہے جس کے اخلاص اور جذبۂ خدمت کا تذکرہ کرکے میں نے "میرے زمانے کی دلّی" میں لکھا تھا کہ دِلّی اس لئے بھی نہیں جاتا کہ وہاں حُسنی اور حسینی اور میرو کو دینے کے لئے روپیہ نہیں ہوگا۔

حُسنیٰ نے ایک ہار اور رکھ دیا۔ لیکن یہ ایسا ہار ہے کہ اگر اسے نہ اُٹھاتا تو اُس کا دل ٹوٹ جاتا۔

جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی۔

جامع مسجد کا انتظام گزشتہ پندرہ سال سے سُنّی مجلس اوقاف کے تحت ہو رہا ہے، وہی اُن تمام جائدادوں کی بھی نگراں ہے جو جامع مسجد سے متعلق ہیں۔ اور جن کی آمدنی چھتیس ہزار روپیہ سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ یہ موقوفہ جائداد شمس العلماء مولوی سید احمد مرحوم امام جامع مسجد کی سعی اور ۱۹۲۳ء سے قبل کی جامع مسجد کمیٹی کے ارکان کی توجہ و تائید سے حاصل ہوئی تھی۔

امام صاحب کا خیال تھا کہ مسجد کی اتنی آمدنی کر لی جائے کہ آئندہ مسجد میں اذان و نماز قائم رکھنے اور مسجد کی صفائی ستھرائی، اور روشنی کے لئے کسی کا دستِ نگر نہ ہونا پڑے۔ لیکن یہ آمدنی اتنی کبھی نہیں ہو سکی کہ عام اخراجات کے بعد مسجد کی کوئی باضابطہ اور معقول مرمت کی جاسکتی۔

امتدادِ زمانہ اور بعض دیگر اسباب کے باعث مسجد کو مرمت کی اب اشد ضرورت تھی۔ مولوی سید حمید صاحب، موجودہ امام (خلف اکبر امام صاحب مرحوم) نے پنڈت جواہر لال نہرو اور حضرت مولینا ابوالکلام آزاد کو توجہ دلائی کہ ہندوستان کی بیش بہا تاریخی یادگار آپ کی مدد کی طلب گار رہے۔ چنانچہ محکمہ آثارِ قدیمہ کو حکم دیدیا گیا کہ اُس کے انجینئر مسجد کا معائنہ کریں اور رپورٹ دیں۔ اُن کی رپورٹ پر حکومت نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ فوری مرمت کے لئے منظور کیا اور مرمت دو سال سے

www.taemeernews.com

جاری ہے۔ بیچ کے گنبد کے گرد اور جگہ جگہ پاڑیں بندھی ہوئی ہیں۔ مرمت کی رفتار تیز نہیں ہے۔ جعفری صاحب سُنی مجلس اوقاف کے سکرٹری رہ چکے ہیں اور آج کل مجلس کے ممبر ہیں، اُنھوں نے بتایا کہ رفتار سُست یوں ہے کہ حکومت مسجد میں وہی پتھر لگانا چاہتی ہے جو تعمیر کے وقت لگے تھے، ہدایت ہے کہ جس کان اور پہاڑ سے شاہجہاں نے پتھر منگائے تھے، وہیں سے پتھر لائے جائیں قسم اور ذات اور پتھروں کی لمبان چوڑان میں فرق نہ ہونے پائے۔ نیز مرمت کرنے والے مرمت طلب حصے کو کھول کر دیکھتے ہیں کہ مسالہ کون سا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے کیمیاوی اجزا کیا تھے۔ غرض ان احتیاطوں کی وجہ سے دیر لگ رہی ہے۔ ایک پتھر مہینوں میں ملتا ہے۔

جہاں جہاں مرمت ہو چکی ہے، قابلِ اطمینان اور قابلِ تعریف ہے۔

پوری جامع مسجد پہاڑی کے اوپر بنائی گئی تھی۔ نیو میں کھودنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مرمت بالکل نیچے تک پہنچی تو پہاڑی سامنے آگئی۔ توڑ پھوڑ میں پہاڑی کے دو چار ٹکڑے جعفری صاحب نے اُٹھا لئے تھے۔ ایک ٹکڑا مجھے عنایت کیا ہے۔

کراچی میں میری میز پہ تین چیزوں کا اضافہ ہوگا۔ ایک اِس ٹکڑے کا جو جعفری صاحب نے دیا ہے، دوسری چیز جامع مسجد کی خاک ہے جو حکیم عبدالسلام صاحب زلی نے مہیا کی ہے۔ اور تیسری چیز حضرت سلطان المشائخؒ کے مزار کی خاک ہے جو خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے مہیا کی ہے۔

بعد نماز جمعہ حافظ محمد یوسف صاحب ایڈیٹر رسالہ شمع اور خواجہ انیس حسن صاحب ہمانی تشریف لائے۔

۲۵ اپریل ۱۹۵۹ء صبح قاری اخلاق حسین صاحب اور ماسٹر عبدالمجید صاحب

www.taemeernews.com

جنرل منیجر ہمدرد دواخانہ ملنے آئے تھے اور حکیم عبدالحمید صاحب، متولّی ہمدرد دواخانہ کی طرف سے شربت روح افزا کی تین بوتلیں لائے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ ہم ایسے وقت درگاہ حضرت سلطان المشائخ جانے والے ہیں تو اپنی موٹر ہمارے حوالے کر گئے۔

میں ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، اپریل یعنی ۱۷، ۱۸، ۱۹، شوال حضرت خواجہ حسن نظامی کی بنا کردہ واحدی منزل میں گزاروں گا۔ حضرت امیر خسرو کا عُرس ہے۔ حضرت امیر خسرو کا مزار حضرت سلطان المشائخ کے مزار کے پائین ہے۔

درگاہ حضرت سلطان المشائخ دِلّی (شاہ جہاں آباد) سے ساڑھے تین میل دور ہے اور نئی دلی میں ہے ــــــــ دِلّی میں مجھے خاص تعلّق جامع مسجد کے علاقے سے ہے اور نئی دِلّی میں اس درگاہ اور اس گھر سے۔ ویسے تو ؎

مجھ سے اِک اِک مقام نے پوچھا
عشق کی حد پہ آ کے کیا گزری؟

لیکن جامع مسجد کے علاقے اور اس درگاہ اور اس گھر کا مقابلہ کوئی مقام نہیں کر سکتا۔

حکیم عبدالسّلام صاحب زئی ساتھ آئے ہیں۔ خواجہ صاحب کے ہاں کی مجالسِ عرس کے انتظام میں یہ صاحبزادگان خواجہ صاحب کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

آج صاحبزادگان خواجہ صاحب اور صاحبزادگان کے پاس آنے والے میرے گرد جمع رہے۔ سب آنے والوں کے نام نوٹ نہیں ہو سکے۔ صرف حکیم کامل خاں صاحب اور منشی ذکی حسن صاحب یاد رہ گئے ہیں۔

کھانا تو دوپہر کا بھی نہیں کھایا تھا اور جب تک سلطان جی میں ہوں نہیں کھاؤں گا۔ لیکن آج شام کے کھانے میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے بہت سے حضرات کو بلایا تھا، جن میں سے حسب ذیل میرے قدیم کرم فرما ہیں:۔ ڈاکٹر

www.taemeernews.com

سید محمود صاحب (سابق وزیر) حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد) صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی صاحب (آستانہ) خواجہ محمد ہلال قطبی صاحب۔ مسٹر نورالدین صاحب (بیرسٹر) مسٹر سلطان یار خاں صاحب (ایڈووکیٹ)۔ حافظ محمد یوسف صاحب (شمع) حاجی محمد صالح صاحب۔ قاری اخلاق حسین صاحب۔ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب حکیم احمد جمیل قادری صاحب۔ ڈاکٹر داور صاحب۔ میاں سعید الاسلام صاحب (ابن میاں عبدالصمد صاحب) نواب عزیز الشفیع صاحب (مجسٹریٹ) مفتی شوکت فہمی صاحب (دین و دنیا) خواجہ انیس حسن بقائی صاحب۔ سہیل صاحب عظیم آبادی۔ مسٹر میر حسن صاحب۔ لالہ کرپا نرائن صاحب (جے۔ این بینگی) لالہ رادھے کا نرائن صاحب (جے۔ این۔ سنگھ) مسٹر محمد طارق صاحب (ممبر پارلیمنٹ) ڈاکٹر صدیقی صاحب (آر۔ کی ٹیبٹ)۔ شری دھن راج ملہوترہ صاحب (وکیل) بھائی محمد ادریس صاحب۔

۲۶ر اپریل ۱۹۵۹ء صبح میاں مقتدیٰ واحدی اور حکیم عبدالسلام زئی کے ہمراہ مقبرہ ہمایوں گیا۔ آٹھ بجے صاحبزادہ مستحسن فاروقی آئے۔ بھائی محمد ادریس اور نواب عزیز الشفیع بھی فاروقی صاحب کی کار میں تھے۔ ہم سب فاروقی صاحب کی مہربانی سے درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

جس اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوا کر زندہ نکالا اور حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی سے نکلوا کر مرنے نہیں دیا تھا، اُسی اللہ نے ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں دلّی کی اس سب سے بڑی درگاہ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچنے دیا اور پھر گاندھی جی اور نہرو جی سے مرمت کروائی۔

خواجہ محمد ہلال صاحب قطبی تنہا درگاہ کی خدمت اور نگرانی کر رہے ہیں،

www.taemeernews.com

باقی تمام صاحبزادگان یا دلّی میں ہیں یا ملیر (کراچی) میں قطب صاحب کی بستی مسلمانوں سے خالی ہے۔

درویش بادشاہ سلطان شمس الدین التمش کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھی۔ سات سو برس پہلے کے مٹھی بھر اور موجودہ زمانے کے کروڑوں مسلمانوں کا تصور کیا اور وہاں سے سیدھا مع یار دلّی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ آیا۔ خانقاہ سے مُراد وہ عمارت ہے جہاں حضرت زندگی میں رہتے تھے۔ اور درگاہ سے مراد وہ عمارت ہے جہاں حضرت مدفون ہیں۔ ایک مجلس خواجہ حسن ثانی نظامی خانقاہ میں بھی کرتے ہیں۔ خانقاہ کھنڈر ہو چکی ہے لیکن جیسی ۱۹۰۳ء میں تھی ویسی آج ہے، اور زیادہ کھنڈر نہیں ہوئی۔ میں نے اسے پہلی دفعہ ۱۹۰۳ء میں دیکھا تھا۔ صرف حضرت کے کتب خانے کا کمرہ ایسا ہے کہ اُس میں بیٹھا جا سکتا ہے۔ اُس کے آگے کا برآمدہ بھی صحیح سالم ہے۔ نیز وہ چھت شکستہ دیواروں کے سہارے سے موجود ہے جس پر تاریخی ہشت پہل چبوترہ ہے۔ اس چبوترے پر حضرت گرمی کے موسم میں آرام فرمایا کرتے تھے اور آرام فرمانے سے قبل حضرت امیر خسرو۔ حضرت امیر حسن علاء سجزی۔ حضرت مولانا سید محمد امام اور دوسرے مخصوص مقربین سے باتیں کیا کرتے تھے اور اسی چبوترے کی بابت حضرت امیر خسرو نے کہا تھا ؎

نہ خفت خسرو مسکیں ازیں ہوس شبہا
کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود

خانقاہ کی مجلس دس ساڑھے گیارہ بجے تک رہتی ہے۔ یہاں آنے کی خاطر میں نے درگاہ حضرت روشن چراغ دہلی اور مقبرہ صفدر جنگ جانا چھوڑا۔ ورنہ دس بجے یہاں نہ پہنچ سکتا تھا۔ مقبرہ صفدر جنگ کی جھلک دُور سے دیکھ لی۔ درگاہ حضرت روشن چراغ دہلی کے لئے راستہ کاٹ کر چار میل کا مزید سفر کرنا پڑتا۔

www.taemeernews.com

درگاہ چراغ دہلی حاضر نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اور مقبرہ صفدر جنگ کے اندر نہ جا سکنے کا بھی۔ دلّی میں مجھے موٹر کی لاہور جیسی آسانی نہیں رہی۔ حد یہ ہے کہ لال قلعہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

خیر خانقاہ سے درگاہ آیا اور قیام گاہ میں شام تک بیٹھا رہا۔ پرانے ملنے والوں میں مستری محمد اسمٰعیل عشقی (حضرت خواجہ حسن نظامی کے مشہور خدمتگزار مرید) آئے اور نئے ملنے والوں میں صوفی ولایت خاں نے کرم فرمایا۔ صوفی ولایت خاں اُن صوفی عنایت خاں کے فرزند ہیں جنھوں نے یورپ میں اسلام و تصوّف کی اشاعت کی تھی۔ یورپ میں صوفی صاحب کے بے شمار معتقد اور مرید ہیں۔ پیرس اُن کا مرکز تھا۔ پیرس ہی کی ایک خاتون کے بطن سے صوفی ولایت خاں پیدا ہوئے۔ صوفی ولایت خاں تکمیلِ تصوّف کو خیال لے کر ہندوستان کی درگاہوں میں پھر رہے ہیں۔ کمبل کا کرتا پہنتے ہیں۔ لنگر کا کھانا کھاتے ہیں۔ چہرے پر نور ہے۔ فرانسیسی مادری زبان ہے۔ انگریزی خوب بولتے ہیں۔ اُردو اتنی جانتے ہیں جتنی چار مہینے میں جاننی چاہیے۔ چار مہینے سے ہندوستان میں ہیں۔

صوفی ولایت خاں کے علاوہ متعدد حضرات نے شرفِ ملاقات بخشا۔ قبل عشا میاں ضیاء الدین عرف حاجی میاں صاحب سجادہ نشین حضرت میاں عبدالصمد صاحب تشریف لائے۔

۲۷ اپریل ۱۹۵۹ء واکنگ اور ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ علامہ انور صابری نے مسافر نوازی فرمائی اور جتنی دیر بیٹھے رہے میرے متعلق رباعیاں کہتے رہے۔ بحرِ فکر میں غوطہ لگاتے تھے اور چار لڑیوں کی مالا پہنا دیتے تھے۔ ایک مالا آپ کی نذر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نگاہِ محبوبؐ نے عطا کی، جسے گرامی مقامِ عظمت

www.taemeernews.com

جہانِ عرفان و آگہی کے اسمِ گرامی کی یاد آئی

زیارتِ واحدی سے انور ہوئیں جو فیض آشنا نگاہیں

نجانے کیوں میری زندگی کو حسن نظامیؒ کی یاد آئی

خانقاہ والی مجلس کے بعد خواجہ حسن ثانی نظامی رات کی مجلس بھی حسبِ سابق کرتے ہیں۔ مگر میں رات کو جاگ نہیں سکتا۔ رات کی مجلس سے محروم رہا۔ آج دس بجے تیسری مجلس ہوئی۔ اس میں شرکت کی۔ رات مجلس یادگار میدانِ عرفات میں منعقد کی گئی تھی۔ یہ تیسری مجلس خواجہ صاحب کے زمانے سے حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے سامنے والے ہال میں ہوتی ہے۔ یہ مجلس میرے سفر کا حاصل تھی۔ علاّمہ انور صابری کی ایک رباعی ہے ؎

آئینہ انوارِ ازل دیکھ رہا ہوں   سرمایۂ تزئینِ عمل دیکھ رہا ہوں
خسروؒ کی یہ تصویر ہے یا دیدۂ دل ہے   محبوبِ الٰہیؒ کی غزل دیکھ رہا ہوں

میرے دائیں جانب حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کی ایک غزل ہے اور بائیں جانب دوسری غزل۔ میرا تصور مجھے کبھی خسروؒ کے قدموں میں پہنچا دیتا ہے اور کبھی حسن نظامی کے قدموں میں۔

تیسرے پہر حکیم کامل خاں اور منشی عبدالقدیر تشریف لائے نیز نوشابہ یعنی والدہ سکندر بخت آئیں۔ نوشابہ کے خاندان کو خواجہ صاحب سے اور خواجہ صاحب کے متعلقین سے دلی تعلق رہا ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کے ہاں کی چوتھی مجلس شروع ہونے کو تھی کہ میں دلی لوٹ آیا۔ شام کا کھانا۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی، سجادہ نشین حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی و ایڈیٹر "آستانہ" و "پیامِ مشرق" کے ہاں کھانا ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے خواجہ حسن ثانی نظامی بھی مجلس سماع ختم کر کے آ گئے۔ وہ اور بھائی محمد ادریس صاحب

www.taemeernews.com

مفتی عتیق الرحمن صاحب۔ مفتی شوکت فہمی صاحب۔ حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد) نواب عزیز الشفیع صاحب۔ خواجہ ہلال قطبی صاحب۔ صدیق صاحب (آرکی ٹیکٹ) روش صدیقی صاحب۔ خواجہ انیس حسن بقائی صاحب۔ پوری صاحب (مالک لیٹ پنجاب پریس) شہریار پروانہ صاحب سب ایڈیٹر آواز) حاجی محمد صالح صاحب انصار ہروانی صاحب (ممبر پارلیمنٹ) علی محمد طارق صاحب (ممبر پارلیمنٹ) حکیم جمیل قادری صاحب۔ ساغر نظامی صاحب۔ راد ھیکا نرائن صاحب اور کرپا نارائن صاحب شریکِ طعام تھے۔

۲۸ / اپریل ۱۹۵۹ء صبح گھری پر نماز پڑھ لی۔ ہوا خوری کرنے بھی نہیں گیا۔ جلدی جلدی تین روزکار و زنامچہ گھسیٹا۔ ساڑھے آٹھ اور نو کے درمیان لالہ داتا رام۔ اسرار حسن خاں اور محمد عوض آ گئے۔ ٹھیک نو بجے مولانا بقا اللہ پانی پتی تشریف لائے اور ساڑھے دس بجے تک میرے پاس رہے۔ پھر بھائی محمد اسحٰق آئے۔ بارہ بجے پنڈت تیلو رام کے ہاں کھانا کھایا۔

آج میاں علی مقتدیٰ واحدی اور بھائی محمد اسحٰق کے لڑکے میاں رئیس احمد اور ایک اور عزیز میاں معراج الحق ۵ مئی کے لئے سیٹیں ریزرو کرانے گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ۵ مئی کو واپسی کا ارادہ ہے۔ عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ منشی عمو جان صاحب کے فرزند ملنے آ گئے۔ منشی صاحب میرے رفیق قدیم ہیں۔ مدتوں میرے رسالوں اور اخباروں کی کتابت کی ہے۔ آج کل فرخ آباد گئے ہوئے ہیں۔

قبل مغرب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی اور مولانا سمیع اللہ صاحب اور بعد مغرب گلزار صاحب تشریف لائے۔

آٹھ بجے بھائی محمد ادریس صاحب۔ اُن کے لڑکے مطیع احمد اور اپنے لڑکے علی مقتدیٰ واحدی اور حکیم عبدالسّلام صاحب زبی کے ساتھ حکیم عبدالحمید صاحب

www.taemeernews.com

متولّی ہمدرد دواخانہ کے ہاں گیا۔ انھوں نے آج دعوت کی ہے۔ خواجہ زید پاشا نظامی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا حفظ الرحمٰن۔ مفتی عتیق الرحمٰن۔ مفتی شوکت فہمی۔ سید محمد جعفری۔ خواجہ ہلال قطبی۔ خواجہ مہدی نظامی۔ ڈاکٹر سید محمود۔ مسٹر نورالدین۔ لالہ شمبھوناتھ۔ لالہ شام ناتھ۔ صاحبزادہ مستحسن فاروقی۔ مولانا محمد میاں۔ نواب عزیز الشفیع۔ سید اشفاق حسین (ناظر سنّی مجلس اوقاف)۔ حاجی محمد صالح۔ مرزا محمود بیگ (پرنسپل دہلی کالج) دیوان آنند کمار (وائس چانسلر ایسٹ پنجاب یونیورسٹی) مولانا سجاد حسین۔ حکیم محمد اقبال۔ ڈاکٹر عبدالعزیز۔ قاری اخلاق حسین۔ سید عظمت علی۔ منشی صغیر احمد۔ حکیم احمد جمیل۔ وحید الدین قریشی۔ محمود عثمانی اور ڈاکٹر صدیقی شریکِ طعام تھے۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے لالہ شمبھوناتھ صاحب کو الگ لے جاکر کہا، کراچی سے آپ کو متعدد بار لکھا گیا کہ میرے پاس تو حساب کتاب رہا نہیں ہے، آپ اپنے ہاں دیکھ کر مطلع کیجیے کہ مجھے آپ کا کیا دینا ہے۔ آپ نے خطوط کے جواب دیے مگر اِس بات کا جواب کبھی نہ دیا۔

لالہ شمبھوناتھ صاحب دِلّی کے سب سے پہلے برقی پریس، دِلّی پرنٹنگ ورکس کے مالک ہیں۔ میرا کام کئی پریسوں میں چھپا کرتا تھا، اُن کے ہاں بھی چھپتا تھا۔

میں ویسے الحمدللہ کسی کا مقروض نہیں ہوں لیکن چھاپہ خانوں کے بل اور رسالے کے چندے مرتے دم تک باقی رہیں گے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا علاج کروں۔ خیر دِلّی جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ۱۹۴۷ء کی بھگدڑ کے وقت چھاپہ خانوں کی جو رقمیں میرے ذمّے تھیں انھیں چکا دوں۔ ادا کرکے یا معاف کرا کے۔ چنانچہ لالہ شمبھوناتھ صاحب آج تکلّف کرنے لگے تو اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ روپے لینے نہیں چاہتے تو معاف کر دیجیے، اور زبان سے فرمائیے کہ معاف کیا۔

www.taemeernews.com

میں مُصر تھا کہ لالہ شمبھو ناتھ صاحب اِن الفاظ کو دوہرائیں اور لالہ شمبھو ناتھ صاحب "معاف کیا" کہنا شاید گستاخی سمجھ رہے تھے۔ آخر اُنھوں نے "معاف کیا" کا بدل سوچا اور فرمایا "میرا کچھ مطالبہ نہیں ہے۔"

لالہ شمبھو ناتھ صاحب میرے ہم عمر ہیں اور ہم دونوں لڑکپن سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ لالہ شمبھو ناتھ صاحب گوشت نہیں کھاتے اور گوشت کھانیوالوں سے دُور اُن کا تھال رکھا گیا تھا۔ مگر دیکھیے گوشت نہ کھانے والے، قدیم طرز کے ہندو اِس طبیعت کے ہوتے ہیں۔

۲۹ر اپریل ۱۹۵۹ء صبح ٹہلنے چونکہ اکیلا جاتا ہوں۔ دیوانوں کی طرح گلی گلی دِلّی کو ڈھونڈتا ہوں۔ آج راج گھاٹ کا قصد کیا۔

جامع مسجد سے لال قلعہ کے دروازے تک سڑک قدیم ہے اور ایڈورڈ پارک بھی قدیم ہے لیکن دائیں جانب اُردو پارک دوسرا ایڈورڈ پارک بن گیا ہے اور بائیں جانب مقبرہ مولانا ابو الکلام کی وجہ سے پریڈ کے میدان کا ایک ٹکڑا سرسبز ہو گیا ہے۔ جامع مسجد سے چاندنی چوک کے نکڑ تک دُکانیں ہی دُکانیں ہیں۔ پریڈ کے میدان میں جینیوں کے مندر کے نزدیک بہت لمبی چوڑی مارکٹ تعمیر ہوگئی ہے۔ پریڈ کا میدان چھوٹا رہ گیا ہے اور دُکانوں اور مارکٹ کی وجہ سے میدان کی ہوا جامع مسجد کے رُخ نہیں آتی۔ اِدھر سموسے کے سامنے اور اُردو بازار کے سامنے ایڈورڈ پارک تک دُکانوں کا طویل سلسلہ ہے اور اِس قدر گھچ پچ ہے کہ خدا کی پناہ!

ٹھنڈی سڑک کراس ([illegible]) کرکے قلعہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ بائیں جانب کا میدان نہیں بدلا۔ مگر دائیں جانب کے میدان میں دُکانیں اور گودام تعمیر کرا دیئے گئے ہیں۔ قلعہ کے دروازے سے سُنہری مسجد کا

www.taemeernews.com

رُخ کیا تو عالم ہی اور پایا۔ نہ وہ دَریں اور نہ دروں کے اوپر کی نالی جس پر میں بچپن میں دوڑا کرتا تھا اور نہ وہ املی کا درخت ہے جس کے کٹارے دوڑنے کے زمانے میں کھایا کرتا تھا اور جسے ۱۹۴۷ء میں کھڑا چھوڑ گیا تھا۔ شہری مسجد سے راج گھاٹ تک کا میدان عمارتوں سے بھر گیا ہے اور زنانہ پردہ باغ کی چار دیواری کے ارد گرد اتنی دکانیں ہیں کہ پردہ باغ نظر نہیں آتا۔ راج گھاٹ اٹکل سے پہنچ سکا۔

شہر کے باہر جو عمارتیں تیار ہوئی ہیں، وہ دیکھنے دکھانے کے لائق ہیں لیکن شہر کے اندر کی تعمیرات نے سانس لینا مشکل کر دیا ہے۔

راج گھاٹ سے کوچہ چیلان پہنچا تاکہ اپنا محلّہ اور اپنا گھر ایک بار اور دیکھ لوں۔ آج پتہ چلا کہ دریا گنج سے ڈپٹی فداء اللہ صاحب کی حویلی کے موڑ تک کسی قدر تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ اندھیرا محض مرمّت اور سفیدی کے فقدان کی وجہ سے نہیں ہے۔ اندھیرے کی اور وجوہ بھی ہیں۔ میری دِلّی مجھے کہیں نہیں مِل رہی۔ دِلّی کی برادریوں کی دِلّی کراچی میں موجود ہے لیکن نواب فخر مرزا۔ اجمل خاں اور فیض احمد خاں کی دِلّی۔ خان بہادر ناصر علی اور حکیم ناصر نذیر فراقؔ کی دِلّی۔ راشد الخیری اور حسن نظامی کی دِلّی۔ ادیبوں کی۔ سائلؔ اور آغا شاعر کی دِلّی۔ اب کہیں نہیں ہے ؎

دل کی تسکین بہ نامِ غم نہ ہوئی
زندگی شاد کامِ غم نہ ہوئی

میرے مکان کے مقابل کالے خاں کی مسجد ہے۔ دروازہ کھُلا پایا تو اندر گھُس گیا۔ صحن پر نگاہ تھی اور جوتے اُتار کر صحن میں قدم رکھنا چاہتا تھا کہ موذّن حجرے میں سے نکلا اور ریڈ کالی لہجے میں پوچھنے لگا۔ کیا ہے۔ میں نے کہا کچھ نہیں، اور باہر چلا آیا۔

www.taemeernews.com

حکیم عبدالسّلام زئی۔ بختیار رفیع الدین صاحب۔ محمد خاں صاحب (نگینہ ساز) جعفری صاحب۔ اسرار حسن خاں صاحب۔ قاضی معز الدین احمد صاحب تشریف لائے۔

یہ نام بار بار اس لئے لکھتا ہوں کہ آپ انھیں بار بار پڑھ کر جان لیں کہ دلّی میں واحدی کے جاننے والے کتنے رہ گئے ہیں۔ بڑی بڑی دعوتوں میں بھی ہر پھر کر ایک ہی فہرست ملے گی۔ جامع مسجد سے ترا با بیرم خاں تک مسلمانوں کی آبادی ہے لیکن میں اُدھر سے گزرتا ہوں تو آشنا صورت نہیں دکھائی دیتی۔ دلّی کے دوسرے محلّوں کا کیا حال ہوگا۔ دوسرے محلوں میں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دلّی سے مراد اگر دلّی کے آدمی ہیں تو وہ تتر بتر ہو گئے۔ یا قبرستان چلے گئے۔ دلّی کی تہذیب اور دلّی کے تمدّن کو چند گنے چنے حضرات نے سنبھال رکھا ہے ؎

تم ہو اب اور مدارات سے بیگانوں کی
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی

دوپہر کا کھانا منشی عبدالعزیز صاحب کے ہاں رشید خاں صاحب صدر کانگریس کمیٹی وارڈ نمبر ۹ اور حکیم عبدالسّلام صاحب زئی وغیرہ کے ساتھ کھایا۔

تیسرے پہر، پانچ بجے کا وقت مسز آصف علی نے چاء نوشی اور افسرانِ میونسپل کارپوریشن سے ملانے کے واسطے مقرر کیا تھا۔ میرے زمانے کے افسر ایک ایک کر کے مسز آصف علی کے کمرے میں آتے رہے اور ملتے رہے۔ نئے افسروں سے مسٹر ایشور دیال، ڈپٹی کمشنر کارپوریشن نے لان میں لے جا کر ملوایا۔ لان میں تمام افسرانِ کار روز اس وقت جمع ہوتے ہیں۔

... کارپوریشن آنے سے پہلے بختیار رفیع الدین صاحب کے ہاں بھی گیا تھا۔ ریلیجیس ٹالرنس کمیٹی (Religious Tolerence Committee)

www.taemeernews.com

جو بھیّا رفیع الدین صاحب کی زیرِ صدارت کام کر رہی ہے اُس کا آج جلسہ تھا۔ مگر میں جلسہ کے انعقاد تک ٹھیر نہیں سکا۔

عصر کی نماز مسجد فتحپوری اور مغرب کی نماز جامع مسجد میں پڑھی۔ کل میاں مقتدیٰ واحدی فقط جواب لائے تھے کہ ریل کی سیٹوں کا ریزر ویشن (Reservation) نئی دلّی ریلوے اسٹیشن پر ہوگا۔ آج وہ ۶ مئی کے لئے سیٹیں ریزرو (Reserve) کرا آئے ہے۔

کوئی دم میں روانہ ہیں ہم لوگ

۳۰ راپریل ۱۹۵۹ء بھائی محمد ادریس صاحب کی حویلی دِلدار منزل عالی شان حویلی ہے۔ اس کا ایک بالائی حصّہ مجھے الگ مل گیا ہے جو اپنی جگہ مکمل مکان ہے۔ تین کمرے، کمروں کے مطابق صحن، غسل خانہ۔ پاخانہ۔ اس کے علاوہ حویلی کے طویل وعریض ڈرائنگ روم پر میرا قبضہ ہے۔ بھائی صاحب کا برتاؤ یہ ہے کہ ایک دن میں کسی سے کہہ رہا تھا کہ وطن میں مہمان ہوں۔ اُنھوں نے سُن لیا۔ بگڑ کر بولے اِس گھر کو آپ اپنا گھر نہیں تسلیم کرتے۔ میں نے عرض کیا۔ اچھا صاحب! میں مہمان نہیں ہوں، لیکن اتنا کہنے کی تو اجازت ہے کہ۔

نماز قصر پڑھتا ہوں وطن میں

خیر بھائی صاحب اور بھابی صاحبہ اور بھتیجے بھتیجیوں نے آرام و آسائش کا انتہائی بندوبست کر رکھا ہے۔ لیکن ایک تکلیف ہے۔ اُن کی حلال خوری، حرام خور ہے۔ جب چاہتی ہے آتی ہے اور جب چاہتی ہے نہیں آتی۔ میں اِس معاملہ میں فطرتاً نازک مزاج ہوں اور کراچی کے فلش سسٹم نے مزاج اور نازک کر دیا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے ہاں بھی ایک کمرہ۔ ایک ہال اور وسیع صحن میرے پاس تھا اور حسن ثانی عرس کی مصروفیت کے باوجود بہ تن متوجہ تھے۔

www.taemeernews.com

عرس کی مصروفیتیں ایک پٹارے میں تھیں اور میرا خیال ایک پلڑے میں۔ میرا خیال والا پلڑا بھکا جاتا تھا۔ لیکن پلنے کی تکلیف اُن کے ہاں بھی رہی۔ سُنا ہے کہ یہاں حلال خوریوں کا اب عام طور پر یہی رنگ ہے۔ آج حکیم عبدالسّلام صاحب زئیؔ نے مرد حلال خور بھیجا کردیا ہے۔ اُمید ہے۔ پانچ، چھ دن خیریت سے گزر جائیں گے۔ حکیم عبدالسّلام صاحب نے میرے جتنے کام کئے ہیں میں اُن کا شکریہ نہیں ادا کرسکتا۔ اُنھیں دعائیں دیتا ہوں۔

دوپہر کا کھانا بہن نوشابہ کے ہاں کھایا۔

تیسرے پہر کارپوریشن پہنچا اور مسز آصف علی کے ساتھ اولڈ سکریٹریٹ (old Secretariate)۔ ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ چیرمین انڈسٹریل ایڈوائزری بورڈ کے دفتر گیا۔ ڈاکٹر صاحب میرے میونسپل کمیٹی کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے مجھ سے ملانے کے لئے کمیٹی کے مندرجہ ذیل ساتھیوں کو چاء پر جمع کیا تھا۔ لالہ شام ناتھ۔ لالہ دیس راج۔ چودھری امراؤ سنگھ۔ لالہ ہری چند۔ لالہ ست نرائن گڑ والے۔ حکیم خلیل الرحمٰن۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ جین۔ سید محمد جعفری۔ لالہ بھون چند جین۔ مسٹر جگل کشور کھنّہ اور لالہ اونکار ناتھ۔

لالہ اونکار ناتھ آج کل ممبر پارلیمنٹ ہیں۔

مسز آصف علی اور لالہ گوپی ناتھ امن نے بھی چاء نوشی میں شرکت کی۔ امن صاحب میونسپل کمیٹی کے ساتھی نہیں ہیں۔ ادبی ساتھی ہیں۔ آج کل چیرمین پبلک ریلیشنز کمیٹی ہیں۔

شام کا کھانا مفتی شوکت فہمی صاحب کے ہاں کھایا۔ مولانا احمد سعید صاحب۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ مولانا سجاد حسین صاحب۔ حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد)۔ حکیم عبدالحئی صاحب انصاری۔ علامہ انور صابری صاحب۔ ساغر نظامی صاحب۔ بھائی محمد ادریس صاحب۔ نواب عزیز الشفیع صاحب۔ حاجی محمد صالح صاحب۔ مسٹر نورالدین صاحب (بیرسٹر)۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی صاحب۔ قاری اخلاق حسین

www.taemeernews.com

صاحب۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب۔ خواجہ مہدی نظامی صاحب۔ حافظ محمد یوسف صاحب (تمیمی)۔ چودھری عبدالستار صاحب۔ خواجہ انیس حسن بقائی صاحب۔ سید محمد جعفری صاحب۔ قاضی اطہر ہاشمی صاحب۔ قاضی الیاس ہاشمی صاحب۔ مسٹر ایم بدلے۔ قاضی۔ مسٹر گوبندسرن (ایڈووکیٹ) مسٹر شام نرائن۔ مسٹر کرپا نرائن۔ مسٹر رادھیکا نرائن اور مسٹر صدیقی (انجنیر) شریک طعام تھے۔

کھانے کے بعد علامہ انور صابری صاحب اور ساغر نظامی صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ایک ایک غزل دونوں کی آپ بھی پڑھ لیجے، پوری پوری غزل نہیں، بعض بعض شعر:۔

علامہ انور صابری صاحب

لب پہ کانٹوں کے ہے فریاد و فغاں تیرے بعد　　کوئی آیا ہی نہیں آبلہ پا تیرے بعد
اب نہ وہ رنگِ جبیں ہے نہ بہارِ عارض　　لالہ رویوں کا عجب حال ہوا تیرے بعد
چند سوکھے ہوئے پتے ہیں چمن میں رقصاں　　ہائے بے گانگیٔ آب و ہوا تیرے بعد
منہ دُھلاتی نہیں غنچوں کا عروسِ شبنم　　گرد آلود ہے کلیوں کی قبا تیرے بعد
آدمیت شکنی بھی تو نہیں کم انور
ڈر ہے کچھ اور نہ ہو اس سے سوا تیرے بعد

ساغر نظامی صاحب

کیا سنائیں کہ ہم پہ کیا گزری　　عشق میں ہر قدم پہ کیا گزری
لو اسیرانِ دیر کیا جانیں　　طائرانِ حرم پہ کیا گزری
مرحبا ذوقِ آبلہ پائی　　راہ کے پیچ و خم پہ کیا گزری

www.taemeernews.com

اُن کو دیکھو کہ اُن پہ کیا بیتی یہ نہ پوچھو کہ ہم پہ کیا گزری
میرا دستِ طلب جھٹک تو دیا تیرے ظرفِ کرم پہ کیا گزری
ہے یہی راہِ عافیت ساغرؔ
ہم نہ سمجھیں کہ ہم پہ کیا گزری

آج مولوی عبدالحمید صاحب (ایڈیٹر مولوی) جعفری صاحب، مفتی ضیاء الحق صاحب، سید محمد فاروقی صاحب (ناظم یتیم خانہ مجلس اوقاف) بھائی محمد اسحٰق صاحب درگلزار صاحب ملنے تشریف لائے تھے۔

یکم مئی ۱۹۵۹ء آج کے لئے حکیم عبدالسلام صاحب نبّی سے طے ہوا تھا کہ صبح پانچ بجے جامع مسجد سے درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ جائیں گے۔ حضرتؒ کے علاوہ قاری سرفراز حسین صاحب اور حافظ عزیز حسن صاحب بقائی کی فاتحہ خوانی کرنی تھی لیکن حکیم صاحب کو دیر لگ گئی۔ میں جامع مسجد سے ہوا خوری کرنے چل دیا۔ واپس آ رہا تھا کہ حکیم صاحب ڈھونڈتے ہوئے ملے۔ لیکن جانے کا وقت نکل چکا تھا۔

کھانا دعوتوں میں بے حد احتیاط سے کھاتا ہوں۔ مگر دعوتوں کی وجہ سے جاگنا ضرور پڑتا ہے کل رات جب لیٹا ہوں تو سوا بارہ بج رہے تھے۔ سوا چار بجے اٹھ بیٹھا۔ ساڑھے تین یا پونے چار گھنٹے سونا قطعی ناکافی ہے۔ مجھے عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جانے کی عادت ہے۔ رات کو کبھی نہیں جاگتا اور دن میں کبھی نہیں سوتا۔ مگر آج سارا بدن دکھ رہا تھا۔ دوپہر تک پلنگ پر پڑا رہا۔ اتفاق سے نیند بھی آ گئی اور طبیعت ہلکی ہو گئی۔

شام کا کھانا حافظ محمد یوسف صاحب مالک رسالہ شمع کے ہاں تھا۔ وہ شہر سے چھ میل دور رہتے ہیں، اُن کی کار مجھے لے گئی اور پہنچا گئی۔

مغرب کی نماز کوٹھی کے پُرفضا لان میں مولانا احمد سعید صاحب کے پیچھے پڑھی۔

نماز پڑھتے ہی حافظ صاحب نے کھانا چنوا دیا۔ مولانا احمد سعید صاحب، بھائی محمد ادریس

www.taemeernews.com

صاحب۔ ساغر نظامی صاحب۔ علامہ انور صابری صاحب۔ لالہ کرپا نرائن صاحب۔ لالہ شلوم نرائن صاحب بیغی۔ شوکت فہمی صاحب۔ حاجی محمد صالح صاحب۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب۔ مسٹر نور الدین صاحب۔ صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی صاحب۔ محمد ادریس صاحب مدیر کھلونا۔ محمد یونس صاحب، مدیر شمع۔ انور دہلوی صاحب منیجر شمع بکڈپو۔ اور پیرزادہ عبدالحق فاروقی صاحب شریک طعام تھے۔

کھانے کے بعد علامہ انور صابری صاحب اور ساغر نظامی صاحب نے روحانی غذا بہم پہنچائی۔

ساڑھے دس بجے حافظ محمد یوسف صاحب کی کوٹھی سے رخصت ہوا۔ اور اردو بازار میں مولوی سمیع اللہ صاحب کی دکان پر اترا۔ مولوی سمیع اللہ صاحب کی دکان شاعروں، ادیبوں اور سیاست دانوں کی نشست گاہ ہے۔ روزانہ بعد مغرب لوگ آجاتے ہیں۔ ساڑھے دس بجے بھی گلزار صاحب اور میر مشتاق احمد صاحب تشریف فرما تھے میرے پیچھے پیچھے علامہ انور صابری صاحب بھی آگئے۔ گلزار صاحب اور صابری صاحب اور ایک نابینا شاعر نے جن کا نام یاد نہیں رہا، مشاعرہ قایم کر دیا۔ کل کی طرح آج بھی ٹھیک سوا بارہ بجے سونا ملا۔ یہ صحبتیں اس قدر دل کش ہیں کہ "نے تاب وصل دارم نے طاقتِ جدائی" کل سے جلد سونے کی کوشش کروں گا۔

آج دن میں مولانا لقاء اللہ صاحب ملنے آئے تھے۔

۲ مئی ۱۹۵۹ء گرمی بڑھنی شروع ہو گئی ہے۔ مئی، جون، جولائی، یہی گرمی کے مہینے ہیں۔ دن بھر گھر میں لیٹا رہا اور آنے والوں سے باتیں کرتا رہا۔ مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کے فرزند و جانشین مولانا محمد یوسف صاحب کی تبلیغی جماعت کے کئی حضرات تشریف لائے۔ مجھے سب جماعتوں سے زیادہ یہ جماعت پسند ہے۔ اس جماعت نے خدمت کا ایک طریقہ اختیار کر لیا ہے اور اس طریقے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔

تیسرے پہر ٹھیک ساڑھے تین بجے انجمن تعمیر اردو کے دفتر پہنچا۔ دفتر اردو بازار

اردو کا اہم واقعہ ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اِس انجمن کی بنا ڈالی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب اور پنڈت زار صاحب زتشی کی سرپرستی میں کیفی صاحب کے انتقال کے بعد بھی انجمن چل رہی ہے۔ میر مشتاق احمد صاحب اس کے صدر ہیں اور پنڈت آنند موہن زتشی المعروف بہ گلزار صاحب جنرل سکرٹری۔

آج انجمن نے جوش صاحب ملیح آبادی اور خاکسار واحدی سے ملانے کے لئے دِلّی کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو جمع کیا ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ پنڈت تلوک چند صاحب محروم، پنڈت زار صاحب اور منوّر صاحب لکھنوی نے چار چار پانچ پانچ شعر پڑھے۔ پھر جوش صاحب نے ایک نظم سُنائی۔ میں نے بھی دِلّی کے ایک تاریخی مکان کا حال بیان کیا جو میری کتاب میرے زمانے کی دِلّی میں درج ہے۔

بعد مغرب پنڈت تیلو رام جی آئے۔ اُن سے باتیں کرکے میں قاری اخلاق حسین صاحب کے ہاں رات کا کھانا کھانے گیا۔ قاری صاحب نے بھائی محمد ادریس صاحب اور اُن کے بیوی بچّوں کو بھی مدعو کیا ہے۔ بھائی فضل احمد صاحب کے نواسے میاں تنویر حسین نے بھی ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔

۳ مئی سنہ ۵۹ء علی الصبح میری خالہ زاد بہن عزیز بیگم ملنے آئیں۔ اپنی جانثار بیٹی نصیر بانو سبزواری کا ذکر کرتی رہیں۔ نصیر بانو حج کرنے گئی تھیں۔ حج سے فارغ ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں پیغامِ اجل بھیج دیا۔

عزیز بیگم کے جاتے ہی حکیم عبدالسلام صاحب زئی اور قاضی محمد اکرام صاحب آ گئے۔ پھر جعفری صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے ہمراہ چودھری امراؤ سنگھ صاحب کے ہاں گیا۔ اُنھوں نے ناشتے کی دعوت کی تھی۔ ناشتہ کیا تھا کھانا تھا۔ مسز آصف علی۔ لالہ گوپی ناتھ امن۔ لالہ دیس راج۔ لالہ رچپال سنگھ رہبر اور حکیم خلیل الرحمٰن بھی شریکِ ناشتہ تھے۔

گھر واپس پہنچا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، صاحبزادہ محمد حسن فاروقی صاحب اور خواجہ انیس حسن لقانی صاحب منتظر تھے۔ مفتی صاحب نے ترجمان السنۃ کے

www.taemeernews.com

تینوں حصّے عطا فرمائے۔ اور فاروقی صاحب نے اپنا شائع کردہ قرآن مجید اور تجرید بخاری شریف (اُردو)

ترجمان السّنہ ضخیم کتاب ہے۔ اُستاذالحدیث مولانا محمد بدر عالم صاحب نے اُردو زبان میں ارشاداتِ نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ مع تشریح و مباحث جمع کر دیا ہے۔ ندوۃ المصنّفین دہلی، جس کے مفتی صاحب کرتا دھرتا ہیں بڑی معیاری کتابیں پیش کر رہا ہے۔

فاروقی صاحب کا شائع کردہ قرآن مجید بلاکوں کے ذریعہ چھپا ہے۔ تجرید بخاری کی بھی مجھے ضرورت تھی، انشاءاللہ اِن تمام عطیات سے میں فائدہ اُٹھاؤں گا۔

دوپہر کو نواب سیّد عزیز الشفیع صاحب تشریف لائے۔

دوپہر کا کھانا لالہ داتا رام کے ہاں کھایا۔ وہاں مسز آصف علی سے پھر ملاقات ہوئی حضرت مولانا احمد سعید۔ مولانا محمد سعید، لالہ دارو غہ مل۔ لالہ کشمیری لال سہگل۔ خواجہ حسن ثانی نظامی۔ سیّد مطیع احمد حکیم عبدالسّلام زئی۔ لالہ ہیرا لال۔ مسٹر محمد عارف اسلم۔ اور مسٹر رشید خاں شریکِ طعام تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی اور حکیم عبدالسّلام زئی مجھے گھر پہنچانے آئے اور دیر تک میرے پاس رہے۔

رات کا کھانا مسٹر معراج الحق کے ہاں کھایا۔ معراج الحق میرے عزیز ہیں اور مقتدیٰ واحدی کے گہرے دوست۔ ہائی کمشنر پاکستان کے دفتر سے اُن کا تعلق ہے۔ دفتر کے سپرنٹنڈنٹ فاروقی صاحب بھی شریکِ طعام تھے۔

معراج صاحب نے قاری اخلاق حسین صاحب کی طرح بھائی محمد ادریس صاحب کے بیوی بچّوں کو بُلایا تھا۔ اُن کے علاوہ بھائی محمد اسحٰق صاحب کی اہلیہ اور میر مرتضیٰ علی مرحوم کی اہلیہ بھی آئی تھیں۔ مطیع احمد اور رئیس احمد، غرض دِلّی میں جتنے ننھیالی عزیز ہیں قریباً سب تھے۔

www.taemeernews.com

مسٹر معراج ڈیفنس کالونی کے ایک خوشنما بنگلے میں رہتے ہیں ۔ ڈیفنس کالونی جامع مسجد سے کافی فاصلے پر ہے ۔ کار ہمیں لے گئی اور پہنچا گئی ۔

۴ رمئی ۱۹۵۹ء آج صبح ساڑھے پانچ بجے قاری اخلاق حسین صاحب نے ہمدرد دواخانہ کی کار بھیج دی تھی ۔ اس میں حکیم عبدالسلام صاحب، سید محمد جعفری صاحب، میاں مطیع احمد اور میاں مقتدیٰ واحدی کے ساتھ درگاہ حضرت سلطان المشائخ حاضر ہوا ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے مزار پر فاتحہ پڑھی ۔ میں سجدہ تعظیمی کا قائل نہیں ہوں لیکن جناب ساغر نظامی کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آگیا ۔

کاش سجدے میں دم نکل جائے ۔ پھر ترا آستاں ملے نہ ملے

خواجہ صاحب کے بعد حضرت امیر خسرو اور حضرت سلطان المشائخ کے مزارات پر مقررہ ترتیب کے مطابق فاتحہ خوانی کی ۔ پھر خواجہ حسن ثانی نظامی کے ساتھ ناشتہ کیا اور انھیں کار میں ساتھ بٹھایا اور اوکھلا پہنچا ۔ وہ پیڑ دیکھا جس کے نیچے مولانا راشدالخیری، مولانا عارف ہسوی اور خواجہ فضل احمد شیدا کے سلسلہ اتوار کے اتوار جا کر بیٹھا کرتے تھے ۔ میں نے مولانا راشدالخیری کی شام زندگی جب شائع کی ہے تو اس کا جشن یہیں منایا گیا تھا ۔ اوکھلے سے جامعہ نگر آیا اور حافظ فیاض احمد صاحب پانی پتی سے ملا ۔ حافظ صاحب عربک ہائی اسکول میں میرے ہم جماعت رہ چکے ہیں ۔ دمے نے نڈھال کر رکھا تھا ۔ لیکن مجھے دیکھ کر زندگی ابھر آئی ۔

گھر لوٹا تو لالہ ست نرائن صاحب گروالے گھنٹہ بھر سے منتظر تھے ۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ اور بیٹھے ۔ ان کا خاندان میرے لڑکپن تک دلی کے دولت مندترین خاندانوں میں تھا اور اس خاندان کی اتنی عزت تھی کہ ست نرائن جی کے والد چار گھوڑوں کی بگی (رتھ گاڑی) میں نکلا کرتے تھے ۔ اور کسی کو چوگاڑی میں نکلنے کی اجازت نہیں تھی ۔

دوپہر کا کھانا بھائی محمد اسحٰق صاحب کے ہاں کوچہ چیلان میں کھایا ۔ کہنے

www.taemeernews.com

کی طرف سے یہ تیسری دعوت تھی۔ کینے کے عورت امرد جمع تھے۔

بھائی محمد اسحٰق صاحب کے ہاں سے دفتر شمع گیا۔ حافظ محمد یوسف صاحب مالک شمع شام کو الہ آباد جانے والے ہیں۔ اُن کی واپسی سے پہلے یعنی پرسوں میں دلّی سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اس لئے رخصتی ملاقات کرنی تھی۔

شام کا کھانا اسرار حسن خاں صاحب کے ہاں کھایا۔ اسرار حسن خاں صاحب میاں مقتدیٰ واحدی کے اُستاد ہیں۔ علی مقتدیٰ واحدی اور اُن کے بڑے بھائی احمد مجتبیٰ واحدی کو کئی سال مسلسل پڑھایا تھا اور ایک دم پانچویں میں داخل کرا دیا تھا۔ میرے بچے اُنھیں چچا میاں کہتے ہیں۔ بھائی محمد ادریس صاحب وغیرہ کئی صاحبان شریک طعام تھے۔

۵ مئی ۱۹۵۹ء صبح کا ناشتہ انور صاحب، مینیجر شمع بک ڈپو کے ہاں کیا۔ خواجہ انیس حسن صاحب بقائی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب۔ مولانا محمد سعید صاحب۔ اسرار حسن خاں صاحب۔ پیرزادہ عبداللہ فاروقی صاحب۔ پیرزادہ عبدالحق فاروقی صاحب۔ توفیق قادری صاحب۔ لالہ کدار ناتھ صاحب۔ نجم صدیقی صاحب (ایڈیٹر جہالستان) شریک ناشتہ تھے۔

روپ نرائن صاحب، سکرٹری پرجا سوشلسٹ پارٹی صوبہ دہلی انور صاحب کے ہاں مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میں تھوڑی دیر اُن کے مکان میں جا کر بیٹھا۔ یہ خالص ہندوؤں کا محلّہ ہے مسلمان صرف انور صاحب ہیں لیکن انور صاحب سے ہندوؤں کے اچھے تعلقات ہیں۔

دوپہر تک خواجہ حسن ثانی نظامی میرے پاس رہے۔ دوپہر کا کھانا مولانا احمد سعید صاحب کے ہاں تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب۔ جعفری صاحب۔ لالہ شام ناتھ صاحب۔ مفتی شوکت فہمی صاحب، صاحبزادہ محمد محسن فاروقی صاحب۔ بھائی محمد ادریس صاحب اور حکیم عبدالسلام صاحب شریکِ طعام تھے۔ کھڑے کھڑے

www.taemeernews.com

مرزا سلیمان جاہ کی پوتی تیمور جہاں بیگم صاحبہ سے ملا۔ وہ مولانا احمد سعید صاحب کی پڑوسن ہیں۔ کئی روز سے مجھے بلا رہی تھیں۔

شام کو میونسپل کارپوریشن گیا۔ جعفری صاحب ساتھ تھے۔ میونسپل کارپوریشن میں آج مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ریسپشن بھی دیا گیا تھا۔ خوب بہار رہی مگر ؎

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار   دل کیا اجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا

تاہم

تھے کچھ ایسے بھی نقش پا جن سے   خاک سی چیز مسکراتی تھی

۷ مئی ۱۹۵۹ء آج دلّی سے روانگی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں گیا تھا تو یہ خیال نہیں تھا کہ دلّی کبھی نہیں آؤں گا، چنانچہ آگیا۔ لیکن آج یہ خیال چٹکیاں لے رہا ہے کہ دلّی اب نہیں دیکھ سکوں گا۔ پہلا پھیرا ساڑھے گیارہ سال میں کیا ہے تو دوسرا پھیرا کیا جلدی ہوا جاتا ہے اور ؎

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہر شخص کی طرف اس طرح حسرت سے نگاہ اٹھاتا ہوں، جیسے مرتے وقت اس کے آخری دیدار کر رہا ہوں ؎

گو نہیں طاقت فغاں لیکن   ولولے دل میں ہیں بلا کے ابھی

صبح ہوا خوری کرتا سنّی مجلس اوقاف کے دفتر چلا گیا تھا۔ بچّوں کے گھر کے مہتمم سید محمد فاروق صاحب نے بچّوں کا گھر دکھایا۔ سنّی مجلس اوقاف کے یتیم خانے کو یتیم خانہ نہیں کہتے، بچّوں کا گھر کہتے ہیں۔ یہ نام اس زمانے کا رکھا ہوا ہے جب میں سنّی مجلس اوقاف کا ممبر تھا۔

نو بجے مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب، مہتمم مدرسہ امینیہ اور مولوی عبدالمجید صاحب، ایڈیٹر مولوی تشریف لائے۔ دس بجے خواجہ محمد ہلال صاحب قطبی اور

حکیم عبدالسلام صاحب زئیؒ کو ساتھ لے کر مولانا احمد سعید صاحب اور سردار دیوان سنگھ صاحب سے رخصتی ملاقات کرنے اور چاندنی محل کی پولس چوکی میں واپسی کی رپورٹ لکھوانے گیا۔

چاندنی محل کے برابر میں رنگ محل ہے، جس میں پرنس خیرالدین رہا کرتے تھے۔ رنگ محل کا راستہ دوسری طرف سے ہے۔ رنگ محل کے مردانہ صحن میں گھاس کے مخملی فرش کی بجائے اُپلوں کے انبار تھے۔ دیواریں بھی اُپلوں سے آراستہ تھیں۔

شام کو خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب کی کوٹھی دیکھنے لڈلو کیسل گیا۔ اس کے دروازے پر ایک جانب رائے بہادر گوجرمل مودی کندہ ہے اور دوسری طرف مودی ہاؤس، کوٹھی کی حالت خراب نہیں پائی۔ بس خان بہادر اور رائے بہادر کا فرق ہے یا حبیب الرحمٰن اور گوجرمل کا۔

شام تک کرم فرما ملنے آتے رہے۔ رات کے ساڑھے نو بجے حکیم عبدالحمید صاحب (ہمدرد) صاحبزادہ مستحسن فاروقی صاحب (آستانہ) لالہ شمبھوناتھ صاحب (دلّی پرنٹنگ ورکس) مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب (مدرسہ امینیہ) مولانا سجاد حسین صاحب (مدرسہ فتحپوری) مفتی شوکت فہمی صاحب (دینِ دنیا) مولوی عبدالحمید صاحب (مولوی) الونصاحب (شمع بک ڈپو) پیرزادہ عبداللہ فاروقی صاحب (خاتونِ مشرق) خواجہ جلال صاحب قطبی۔ خواجہ امیر حسن صاحب بقائیؒ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب منشی عبدالقدیر صاحب۔ رشید خاں صاحب۔ اسرار حسن خاں صاحب۔ عبدالودود خاں صاحب۔ سید محمد جعفری صاحب۔ قاری اخلاق حسین صاحب۔ حکیم عبدالسلام صاحب زئیؒ۔ معراج الحق صاحب۔ قاری جلال صاحب۔ شفیع احمد صاحب۔ رئیس احمد صاحب۔ نثار احمد صاحب فاروقی اور شاہد صاحب نے اسٹیشن تشریف لا کر رخصت کیا اور ریل لاہور روانہ ہو گئی۔

۷ مئی سنہ ۱۹۵۹ء۔ ٹکٹ فرسٹ کلاس کے خریدے ہیں۔ فرسٹ کے مسافر کو

www.taemeernews.com

چک پوسٹ کے کٹہرے میں نہیں جانا پڑتا۔ چیکر خود آتا ہے اور ڈبے کے آگے سامان اتروا کر چیک کر لیتا ہے۔ چک پوسٹ کے چیکر سیکنڈ اور تھرڈ دونوں کو ایک لکڑی سے ہانکتے ہیں۔ فرسٹ کا چیکر اونچی حیثیت کا ہوتا ہے۔ فرسٹ کے ٹکٹ خریدنے سے امرتسر کا چیکنگ نہایت اطمینان کا رہا۔ لاہور میں چک پوسٹ کے اندر فرسٹ کے مسافر کو بھی جانا پڑتا ہے لیکن تکلیف اب کے یہاں بھی نہیں ہوئی۔

لاہور گاڑی گیارہ بجے پہنچی تھی، سخت گرمی کے وقت۔ مگر پرنس خیرالدین صاحب اور بھائی فضل احمد صاحب اور میاں ممتاز احمد (میرے بھانجے) اسٹیشن پر موجود تھے۔ پرنس نے بتایا کہ بھائی فضل احمد مرتے مرتے بچے ہیں سخت بیمار ہو گئے تھے۔

میں ممتاز احمد کے ساتھ گلبرگ گیا اور کھانا کھا کر تین گھنٹے سویا۔ سو کر اٹھا تو حرارت سی تھی۔ پرنس نے شام کے کھانے پر بلایا ہے۔ انھیں فون کر دیا کہ آؤں گا لیکن کھانا نہیں کھاؤں گا۔ صرف لسی پیوں گا اور میز کے قریب پلنگ کے اوپر لیٹا رہوں گا۔

۸ مئی ۱۹۵۹ء طبیعت گری گری ہے۔ جمعہ کی نماز پرنس خیرالدین کے ساتھ درگاہ حضرت داتا گنج بخشؒ میں پڑھی۔

شام کو ماجد میاں ابن مولوی عبدالحمید صاحب، ایڈیٹر مولوی کے ہاں دعوت تھی۔ اس دعوت کو دلی ہی میں منظور کر چکا تھا۔ چنانچہ پرنس خیرالدین صاحب۔ خواجہ فضل احمد صاحب۔ قاضی عبدالواحد صاحب اور میاں مقتدیٰ واحدی کے ساتھ گیا اور میز پر بیٹھا دہی کی لسی پیتا رہا اور کھانے کو نظر لگاتا رہا۔

۹ مئی ۱۹۵۹ء سفر کے سہم سے بھوک ویسے بھی غائب ہو جاتی ہے۔ ۶ مئی کو دلی سے چلتے وقت کھانا نہیں کھایا تھا۔ ۷ کو ناشتہ بھی نہیں کیا۔ گلبرگ میں ۷ کی دوپہر کو کھانا کھایا اور پھر ۷ کی شام سے ۹ کی دوپہر تک یا لسی پیتا رہا یا شربت روح افزا جس کی چار بوتلیں حکیم عبدالحمید صاحب دلی ریلوے اسٹیشن اور لیتے آئے تھے۔ ۹ کی سہ پہر کو لاہور سے کراچی کا سفر شروع کیا۔ پرنس خیرالدین

www.taemeernews.com

نے نئی درجن مالٹے ساتھ کر دیئے، وہ راستے بھر چُوستا رہا۔

۱۰ مئی سنہ ۱۹۵۹ء لاہور سے پھر انٹر کلاس کی سیٹیں ریزرو کرائی تھیں۔ جانے میں جو آرام ملا تھا، آنے میں اُس کا بدلہ اُتر گیا۔ انٹر کلاس ہو یا فرسٹ کلاس، آرام اور تکلیف سفر کے ساتھیوں پر منحصر ہے۔ آپ نے فرسٹ کلاس کے مارواڑی سیٹھوں کو گندگی پھیلاتے بارہا دیکھا ہوگا۔

دو میاں بیوی اور اُن کے بچے بالکل ہمارے سامنے بیٹھے تھے اُن کے ساتھ مختلف پودوں کا انبار تھا، جنھیں وہ پانی دے رہے تھے۔ ہم اپنا اسباب نیچے نہیں رکھ سکے۔ ایک برتھ تنگی ہونے کے خیال سے ریزرو کرایا تھا، اُسے اسباب کی نذر کیا اور اٹھارہ انیس گھنٹے خدا معلوم کس طرح کاٹے۔ صحبت ناجنس عذاب ست الیم۔

خیر بارہ بجے گاڑی نے کراچی میں دم لیا اور میرے دم میں دم آیا۔ مسٹر محمد یامین۔ مسٹر لطیف الرحمٰن صدیقی۔ احمد مجتبیٰ واحدی اور اُن کے بچے اور شریف صاحب، شاکرہ اور اُن کے بچے اور سنجیدہ واحدی۔ موسیٰ واحدی اور عیسیٰ واحدی اور مسٹر فرید مرزا نے اسٹیشن پر استقبال کیا۔

آج آرام لوں گا اور کل سے کام کروں گا۔ وہ کام جو سرمایۂ آخرت ہے۔ اٹھائیس دن کام نہیں کیا۔ زندگی میں خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔

دِلّی اور لاہور کے احباب کا شکریہ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کے توسط سے دو چار مرتبہ بڑی بڑی جگہ مہمان رہنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن خود مہمان بننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مقتدیٰ واحدی نے میرے توسط سے دیکھ لیا کہ مہمان نوازی کس شے کا نام ہے۔

مجھ جیسے معمولی انسان کو خصوصاً اہلِ دہلی نے اس قدر نوازا کہ اُس کا تصوّر کرتا ہوں تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا۔

م-ا-واحدی نے مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر نظام المشائخ ۱۱۵ جیکب لائنز کراچی سے شائع کیا

www.taemeernews.com

میرے زمانہ کی دلی

حصہ اوّل

تصنیف

ملا واحدی دہلوی

نقش ثانی اضافہ شدہ

مطبوعہ:- مشہور پریس کراچی